مقالات

حضرت ضیاء الامت

پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور۔ کراچی ○ پاکستان

Marfat.com

مقالات
جلد دوم

از

حضرت ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
لاھور- کراچی ○ پاکستان

Marfat.com

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

مقالات حضرت ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

مرتبہ پروفیسر حافظ احمد بخش
فاضل دار العلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ شریف

ناشر محمد حفیظ البرکات شاہ
ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تعداد ایک ہزار

تاریخ اشاعت ستمبر 2011ء

کمپیوٹر کوڈ KM 4

قیمت -/500 روپے کامل سیٹ

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ فون: 37221953 فیکس:۔ 042-37238010

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون: 37247350 فیکس: 37225085

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون: 021-32212011-32630411۔ فیکس:۔ 021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com

Visit our website:- www.zia-ul-quran.com

Marfat.com

فہرست مضامین

مقام مصطفیٰ انجیل کی روشنی میں	5
معجزۂ معراج مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	21
اقبال کا نظریہ محبت	41
اسلام اور مزارعت	53
اسلام میں اجتہاد کی اہمیت و ضرورت	67
اسلام کا ایک تعزیری قانون	83
مزدوروں کی گم شدہ جنت	99
علم کی ترقی میں مسلمانوں کا حصہ	131
احناف کے نزدیک نماز جنازہ کا طریقہ	149
صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ	165
صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور باغ فدک	177
صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر اعتراضات کا علمی جائزہ	199
سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور خلفائے راشدین	221
سیدنا امام حسین علیہ السلام اور یزید	245
ایک شیعہ دوست کے جواب میں	281
پیمان سرفروشی	305
ثانی لاثانی حضرت خواجہ محمد دین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ	329
حضرت خواجہ قمر الملت والدین رحمۃ اللہ علیہ	341
اسلامی نظریاتی کونسل کے سوالات کے جوابات	355

Marfat.com

مقام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

انجیل کی روشنی میں

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اس ماہِ مبارک (ربیع الاول) کی آمد آمد ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے اور اس کی ساری مخلوق کے مرشد کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی تھی۔ اس ہادیٔ برحق کی بعثت کسی خاص قبیلہ، قوم یا ملک کی تقدیر کو سنوارنے کے لیے نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی اس کا فیضانِ نبوت کسی خاص زمانہ تک محدود تھا۔ بلکہ رب العالمین نے اسے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا تھا۔ مکان اور زمان کی سرحدیں اس کو محدود نہیں کر سکتی تھیں۔ مقصد یہ تھا کہ نوعِ انسانی جو مختلف قوموں، مذہبی گروہ بندیوں اور سیاسی دھڑوں میں بٹی ہوئی تھی اس کو متحد و منظم کیا جائے۔ مختلف عصبیتوں نے نفرت و عداوت کے جو شعلے بھڑکا رکھے تھے، انہیں مسکراتی کلیوں اور شگفتہ پھولوں میں تبدیل کیا جائے۔ انسانی صلاحیتیں جو ایک دوسرے کی تخریب و تدمیر میں ضائع ہو رہی تھیں، انہیں اصلاحی اور تعمیری کاموں میں صرف کیا جا سکے۔

حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے پہلے جو انبیاء و رسل تشریف لائے تھے ان کے پیشِ نظر ایک قوم کی اصلاح ہوا کرتی، ان کے لائے ہوئے قوانین و ضوابط کی افادیت ایک مقرر وقت تک تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ اپنی اپنی امتوں کو اس رسول معظم کی تشریف آوری کی اطلاع دے دیں اور انہیں تاکید کریں کہ جب نبی رحمت تشریف لائے تو بلا تامل اس پر ایمان لائیں۔ اس کے حلقہ بگوش بن کر اس کے لائے ہوئے دین کو صدقِ دل سے قبول کریں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ برکتوں والی گھڑی آئے اور بے خبری میں وہ اس کو ضائع کر دیں۔ داعیٔ حق انہیں دعوتِ حق دے اور سنی ان سنی کر دیں، بلکہ قرآنِ کریم میں صراحۃً موجود ہے کہ روزِ الست، جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوق سے اپنی ربوبیت کا پختہ وعدہ لیا تھا، اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ ؕ قَالُوۡا بَلٰی (الاعراف۔ ۱۷۲) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام انبیاء و رسل سے نبی آخر الزماں، مرشد انس و جاں صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ایمان لانے اور ان کی تائید و نصرت میں اپنا فرض بجا لانے کا بھی وعدہ لیا تھا۔ ارشادِ الٰہی ہے:

Marfat.com

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ (آل عمران)

''اور یاد کرو۔ جب لیا اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے پختہ وعدہ کہ قسم ہے تمہیں اس کی، جو دوں میں تم کو کتاب وحکمت سے، پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول جو تصدیق کرنے والا ہو ان (کتابوں) کی جو تمہارے پاس ہیں، تو تم ضرور ضرور ایمان لانا اس پر اور ضرور ضرور مدد کرنا اس کی۔ (اس کے بعد) فرمایا: کیا تم نے اقرار کرلیا اور اٹھالیا تم نے اس پر میرا بھاری ذمہ؟ سب نے عرض کی: ہم نے اقرار کیا۔ (اللہ نے) فرمایا: تو گواہ رہنا اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں''۔

اس آیت کا اگر آپ بغور مطالعہ کریں گے تو اس کی اہمیت آپ پر واضح ہو جائے گی۔ سورۃ الصف میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی بعثت کے مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وَ اِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ (الصف۔ ٦)

''اور یاد کرو۔ جب فرمایا عیسیٰ فرزند مریم نے: اے بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔ میں تصدیق کرنے والا ہوں تورات کی، جو مجھ سے پہلے آئی ہے اور مژدہ دینے والا ہوں ایک رسول کا، جو تشریف لائے گا میرے بعد۔ اس کا نام نامی ''احمد'' ہوگا''۔

اس ارشاد میں حضرت عیسیٰ، دینی بعثت کے مقاصد میں سے یہ بات بھی صراحت کے ساتھ کہہ رہے ہیں کہ میں تمہارے پاس اس رسول کی آمد کا مژدہ سنانے آیا ہوں جو میرے بعد تشریف لائے گا۔ جس کا اسم گرامی ہوگا احمد ﷺ۔

Marfat.com

قرآنِ کریم پر ایمان رکھنے والوں اور اس کا مطالعہ کرنے والوں کے نزدیک تو یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے، لیکن جو لوگ اس صحیفۂ ہدایت پر ایمان لانے کی سعادت سے ابھی تک بوجوہ محروم ہیں ان کے لیے تورات وانجیل میں بکثرت ایسی آیات موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ انبیائے سابقین نے حضور نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری کی بار بار بشارتیں دی ہیں۔ اہل کتاب، یہودی ہوں یا عیسائی، ان کے نزدیک یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ان کی کتابوں میں ہر قسم کی تحریف راہ پا چکی ہے۔ انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا کے مضمون نگار نے بائیبل کے عنوان پر جو مقالہ تحریر کیا ہے، اس میں بڑی شرح وبسط سے اس مسئلہ پر بحث کی ہے وہ لکھتے ہیں:

''اٹھارہویں صدی کے آغاز تک پروٹسٹنٹ فرقہ کے تقریباً تمام لوگ یہ یقین کرتے تھے کہ عہد نامہ جدید (چاروں انجیلوں کے مجموعہ کو عہد نامہ جدید کہتے ہیں) ایک ایسی الہامی کتاب کا مجموعہ ہے جس میں شک وشبہ کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں، لیکن جب انجیلوں کے متن پر تنقید وتبصرہ کا آغاز ہوا تو اس عقیدہ کو ضرب کاری لگی''۔

(انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا، ج ۳، ص ۵۲۲، مطبوعہ لندن)

The editions of MILL 1707 and of WETSTEIN (1751)proved once for all that variations in the Text, many of then serious had existed from the earliest times. (P - 522 V 3).

ترجمہ: مل (متوفی ۱۷۰۷) اور ویٹ سٹین (متوفی ۱۷۵۱) کے ایڈیشنوں میں اس بات کو ہمیشہ کے لیے ثابت کر دیا کہ عہد نامہ جدید میں جو انجیلیں شامل ہیں ان کے متنوں میں بڑے اختلافات موجود ہیں جن میں سے بعض بڑے شدید نوعیت کے ہیں اور یہ ابتدائی دور سے ان میں پائے جاتے ہیں۔

اہل کتاب کے علماء اور محققین نے جب خود تسلیم کر لیا کہ یہ کتابیں تحریف کا بری طرح شکار ہو چکی ہیں، اس صورت میں ایسی صریح آیات کا جن میں حضور کی آمد کی بشارت دی گئی

Marfat.com

ہو، نہ پایا جانا قطعاً محل تعجب نہیں۔ اپنی آسمانی کتاب میں جس فراخدلی سے وہ تغیر و تبدل برداشت کرلیا کرتے تھے، انہیں مقاصد کے لیے اگر انہوں نے ان آیات کو بدل ڈالا ہو جس میں نبی کریم ﷺ کا اسم گرامی ہو، تو کچھ بعید نہیں لیکن ان تحریف شدہ انجیلوں میں آج بھی بکثرت ایسی آیات موجود ہیں جن کا اگر تعصب سے بالاتر ہو کر انصاف سے مطالعہ کیا جائے تو انسان کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان آیات کا مصداق بجز ذات پاک محمد ﷺ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وطن فلسطین تھا۔ اہل فلسطین کی زبان سریانی تھی۔ یقیناً یہ کتب بھی اسی لغت میں لکھی گئی ہوں گی، لیکن ان انجیلوں کے اصلی نسخے جو سریانی زبان میں تھے، وہ سرے سے غائب ہیں۔ ان کا سراغ تک نہیں ملتا، کیونکہ فلسطین اور اس کے گرد و نواح کے ممالک یونانیوں کے قبضہ میں تھے۔ اس لیے ان سریانی انجیلوں کا ترجمہ بعد میں یونانی زبان میں کیا گیا، لیکن بدقسمتی سے ان اولین یونانی تراجم کا بھی کوئی اصلی نسخہ دستیاب نہیں۔ اناجیل کا جو سب سے قدیم یونانی ترجمہ ملتا ہے وہ چوتھی صدی کا ہے۔ ترجمہ کرنے والوں نے کتنی ہی احتیاط سے کام لیا ہو، چار صدیوں کی طویل مدت میں ترجمہ در ترجمہ کا جو سلسلہ جاری رہا، اس نے اصل کتاب کو کس قدر متاثر کیا ہوگا؟ یہ محتاج بیان نہیں۔ خصوصاً جب کہ اصل سریانی نسخے ناپید ہو چکے ہوں۔ بایں ہمہ، قدرت خداوندی سے وہ بشارتیں اب بھی موجودہ انجیلوں میں موجود ہیں جن میں سے چند ایک ہدیۂ قارئین ہیں:

۱۔ (حضرت مسیح نے اپنے حواریوں کو کہا) اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو۔ میرے حکموں پر عمل کرو گے اور میں باپ سے درخواست کروں گا کہ وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ وہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے۔ (یوحنا باب ۱۴ آیت ۱۶، ۱۷ مطبوعہ برطانیہ)

۲۔ (آپ نے فرمایا) اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا، کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔ (یوحنا باب ۱۴ آیت ۳۱)

۳۔ لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے، کیونکہ اگر میں

Marfat.com

نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا، لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ اور وہ آ کر دنیا کو گناہ اور راست بازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا۔ (یوحنا باب ۱۶ آیت ۸، ۹)

مندرجہ بالا حوالہ جات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ کوئی آنے والا ہے، جس کے آنے کی خبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام بار بار اپنے امتیوں کو دے رہے ہیں۔ اس آنے والے کی جن صفات و خصوصیات کا ذکر ان آیات میں کیا گیا ہے، ان کا مصداق بجز ذاتِ پاک حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

لیکن اگر ازراہِ تعصب کوئی شخص مصر ہو کہ مجھے انجیل میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اسم گرامی دکھایئے، تو ہم اس کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ فلسطین وغیرہ ممالک جب مسلمانوں نے فتح کیے تو اس وقت وہاں کے لوگوں کی زبان بدستور سریانی تھی۔ اسلامی فتح کے تقریباً تین سو سال تک یہی سریانی وہاں کی علاقائی زبان کی حیثیت سے باقی رہی۔ فتح کے بعد مسلمان علماء کی آمد و رفت اس علاقہ میں شروع ہوئی۔ عیسائی علماء سے ان کے تعلقات قائم ہوئے اور ان سے براہِ راست استفادہ اور افادہ کا سلسلہ جاری رہا۔ ترجمہ در ترجمہ کے جو حجابات دیگر ممالک کے عیسائیوں کو درپیش تھے، مسلمان علماء کو ان سے سابقہ نہیں پڑا۔ وہ سریانی زبان بولنے والے علماء اہل کتاب سے ان کے مذہب اور انبیاء کے متعلق معلومات حاصل کرتے تھے۔ معروف اور ثقہ سیرت نگار علامہ ابن ہشام کی سیرت کا مطالعہ کرنے سے حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔

علامہ ابن ہشام کی وفات ۲۱۳ھ میں ہوئی۔ انہوں نے اپنے استاد ابو محمد البکائی العامری متوفی ۱۸۳ھ کے واسطہ سے محمد بن اسحاق متوفی ۱۵۱ھ سے نقل کیا ہے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں:

اَلْمُنحَمَنَّا بِالسُّرْيَانِيَةِ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ هُوَ بِالرُّوْمِيَةِ الْبَرْ قَلِيْطَسُ۔ (سیرت ابن ہشام، ج ۱ ص ۲۵۱، مطبوعہ حجازی قاہرہ)

Marfat.com

یعنی منحمنا سریانی لفظ ہے، اس کا معنی محمد ہے اور رومی زبان میں اس کا ترجمہ برقلیطس کیا گیا ہے۔

علامہ ابن ہشام نے فلسطینی علماء سے اس آیت کو روایت کیا ہے۔ اس میں قطعاً شک کی گنجائش نہ رہی کہ موجودہ انجیل میں بھی حضور کا اسم گرامی موجود ہے۔ اہل کتاب کیونکہ ناموں کا ترجمہ بھی کر دیا کرتے تھے، حالانکہ عام طریقہ یہ ہے کہ ناموں کا جوں کا توں ذکر کر دیا جاتا ہے، اس لیے عین ممکن ہے کہ اصل کتاب میں ''احمد'' نام مذکور ہو اور انہوں نے اس کا ترجمہ کر کے ''منحمنا'' اور ''برقلیطس'' کر دیا ہو۔

یہ مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب صرف چار انجیلوں پر ہی اعتماد کیا جائے، لیکن صدیوں کی گمنامی کے بعد پردۂ غیب سے ایک اور انجیل ظہور میں آئی ہے جس کو ''انجیل برناباس کہتے ہیں'' جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایک نہیں بیسیوں ایسے ارشادات موجود ہیں جن میں نام لے لے کر حضور کی آمد کی بشارتیں دی گئی ہیں۔ اس سے پیشتر کہ میں اس انجیل کے حوالے پیش کروں، یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ ''برناباس'' سے قارئین کا تعارف کرا دوں کہ وہ کون تھا اور ابتدائی دور کے عیسائیوں میں اس کا علمی اور دینی مرتبہ کیا تھا؟ تاکہ دل میں کسی قسم کی خلش باقی نہ رہے۔

برناباس، قبرص کا باشندہ تھا۔ اس کا نام (Joses) تھا۔ بعد میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا۔ عمر بھر بڑی وفاداری کے ساتھ آپ کی رفاقت میں رہا۔ آپ کے دین کی اشاعت اور ترقی کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ جاذب قلب و نظر شخصیت کا مالک تھا۔ اس کے مواعظ بڑے دلنشین اور اثر آفرین ہوتے، جن سے سامعین از حد متاثر ہوتے۔ ابتدائی دور میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حقیقت، آپ کی فطرت اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ آپ کا تعلق قطعاً وجہ نزاع نہ تھا۔ آپ کے سارے حواری اور آپ پر ایمان لانے والے آپ کو انسان اور اللہ تعالیٰ کا برگزیدہ بندہ سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ ''سینٹ پال'' نے عیسائی مذہب کو قبول کیا۔ پال یہودی تھا۔ طرطوس کا باشندہ تھا۔ کافی عرصہ روم میں رہا۔ ان کے

Marfat.com

فلسفہ اور مشرکانہ عقائد سے بہت متاثر ہوا۔ عیسائیت کو بھی اس نے اس مشرکانہ ڈھانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی، تاکہ اسے عوام کی نگاہوں میں قابل قبول بنا سکے۔ اپنے ملک کی ترقی کے لیے برناباس اور سینٹ پال کچھ عرصہ ایک ساتھ کام کرتے رہے، لیکن پال کی بدعتوں اور جدت طرازیوں کے باعث برناباس کے لیے اس کے ساتھ مل کر کام کرنا مشکل ہو گیا۔ چنانچہ وہ اس سے الگ ہو گیا۔ پال کو عوام الناس کی تائید کے علاوہ حکومت کی ہمدردیاں بھی حاصل تھیں۔ اس لیے اس کے پھیلائے ہوئے عقائد کو لوگوں نے دھڑا دھڑ قبول کرنا شروع کر دیا۔ یوں برناباس اور اس کے ساتھی پس منظر میں چلے گئے۔ بایں ہمہ چوتھی صدی عیسوی تک برناباس کے ہم عقیدہ لوگ کافی تعداد میں موجود تھے، جو خدا کی باپ کی حیثیت سے نہیں بلکہ مالک الملک اور قادر مطلق کی حیثیت سے عبادت کرتے تھے۔

برناباس کی انجیل ۳۲۵ء تک مستند انجیل تسلیم کی جاتی رہی، لیکن ۳۲۵ء میں جو کانفرنس نیکیا میں ہوئی، اس میں یہ طے پایا کہ عبرانی زبان میں جتنی انجیلیں موجود ہیں، ان سب کو ضائع کر دیا جائے۔ جس کے پاس یہ انجیل ہے اس کی گردن اڑا دی جائے۔ ۳۸۳ء میں یورپ نے انجیل برناباس کا نسخہ حاصل کیا اور اپنی پرائیویٹ لائبریری میں اسے محفوظ کر لیا۔ ٹولینڈ (Toland) نے اپنی تصنیف Misacll Neoles Works کی جلد اول صفحہ ۳۸۰ پر ذکر کیا ہے کہ انجیل برناباس کا قلمی نسخہ اب بھی محفوظ ہے۔ مسٹر ریگ (Ragg) نے ۱۹۰۷ء میں ایک لاطینی نسخے سے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے اسے شائع کیا، جس کے سارے نسخے پراسرار طریقے سے بازار سے غائب کر دیے گئے۔ صرف دو نسخے محفوظ رہے۔ پیش نظر نسخہ واشنگٹن کی کانگرس لائبریری سے حاصل کیا گیا۔ اس انجیل کے بارے میں یہ کہنا کہ اسے کسی مسلمان نے تصنیف کر کے برناباس کی طرف غلط منسوب کر دیا ہے، بڑا مضحکہ خیز ہے، کیونکہ پیغمبر اسلام ﷺ کی اس دنیا میں تشریف آوری سے کئی سو سال پہلے ۳۸۲ء میں مغربی کلیسا نے متفقہ طور پر اس پر بندش عائد کر دی تھی۔ حضور کی آمد سے پہلے کون سا مسلمان تھا، جس نے

اس کو تصنیف کیا اور برناباس کی طرف منسوب کر دیا؟ برناباس پر کلیسا کے غیظ و غضب کی وجہ یہ تھی کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی توحید کو زوردار دلائل سے پیش کیا گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اپنے ارشادات سے یہ ثابت کیا گیا کہ آپ نہ خدا تھے، نہ خدا کے بیٹے، بلکہ اس کے بندے اور رسول تھے۔ کلیسا کے نزدیک یہ باتیں ناقابل برداشت تھیں۔ اس لیے انہوں نے اس انجیل کو اپنی مقدس کتب کی فہرست سے خارج کر دیا۔ انجیل برناباس کی تاریخی حیثیت کے بارے میں مفصل بحث ضیاء القرآن جلد پنجم سورۂ صف میں ملاحظہ ہو۔ جس طرح اس میں عقیدۂ توحید کو بڑی شرح و بسط سے بیان کیا گیا ہے، اسی طرح اس میں حضور نبی کریم ﷺ کی آمد کے بارے میں متعدد بشارتیں بھی موجود ہیں، جن میں سے چند ناظرین گرامی کی خدمت میں پیش کی جاتی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے جہاں ان آیات قرآنی کی تصدیق ہو جائے گی، جن میں یہ مضمون مذکور ہے، وہاں حضور نبی کریم ﷺ کی خداداد عزت و شان اور حضور کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو والہانہ عقیدت ہے، اس کا بھی پتہ چل جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بعید نہیں کہ ان اقتباسات کے مطالعہ سے ان دوستوں کی غلط فہمیاں بھی دور ہو جائیں جو حضور رحمت عالم شفیع المذنبین ﷺ کے کمالات اور صفاتِ حمیدہ کو گھٹانا اپنے عقیدۂ توحید کا تقاضا سمجھتے ہیں اور ہر ایسی روایت کو ضعیف ثابت کرنے کیلئے اپنی ساری قابلیتیں وقف کر دیتے ہیں جس میں عظمت مصطفیٰ ﷺ کا ذکر موجود ہو۔

اب چند اقتباسات پیش خدمت ہیں:

۱۔ انجیل برناباس کے باب نمبر ۱۷ میں حضرت یسوع کا یہ ارشاد موجود ہے۔ ''تمام نبیوں نے جو ایک لاکھ چوالیس ہزار ہوئے ہیں، جنہیں خدا نے دنیا میں بھیجا، پردے میں بات کی مگر میرے بعد تمام نبیوں اور قدسیوں کا سرتاج آئے گا اور تمام پردے کی باتوں کو جو نبیوں نے کیں، واضح کرے گا۔ کیونکہ وہ خدا کا رسول ہے''۔

(انجیل برناباس (مترجم) باب ۱۷ ص ۴۲، مطبوعہ لاہور)

Marfat.com

۲۔اسی انجیل کے باب ۴۲ میں درج ہے:

کہ جب آپ سے پوچھا گیا کہ آپ کون ہیں؟ تو آپ نے کہا: کہ میں مسیحا نہیں ہوں، میں تو ایک آواز ہوں جو سارے جودیا (یہودی ریاست) میں پکار پکار کر اعلان کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول کے لیے راستہ تیار کرو۔

(انجیل برناباس، (مترجم) باب ۴۲، ص ۷۷)

۳۔آپ کے دل میں اس ذاتِ عالی شان کے بارے میں عقیدت واحترام کے جو جذبات ہیں، اسی باب میں آپ ان کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

''میں اس لائق نہیں کہ خدا کے اس رسول کی جرابوں کے بند یا جوتیوں کے تسمے کھول سکوں، جسے تم مسیح کہتے ہو، جو مجھ سے پہلے بنایا گیا اور میرے بعد آئے گا اور سچائی کا کلام لائے گا اور اس کے دین کی انتہا نہ ہوگی''۔(انجیل برناباس باب ۴۲، ص ۷۷)

۴۔باب ۴۳ کی ایک آیت ملاحظہ ہو:

''میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ ہر نبی جب آیا ہے خدا کی رحمت کا نشان صرف ایک قوم کے لیے لایا ہے...... اور خدا کا رسول جب آئے گا تو خدا اسے گویا اپنے ہاتھ کی مہر عطا کرے گا کہ وہ دنیا کی ان تمام قوموں کے لیے، جو اس کا دین قبول کرے گی، نجات اور رحمت لائے گا۔(انجیل برناباس (مترجم) باب ۴۳، ص ۷۹)

اسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس طرح بیان فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ (انبیاء)

۵۔حضور کی آمد کی خوشخبری سناتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے شاگردوں کو یہاں خطاب کرتے ہیں:

''میں تمہیں بتاتا ہوں کہ خدا کا رسول ایسی شان وشوکت والا ہے کہ ہر وہ چیز، جسے اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا، اس کو مسرت سے معمور کر دے گا۔ کیونکہ وہ آراستہ ہے فہم وفلاح کی روح سے، عقل وطاقت کی روح سے، خوف اور محبت کی روح سے، دانائی واعتدال کی روح

Marfat.com

سے۔ وہ آراستہ ہے سخاوت اور رحم کی روح سے، انصاف اور تقویٰ کی روح سے، شرافت و صبر کی روح سے، جو اسے خدا نے اپنی تمام مخلوقات سے تین گنا زیادہ عطا کی ہیں۔ کیا ہی مبارک ہوگا وہ وقت جب وہ دنیا میں آئے گا۔

یقین جانو! میں نے اسے دیکھا ہے اور اس کی تعظیم کی ہے، جسے ہر نبی نے دیکھا ہے۔ کیوں کہ اسی کی روح سے خدا نے تمام انبیاء کو نبوت دی اور جب میں نے اسے دیکھا تو میری روح تسکین سے بھر گئی"۔

اس وعظ کے آخری فقرے جس بے پایاں محبت اور شوق فراواں کے آئینہ دار ہیں، انہیں ملاحظہ فرمائیے۔

"آپ نے کہا یا محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خدا تیرے ساتھ ہو اور مجھے اس لائق بنائے کہ میں تیری جوتی کا تسمہ کھول سکوں، کیونکہ اگر یہ سعادت مجھے نصیب ہو تو میں ایک بڑا نبی اور خدا کا مقدس بندہ بن جاؤں گا۔ (انجیل برناباس (مترجم) باب ۴۴، ص ۸۱)

(یہ خطبہ باب ۴۴ سے ماخوذ ہے جو انگریزی ایڈیشن کے صفحہ ۵۸، ۵۹ پر درج ہے۔)

۶۔ باب ۹۷ کی پہلی آیت میں آپ کہتے ہیں:

گو میں اس کے موزے کھولنے کے لائق نہیں ہوں، مگر اللہ تعالیٰ نے مجھ پر خاص فضل اور رحمت فرمائی کہ میں اس کی زیارت سے مشرف ہوا۔

(انجیل برناباس (مترجم) باب ۹۷، ص ۱۴۲)

۷۔ اسی باب میں کاہن نے جب یہ دریافت کیا کہ اس مسیحا کا نام کیا ہوگا اور کس نشانی سے اس کی آمد کا پتہ چلے گا؟ آپ نے جواب دیا:

"اس مسیح کا نام Admirable یعنی قابل تعریف ہے، کیونکہ خود خدا نے اس کا یہ نام رکھا، جب اس نے اس کی روح پیدا کی اور اسے ملکوتی شان و شوکت میں رکھا۔ خدا نے کہا: یا محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) انتظار کر، کیونکہ میں تیری خاطر بہشت، ساری دنیا اور لا تعداد مخلوق پیدا کیے چاہتا ہوں، جس کو میں تجھے تحفے میں دیتا ہوں۔ یہاں تک کہ جو تجھے مبارک کہے گا

Marfat.com

مبارک ہوگا اور جو گستاخی کرے گا وہ ملعون ہوگا۔ جب میں تجھے دنیا میں بھیجوں گا تو اپنا رسولِ نجات بنا کر بھیجوں گا اور تیرا کلام سچا ہوگا۔ آسمان وزمین ٹل سکتے ہیں، لیکن تیرا دین نہیں ٹلے گا''۔

آخر میں آپ نے کہا:

''اس نبی رحمت کا مبارک نام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔

یہ سن کر حاضرین کے جم غفیر نے اپنی آوازیں بلند کرتے ہوئے کہا: اے خدا! ہماری طرف اپنا رسول بھیج دے۔ یارسول اللہ! دنیا کی نجات کے لیے جلدی تشریف لائیے''۔

(انجیل برنا باس (مترجم) باب ۹۷، ص ۱۴۳۔۴۴)

اس طرح کے بے شمار ارشادات ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ رسول، عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے آخری رسول اور اس کی ساری مخلوق کے نجات دہندہ کی شان عظمت وجلال کو بیان فرمایا ہے۔ چند ایک کے ذکر پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔

اب آپ تخلیق آدم کے بارے میں آپ کے ارشادات سماعت فرمائیے:

''جب آدم اپنے قدموں پر اٹھ کھڑا ہوا تو انہوں نے فضا میں ایک تحریر دیکھی، جو سورج کی مانند جگمگا رہی تھی۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ اس پر آدم نے اپنا منہ کھولا اور کہا: اے خداوند! میرے خدا! میں تیرا شکر گزار ہوں کہ تو نے میری تخلیق کی تجویز فرمائی، لیکن میں بڑی منت سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے بتا کہ ان الفاظ کا کیا مطلب ہے؟ ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' کیا مجھ سے پہلے اور انسان بھی ہوئے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مرحبا! اے میرے بندے آدم! میں تجھے بتاتا ہوں کہ تو پہلا انسان ہے جسے میں نے پیدا کیا اور وہ، جسے تو نے دیکھا ہے، تیرا بیٹا ہے، جو عرصہ دراز کے بعد دنیا میں تشریف لائے گا اور میرا رسول ہوگا۔ جس کی خاطر میں نے ساری چیزیں پیدا کی ہیں۔ جو آئے گا تو دنیا کو نور بخشے گا۔ جس کی روح میرے ہر چیز کے پیدا کرنے کے ساٹھ ہزار سال پہلے ملکوتی نشان میں رکھی گئی تھی''۔ (انجیل برنا باس، باب ۳۹ ص ۵۰ انگریزی ایڈیشن)

Marfat.com

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس بیان سے ان احادیث کی بھی تائید ہوتی ہے، جن میں یہ درج ہے کہ سب سے پہلے جس چیز کی تخلیق ہوئی وہ نورِ محمدی ہے اور ساری کائنات کو اس کی خاطر خلعت وجود سے نوازا گیا ہے۔ اگر اس ذات والاصفات کو پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا تو کوئی چیز بھی نیست سے ہست نہ ہوتی۔ حضرت آدم علیہ السلام پر جب شانِ محمد ﷺ آشکارا ہوئی تو آپ نے بارگاہِ رب العزت میں جو درخواست پیش کی، اس کا بیان بھی آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پاک زبان سے سنیے۔

''آدم نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی کہ خداوند! یہ تحریر میرے ہاتھ کی انگلیوں کے ناخنوں پر درج فرما دے۔ تب خدا نے پہلے انسان کے انگوٹھوں پر یہ تحریر درج کر دی۔ دائیں انگوٹھے کے ناخن پر لکھا ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' اور بائیں انگوٹھے کے ناخن پر لکھا ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ''۔ تب پہلے انسان نے پدرانہ شفقت سے ان الفاظ کو بوسہ دیا اور ان پر اپنی آنکھیں ملیں اور کہا: یارسول اللہ! وہ دن کتنا مبارک ہوگا، جب آپ دنیا میں تشریف لائیں گے''۔

(انجیل برناباس (مترجم) باب ۳۹، ص ۷۳)

اہل سنت اپنے محبوبِ مکرم ﷺ کا نامِ نامی سنتے ہیں اور فرطِ محبت وعقیدت سے اپنے انگوٹھوں کو چومتے ہیں اور اپنی آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ درحقیقت یہ ابوالبشر آدم علیہ السلام کی سنت ہے، جس پر عمل ہو رہا ہے۔

باب ۴۱ میں بھی آدم علیہ السلام کا ذکر ہو رہا ہے۔ آپ اس واقعہ کا ذکر کر رہے ہیں، جبکہ حضرت آدم کو دانا کھانے کی پاداش میں جنت سے نکالا جا رہا ہے۔

''خدا نے اپنے تئیں پوشیدہ کیا اور میکائیل فرشتہ نے انہیں جنت سے باہر کر دیا۔ اس وقت آدم نے پیچھے مڑ کر دیکھا، تو جنت کے دروازے کے اوپر یہ رقم تھا: ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ''۔

اس پر آدم نے رو کر کہا: خدا کی مرضی ہو، اے میرے فرزند! تو جلد آ، اور ہمیں اس بد بختی سے باہر نکال''۔ (انجیل برناباس (مترجم) باب ۴۱، ص ۷۶)

Marfat.com

قیامت کے روز حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شانِ رفیع کا جس طرح اظہار ہوگا، اس کو حواری برناباس نے اپنی انجیل کے باب ۵۴ میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

''جب یہ نشانیاں ہو چکیں تو دنیا پر چالیس سال تاریکی چھائے رہی گی...... پھر خدا اپنے رسول کو زندہ کرے گا، جس کی چمک دمک ہزاروں آفتابوں کو ماند کر رہی ہوگی...... پھر خدا اپنے چاروں برگزیدہ فرشتوں کو اٹھائے گا اور وہ خدا کے رسول کو تلاش کریں گے اور اسے پاکر، اس جگہ کے چاروں طرف اس کی نگرانی کے لیے کھڑے ہوں گے۔ اس کے بعد تمام فرشتوں کو جلائے گا، جو خدا کے گرد شہد کی مکھیوں کی طرح چکر لگائیں گے۔ اس کے بعد خدا اپنے تمام نبیوں کو زندہ کرے گا۔ وہ آدم کے پیچھے ایک ایک کر کے خدا کے رسول کے دست مبارک کو بوسہ دیں گے اور اپنے تئیں اس کی پناہ میں سونپ دیں گے۔ پھر خدا تمام برگزیدوں کو زندہ کرے گا، جو پکار اٹھیں گے: یارسول اللہ! ہمارا خیال رکھیے۔ ان کی پکار پر خدا کے رسول کا رحم جاگ اٹھے گا''۔ (انجیل برناباس (مترجم) باب ۵۴، ص ۹۲)

اس کے بعد آپ فرماتے ہیں:

''اور خدا اپنے رسول سے گفتگو فرمائے گا کہ تیرا آنا مبارک۔ اے میرے وفادار بندے! سو مانگ جو تو چاہے۔ تجھے سب کچھ ملے گا۔ خدا کا رسول جواب دے گا: اے خداوند! مجھے یاد ہے کہ جب تو نے مجھے پیدا کیا تھا تو فرمایا تھا کہ میری محبت میں تو دنیا اور بہشت اور فرشتے اور انسان بنانا چاہتا ہے، تاکہ وہ میرے واسطے سے تیری تمجید کریں۔

سنو! خداوند! خدائے رحیم و عادل! میں تیری بارگاہ میں التجا کرتا ہوں کہ اپنے بندے سے اپنا کیا ہوا وعدہ یاد کر''۔ (انجیل برناباس (مترجم) باب ۵۵، ص ۹۴)

اگرچہ بے شمار حوالہ جات ہیں جنہیں پڑھ کر ایمان تازہ اور دل روشن ہو جاتا ہے، لیکن خوفِ طوالت سے میں انہیں چند حوالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے اولوالعزم رسول عیسیٰ علیہ السلام کے ارشادات کے آئینہ میں کمالِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا عکس جمیل دیکھنے

Marfat.com

کی توفیق ارزانی فرمائے اور میلاد مبارک کی اس تقریب سعید پر اپنے عظیم المرتبت بندے اور کامل واکمل رسول کے اسوۂ حسنہ کو اپنانے کا شوق ارزانی فرمائے، جس کی ثناگستری میں جن وانس، حور وملک، انبیاء ورسل، اولیاء وعلماء گزرے ہوئے اور قیامت تک آنے والے صالحین اور کاملین رطب اللسان ہیں۔

الحمد للّٰہ رب العٰلمین و الصلوٰۃ و السلام علی سید الانبیاء
و المرسلین و علی آلہ و صحبہ اجمعین

Marfat.com

معجزۂ

معراجِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ① (سورۂ بنی اسرائیل)

اس آیت کریمہ میں حضور فخر موجودات، سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک عظیم الشان معجزہ کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے متعلق عقل کوتاہ اندیش اور فہم حقیقت ناشناس نے پہلے بھی بہت ردوقدح کی اور آج بھی واویلا مچا رکھا ہے۔ اس لیے اس مقام کا تقاضا یہ ہے کہ تطویل لاطائل سے دامن بچاتے ہوئے، ضروری امور کا تذکرہ کر دیا جائے، تاکہ حق کی جستجو کرنے والوں کے لیے حق کی پہچان ہو جائے اور شکوک وشبہات کا جو غبار حسن حقیقت کو مستور کرنے کے لیے اٹھایا جا رہا ہے اس کا سدباب ہو جائے۔

جس روز صفا کی چوٹی پر کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے اور برگزیدہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قریش مکہ کو دعوتِ توحید دی تھی، اسی روز سے عداوت وعناد کے شعلے بھڑکنے لگے تھے۔ ہر طرف سے مصائب وآلام کا سیلاب امڈ کر آ گیا تھا۔ رنج وغم کا اندھیرا دن بدن گہرا ہوتا چلا جاتا تھا، لیکن اس تاریکی میں حضرت ابو طالب اور ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا وجودِ مسعود ہر نازک مرحلہ پر تسکین وطمانیت کا سبب بنا کرتا تھا۔ بعثت نبوی کے دسویں سال مہربان وشفیق چچا نے وفات پائی۔ اس جانکاہ صدمہ کا زخم ابھی مندمل بھی نہ ہونے پایا تھا کہ مونس وہمدم، دانش ور اور عالی حوصلہ رفیقۂ حیات حضرت خدیجہ بھی داغِ مفارقت دے گئیں۔ کفار مکہ کو ان کی انسانیت سوز کارستانیوں سے روکنے والا اور ان کی سفاکانہ روش پر ملامت کرنے والا بھی اب کوئی نہ رہا تھا، جس کے باعث ان کی ایذا رسانیاں ناقابل برداشت حد تک بڑھ گئیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اہل مکہ سے مایوس ہو کر طائف تشریف لے گئے کہ شاید وہاں کے لوگ

Marfat.com

اس دعوتِ توحید کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو جائیں، لیکن وہاں جو ظالمانہ اور بہیمانہ برتاؤ کیا گیا، اس نے سابقہ زخموں پر نمک پاشی کا کام کیا۔ ان حالات میں جب بظاہر ہر طرف مایوسی کا اندھیرا پھیل چکا تھا اور ظاہری سہارے ٹوٹ چکے تھے، رحمت الٰہی نے اپنی عظمت و کبریائی کی آیاتِ بینات کا مشاہدہ کرانے کے لیے محبوب کو عالم بالا کی سیاحت کے لیے بلایا کہ حضور کو اپنے رب کریم کی تائید و نصرت پر حق الیقین ہو جائے اور حالات کی ظاہری ناسازگاری خاطر عاطر کو کسی طرح پریشان نہ کر سکے۔ غور کیا جائے تو سفر اسریٰ کے لیے اس سے موزوں ترین اور کوئی وقت نہیں ہو سکتا تھا۔ اس مقدس سفر کا تفصیلی تذکرہ تو کتب احادیث و سیرت میں ملے گا، یہاں اجمالی طور پر ان واقعات کا ذکر کر دیا گیا ہے جو مختلف احادیث صحیحہ میں مذکور ہیں۔

حضور ﷺ ایک رات خانہ کعبہ کے پاس حطیم میں آرام فرما رہے تھے کہ جبریل امین حاضر خدمت ہوئے، خواب سے بیدار کیا اور ارادۂ خداوندی سے آگاہی بخشی۔ حضور ﷺ اٹھے، چاہ زمزم کے قریب لائے گئے، سینہ مبارک کو چاک کیا گیا، قلب اطہر میں ایمان و حکمت سے بھرا ہوا ایک طشت انڈیل دیا گیا اور پھر سینہ مبارک درست کر دیا گیا۔ حرم سے باہر تشریف لائے تو سواری کے لیے ایک جانور پیش کیا گیا، جو براق کے نام سے موسوم ہے۔ اس کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ جہاں نگاہ پڑتی تھی وہاں قدم رکھتا تھا۔ حضور ﷺ اس پر سوار ہو کر بیت المقدس آئے اور جس حلقے سے انبیاء کی سواریاں باندھی جاتی تھیں، براق کو بھی باندھ دیا گیا۔ حضور ﷺ مسجد اقصیٰ میں تشریف لے گئے، جہاں جملہ انبیائے سابقین حضور ﷺ کے لیے چشم براہ تھے۔ حضور ﷺ کی اقتداء میں سب نے نماز ادا کی۔ اس طرح لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ کا جو وعدہ روز ازل میں ارواح انبیاء سے لیا گیا تھا، (کہ تم میرے محبوب پر ضرور ایمان لانا) کی تکمیل ہوئی۔ بعد ازاں مرکب ہمایوں بلندیوں کی طرف پر کشا ہوا۔ مختلف طبقات آسمانی پر مختلف انبیاء سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ساتویں آسمان پر اپنے جد کریم ابو الانبیاء حضرت خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ملاقات ہوئی۔

حضرت نے مَرۡحَبًا بِالنَّبِیِّ الصَّالِحِ وَالۡاِبۡنِ الصَّالِحِ۔(1) (یعنی اے نبی صالح! خوش آمدید اور فرزند دلبند! مرحبا) کے محبت بھرے کلمات سے استقبال کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت المعمور سے پشت لگائے بیٹھے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آگے بڑھے اور سدرۃ المنتہی تک پہنچے جو انوارِ ربانی کی تجلی گاہ تھی۔ جس کی کیفیت الفاظ کے پیمانوں میں سما نہیں سکتی۔ عقاب ہمت یہاں بھی آشیاں بند نہیں ہوئے اور آگے بڑھے.......... کہاں تک گئے؟ اسے ماوشما کیا سمجھیں؟ زبانِ قدرت نے مقامِ قرب کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ﴿۸﴾ فَكَانَ قَابَ قَوۡسَیۡنِ اَوۡ اَدۡنٰی ﴿۹﴾ (النجم) وہاں کیا ہوا؟ یہ بھی میری اور آپ کی عقل کی رسائی سے بالاتر ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ فَاَوۡحٰۤی اِلٰی عَبۡدِهٖ مَاۤ اَوۡحٰی ﴿۱۰﴾ (النجم) علامہ سید سلمان ندوی کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

پھر شاہد مستورِ ازل نے چہرہ سے پردہ اٹھایا اور خلوتِ گاہ راز میں ناز و نیاز کے وہ پیغام عطا ہوئے جن کی لطافت و نزاکت بار الفاظ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ فَاَوۡحٰۤی اِلٰی عَبۡدِهٖ مَاۤ اَوۡحٰی ﴿۱۰﴾ (نجم) (سیرت النبی جلد ۳)

اسی مقامِ قرب اور گوشۂ خلوت میں دیگر انعاماتِ نفیسہ کے علاوہ پچاس نمازیں ادا کرنے کا حکم ملا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عرضداشت پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کئی بار بارگاہِ رب العزت میں تخفیف کے لیے التجا کی۔ چنانچہ نمازوں کی تعداد پانچ کر دی گئی اور ثواب پچاس ہی کا رہا۔ فراز عرش سے محبوب رب العالمین مراجعت فرمائے خاکدانِ ارضی ہوئے۔ ابھی یہاں رات کا سماں تھا۔ ہر سو رات کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی، سپیدۂ سحر کا کہیں نام نشان تک نہ تھا۔

واقعۂ معراج کو اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ یہ مسافت بیشک بڑی طویل ہے۔ اس سفر میں پیش آنے والا ہر واقعہ بلاشبہ عجیب و غریب ہے۔ اسی لیے وہ دل، جو نورِ ایمان سے خالی تھے، انہوں نے اسے اسلام اور داعی اسلام کے خلاف سب سے

1۔ احکام القرآن از ابن عربی، جلد 3، صفحہ 1193، دار الفکر بیروت

Marfat.com

بڑا اعتراض قرار دیا۔ ضعیف الایمان لوگوں کے پاؤں ڈگمگا گئے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جن کے دلوں میں یقین کا چراغ ضوفشاں تھا، انہیں قطعاً کوئی پریشانی اور تذبذب نہیں ہوا اور نہ دشمنانِ اسلام کی ہرزہ سرائی اور غوغا آرائی سے وہ متاثر ہوئے، بلکہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اس واقعہ کا ذکر کیا گیا تو آپ نے بلا جھجک جواب دیا کہ اگر میرے آقا و مولا نے ایسا فرمایا ہے تو یقیناً سچ ہے۔ اہل ایمان کے نزدیک کسی واقعہ کی صحت و عدم صحت کا انحصار اس پر نہیں تھا کہ ان کی عقل اس کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہے، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ بے پایاں کے سامنے کسی چیز کو ناممکن خیال نہیں کرتے تھے۔ ان کا یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ جو چاہے، جس طرح چاہے، کر سکتا ہے۔ ہمارے وضع کیے ہوئے قواعد و ضوابط، اس کی قدرت کی بیکرانیوں کو محیط نہیں ہو سکتے اور جو اس واقعہ کی خبر دینے والا ہے، وہ اتنا سچا ہے کہ اس کی صداقت کے متعلق شک وشبہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ جب اس نے بتا دیا جس کی صداقت ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ اس قدرت والے نے ایسا کیا ہے، جو عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (البقرہ) ہے تو پھر وہ امکان و عدم امکان کے چکر میں کیوں پڑیں؟ اس لیے جب شب اسریٰ کی صبح کو حرمِ کعبہ میں نبی برحق نے کفار کے بھرے مجمع میں اس عنایت ربانی کا ذکر فرمایا تو لوگ دو حصوں میں بٹ گئے۔ بعض نے صاف انکار کر دیا اور بعض نے بلا چون و چرا تسلیم کیا۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب یہ واقعہ پیش آیا تھا، لیکن آج صورتِ حال قدرے مختلف ہے۔ ایک گروہ تو وہی منکرین کا ہے، دوسرا گروہ وہی ماننے والوں اور یقین کرنے والوں کا ہے، لیکن اب تیسرا گروہ بھی نمودار ہو گیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے اذہان اس منکر گروہ کی علمی اور مادی برتری کے حلقہ بگوش ہیں اور ادھر اسلام سے بھی ان کا رشتہ ہے۔ وہ نہ اسلام سے رشتہ توڑنے پر رضامند ہیں اور نہ اپنے ذہنی مربیوں کے مزعومات و نظریات رد کرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ ناچار اس واقعہ کی ایسی تاویلیں کرتے ہیں کہ واقعہ کا نام تو رہ جاتا ہے، لیکن اس کے سارے حسن و جمال پر پانی پھر جاتا ہے اور اس کی معنویت کالعدم ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ اپنے اس طریقہ کار پر بڑے مطمئن نظر آتے ہیں۔ وہ دل میں سمجھتے ہیں

Marfat.com

کہ انہوں نے اسلام پر وارد ہونے والا ایک بہت بڑا اعتراض دور کر دیا ہے۔ اس لیے ہمیں مختصراً تینوں گروہوں کو ایسے دلائل فراہم کرنا ہیں کہ اگر وہ تعصب کو بالائے طاق رکھ کر ان سے فائدہ اٹھانا چاہیں تو اٹھا سکتے ہیں۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی قدرت و عظمت اور اس کی شان کبریائی پر ایمان رکھتے ہیں اور حضور فخر موجودات، باعث تخلیق کائنات، سیدنا و مولانا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا سچا رسول مانتے ہیں، ان کے لیے تو واقعۂ معراج کی صداقت پر اس آیت کریمہ کے بعد مزید کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ یہاں اس آیت جلیلہ کی مختصر سی تشریح کی جاتی ہے:

آیت کا آغاز ''سبحان'' کے کلمہ سے کیا گیا۔ یہ سَبَّحَ يُسَبِّحُ سے علم ہے۔ اس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کے عیوب و نقائص سے مبرا اور منزہ ہے۔ علامہ زمخشری لکھتے ہیں:

عَلَمٌ لِلتَّسبِيحِ كَعُثمَانَ لِلرَّجُلِ وَانتِصَابُهُ بِفِعلٍ مُضمَرٍ. وَدَلَّ عَلَى التَّنزِيهِ البَلِيغِ مِن جَمِيعِ القَبَائِحِ الَّتِي يُضِيفُهَا اِلَيهِ اَعدَاءُ اللّٰهِ

(کشاف، ج ۲، ص ۶۴۶، مطبوعہ مکتب الاعلام الاسلامی)

یعنی یہ تسبیح مصدر کا علم ہے، جس طرح عثمان (اس کا ہم وزن کسی شخص کا علم ہوتا ہے) اور یہاں فعل مضمر ہے جو اس کو نصب دیتا ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تمام کمزوریوں، عیبوں اور کوتاہیوں سے بالکل پاک و منزہ ہے جن سے کفار اللہ تعالیٰ کو متہم کرتے تھے۔

علامہ آلوسی نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جو ارشاد نقل کیا ہے وہ بھی اس معنی کی تائید کرتا ہے۔

عَن طَلحَةَ قَالَ سَأَلتُ رَسُولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم عَن تَفسِيرِ سُبحَانَ اللّٰهِ فَقَالَ تَنزِيهُ اللّٰهِ عَن كُلِّ سُوءٍ۔ (1)

سبحان کے کلمہ سے یہ دعویٰ کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ ہر عیب و نقص، ہر کمزوری اور بے بسی سے پاک ہے، اس کے لیے دلیل کی ضرورت تھی، کیونکہ کوئی دعویٰ دلیل کے بغیر قابل قبول

1۔ روح المعانی، جلد 15، صفحہ 3، دار احیاء التراث العربی بیروت

Marfat.com

نہیں ہوا کرتا۔ بطورِ دلیل ارشاد فرمایا:

الَّذِیٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ (بنی اسرائیل:۱)

یعنی اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے اپنے محبوب بندے کو رات کے تھوڑے سے حصہ میں اتنا طویل سفر طے کرایا اور اپنی قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں اور آیاتِ بینات دکھائیں۔ جو ذات اتنے طویل سفر کو اتنے قلیل وقت میں طے کرا سکتی ہے، واقعی اس کی قدرت بے پایاں، اس کی عظمت بیکراں ہے اور اس کی کبریائی کے دامن پر کسی کمزوری اور بے بسی کا کوئی داغ نہیں۔ جس واقعہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی سبحانیت کی دلیل کے طور پر ذکر فرمایا ہے وہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہوسکتا، بلکہ کوئی بڑا اہم، عظیم الشان اور محیر العقول واقعہ ہوگا۔ اس لیے معراج کا انکار کرنا گویا اللہ تعالیٰ کی قدرت اور سبوحیت کی ایک قرآنی دلیل کو منہدم کرنا ہے۔

''اسریٰ'' رات کو سیر کرانے کو کہتے ہیں۔ لیلاً پر تنوین تقلیل کی ہے یعنی یہ سفر رات کے وقت ہوا، لیکن اس سفر میں ساری رات ختم نہیں ہوئی بلکہ رات کے ایک قلیل حصہ میں بڑی طمانیت اور عافیت سے طے پایا(1)۔ اسریٰ کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکر ''بعبدہٖ'' کے لفظ سے فرمایا گیا جس کی متعدد حکمتیں ہیں۔ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے مثل رفعت شان اور عالی مرتبت کو دیکھ کر امت اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائے جس میں عیسائی کمالات عیسوی کو دیکھ کر مبتلا ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ مفسرین نے لکھا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم بارگاہِ صمدیت میں مقام قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی ۝ (النجم) پر فائز ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے دریافت کیا:

بِمَ اُشَرِّفُکَ یَا مُحَمَّدُ؟

اے سراپا حمد وستائش! آج میں تجھے کس لقب سے سرفراز کروں؟ تو حضور نے جواباً عرض کی:

بِنِسْبَتِیْ اِلَیْکَ بِالْعُبُوْدِیَّۃِ (2)

1۔ الکشاف، جلد 2، صفحہ 646 2۔ البحر المحیط، جلد 6، صفحہ 5، دار احیاء التراث العربی بیروت

Marfat.com

مجھے اپنا بندہ کہنے کی نسبت سے مشرف فرما۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ذکر معراج کے وقت اسی لقب کو ذکر فرمایا جو اس کے حبیب نے اپنے لیے خود پسند فرمایا تھا۔

لِنُرِيَهُ مِنْ اٰيٰتِنَا الخ۔ ان کلمات میں اس سفر کی غرض و غایت بیان فرمائی کہ یہ سفر یوں نہیں کہ بھاگم بھاگ کرتے ہوئے حضور گئے ہوں اور اسی عجلت سے واپس آ گئے ہوں۔ نہ کچھ دیکھا نہ سنا، بلکہ صحیفۂ کائنات کے ہر ہر صفحہ پر، گلشن حیات کی ہر ہر پتی پر اللہ تعالیٰ کی قدرت، عظمت، علم اور حکمت کے جتنے کرشمے تھے سب بے نقاب کر کے آپ کو دکھا دیے گئے۔

اب آپ خود فرمائیے کہ جو لوگ معراج کو عالم خواب کا ایک واقعہ کہتے ہیں، ان کے نزدیک یہ واقعہ اللہ تعالیٰ کی سبوحیت اور پاکی کی دلیل کیوں کر بن سکتا ہے؟

قرآن کا یہ اندازِ بیان صاف بتا رہا ہے کہ یہ واقعہ خواب کا نہیں، بلکہ عالم بیداری کا ہے۔ اس پر یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ قرآنِ کریم کی دوسری آیات میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ یہ رؤیا یعنی خواب تھا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ (الاسراء:60)

یہاں ''رؤیا'' کا لفظ ہے، اس کا معنی خواب ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے یہ خواب آپ کو صرف اس لیے دکھایا تاکہ لوگوں کی آزمائش کی جا سکے۔ جب خود قرآن پاک نے تصریح کر دی کہ یہ خواب تھا تو پھر اس کا انکار کیسے کیا جا سکتا ہے؟ جواباً عرض ہے کہ اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ اس آیت کا تعلق واقعۂ معراج سے ہے ہی نہیں، بلکہ کسی دوسرے خواب سے ہے اور اگر اس پر اصرار ہو کہ اس آیت میں معراج ہی کا ذکر ہے تو پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تصریح کے بعد کوئی التباس نہیں رہتا۔ آپ نے فرمایا: یہاں ''رؤیا'' سے مراد عالم بیداری میں آنکھوں سے دیکھنا ہے۔

قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ: هِيَ رُؤْيَا عَيْنٍ اُرِيَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم (1)

علامہ ابن عربی اندلسی نے احکام القرآن میں ابن عباس کا یہ قول بھی نقل کیا ہے:

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 550، قدیمی کتب خانہ کراچی

Marfat.com

وَلَوْ كَانَتْ رُؤْيَا مَنَامٍ مَا افْتَتَنَ بِهَا اَحَدٌ وَّلَا اَنْكَرَهَا۔ فَاِنَّهُ لَا يَسْتَبْعِدُ عَلٰى اَحَدٍ اَنْ يَّرٰى نَفْسَهٗ يَخْتَرِقُ السَّمٰوٰتِ وَ يَجْلِسُ عَلَى الْكُرْسِيِّ وَ يُكَلِّمُهُ الرَّبُّ۔ (احکام القرآن از ابن عربی، جلد ۳، ص ۱۱۹۵)

یعنی اگر معراج، عالم خواب کا واقعہ ہوتا تو کوئی اس سے فتنہ میں مبتلا نہ ہوتا اور نہ کوئی اس کا انکار کرتا، کیونکہ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو دیکھے کہ وہ آسمانوں کو چیرتا ہوا اوپر جا رہا ہے یہاں تک کہ وہ کرسی پر جا کر بیٹھ گیا اور اللہ تعالیٰ نے اس سے گفتگو فرمائی تو ایسے خواب کو بھی مستبعد اور خلافِ عقل قرار دے کر اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

یہ لوگ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ واقعہ معراج بیان کرنے کے بعد حضور نے فرمایا:

ثُمَّ اسْتَيْقَظْتُ وَ اَنَا فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (1)

"پھر میں نیند سے بیدار ہوا اور اپنے آپ کو مسجد حرام میں پایا"۔ اس روایت کے متعلق فن حدیث کے ماہرین کی تصریح ملاحظہ فرمائیے، شبہ خود بخود دور ہو جائے گا۔

علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ یہ الفاظ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے شریک نے نقل کیے ہیں اور شریک، لَيْسَ بِالْحَافِظِ عِنْدَ اَهْلِ الْحَدِيْثِ (روح المعانی جلد ۱۵، ص ۱۶) کہ اہل حدیث کے نزدیک شریک حافظ حدیث نہیں ہیں۔

دوسری روایت سنیے:

اِنَّ هٰذَا اللَّفْظَ رَوَاهُ شَرِيْكٌ عَنْ اَنَسٍ وَ كَانَ تَغَيَّرَ بِاٰخِرَةٍ فَيُعَوَّلُ عَلٰى رِوَايَاتِ الْجَمِيْعِ (احکام القرآن لابن عربی، جلد ۳، ص ۱۱۹۴)

"یہ الفاظ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے صرف شریک نے روایت کیے ہیں۔ ان کا حافظہ آخر میں کمزور ہو گیا تھا۔ اس لیے ان کی روایات کے بجائے ان روایات پر بھروسہ کیا جائے گا جو باقی تمام راویوں نے بیان کی ہیں"۔

1۔ احکام القرآن از ابن عربی، جلد 3، صفحہ 1194

Marfat.com

عجب بات یہ ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث شریک کے علاوہ دیگر ائمہ حدیث، ابن شہاب، ثابت البنانی اور قتادہ نے بھی روایت کی ہے، لیکن ان کی روایت میں یہ الفاظ نہیں۔

وَقَدْ رَوَى حَدِيثَ الْاَسْرِیٰ عَنْ اَنَسٍ جَمَاعَةٌ مِّنَ الْحُفَّاظِ الْمُتَّقِيْنَ وَالْاَئِمَّةُ الْمَشْهُوْرِيْنَ كَابْنِ شِهَابٍ وَّ ثَابِتِنِ الْبُنَانِيِّ وَ قَتَادَةَ، فَلَمْ يَاْتِ اَحَدٌ مِّنْهُمْ بِمَا اَتٰى بِهٖ شَرِيْكٌ۔ (روح المعانی جلد ۱۵، ص ۶)

علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:

وَ قَوْلُهٗ فِيْ حَدِيْثِ شَرِيْكٍ عَنْ اَنَسٍ ثُمَّ اسْتَيْقَظْتُ فَاِذَا اَنَا فِي الْحَجَرِ مَعْدُوْدٌ فِيْ غَلَطَاتِ شَرِيْكٍ۔ (البدایۃ والنہایۃ، ج ۳، ص ۱۱۴، مطبعۃ السعادۃ مصر)

یعنی ان الفاظ کا شمار شریک کی غلطیوں میں ہوتا ہے۔

اس حدیث کے علاوہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے قول سے بھی استشہاد کیا جاتا ہے کہ ان حضرات کا بھی یہی خیال تھا کہ یہ خواب کا واقعہ ہے، لیکن محدثین پہلے تو اس قول کی نسبت ان حضرات کی طرف کرنے کو ہی مشکوک سمجھتے ہیں اور اگر روایت ثابت ہو بھی جائے تو ان کے قول پر جمہور صحابہ کے ارشادات کو ہی ترجیح دی جائے گی، کیونکہ اس وقت حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا تو بالکل کم سن تھیں اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ابھی تک مشرف باسلام ہی نہ ہوئے تھے، نیز یہ ان صاحبان کی اپنی ذاتی رائے ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد نہیں۔ علامہ ابوحیان اس کے متعلق لکھتے ہیں:

وَمَا رُوِيَ عَنْ عَائِشَةَ وَ مُعَاوِيَةَ اَنَّهٗ كَانَ مَنَامًا فَلَعَلَّهٗ لَا يَصِحُّ وَلَوْ صَحَّ، لَمْ يَكُنْ فِيْ ذٰلِكَ حُجَّةٌ لِاَنَّهُمَا لَمْ يُشَاهِدَا ذٰلِكَ لِصِغَرِ عَائِشَةَ وَ كُفْرِ مُعَاوِيَةَ اِذْ ذَاكَ وَ لِاَنَّهُمَا لَمْ يُسْنِدَا ذٰلِكَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ لَا حَدَّثَا بِهٖ عَنْهُ۔ (البحر المحیط، ج ۶، ص ۵)

اسی سلسلہ میں مقالاتِ سرسید کے مطالعہ کا بھی اتفاق ہوا۔ انہوں نے بھی بڑے شدو

مد سے معراج کو خواب ثابت کیا ہے اور اس ضمن میں طویل بحث کی ہے۔ ان کا مقالہ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مستشرقین اور عیسائی مؤرخین کے اعتراضات سے گھبرائے ہوئے ہیں اور ان کے زہر میں بجھے ہوئے طعن و تشنیع کے تیروں سے اسلام کو ہر قیمت پر بچانا چاہتے ہیں، خواہ اس کوشش میں اسلام کا حلیہ ہی کیوں نہ بگڑ جائے، عظمت مصطفوی ﷺ کا عقیدہ ہی کیوں نہ متزلزل ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے قادرِ مطلق ہونے کے دلائل و براہین کو ہی کیوں منہدم نہ کرنا پڑے۔ آپ اس جذبہ کے اخلاص کی تعریف کر سکتے ہیں، لیکن عواقب و نتائج کے لحاظ سے آپ اس کی تحسین نہیں کر سکتے۔ کیا معراج کا انکار کر کے آپ نے کسی کو حلقہ بگوش اسلام بنا لیا ہے؟ کیا آپ کی معذرت خواہی کو انہوں نے قبول کر کے آپ کے پیش کردہ ماڈرن اسلام پر اظہارِ ناراضگی چھوڑ دیا ہے؟ ہرگز نہیں! تو پھر اس محنت کا کیا حاصل؟ بجز اس کے کہ صحیح واقعات کا انکار کر کے اپنے تمام علمی ورثہ کو مشکوک اور مشتبہ کر دیا جائے۔

ہاں، میں اس طویل مقالہ کا ذکر کر رہا تھا۔ اس میں حضرت سر سید نے لکھا ہے کہ واقعۂ معراج کے متعلق جو احادیث مروی ہیں، ایک دوسرے سے اس قدر متناقض ہیں کہ صراحتاً ایک دوسرے کی تردید کرتی ہیں اور اپنی صحت واعتبار کھو دیتی ہیں۔

(مقالاتِ سرسید، جز ۱۱، ص ۶۲ ۷ مطبوعہ زرین آرٹ پریس ۶۱ ریلوے روڈ لاہور)

لیکن تناقض و تضاد کے جو نمونے انہوں نے ذکر کیے ہیں وہ حیرت انگیز ہیں۔ مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ایک حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ اس وقت حطیم میں تھے، دوسری میں ہے کہ حجر میں تھے، تیسری میں ہے کہ مسجد حرام میں تھے''۔ (1)

ذرا غور فرمایئے! کیا ان روایات میں تضاد نام کی کوئی چیز ہے؟ حطیم اور حجر تو ایک ہی جگہ کے دو نام ہیں یعنی وہ جگہ جو اصل میں تو کعبہ شریف کا حصہ تھی، لیکن جب سیلاب کی وجہ سے خانہ کعبہ گر گیا اور قریش نے اسے دوبارہ تعمیر کرنا چاہا تو سرمایہ کی قلت کی وجہ سے اسے باہر

1۔ مقالات سرسید، جز 11، صفحہ 32-731

Marfat.com

چھوڑ دیا۔ یہ حصہ (حطیم یا حجر) مسجد حرام میں ہے۔ تو ان روایات میں قطعاً کوئی تضاد نہیں۔

تضاد کی ایک دوسری مثال۔ مختلف آسمانوں کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ چھٹے آسمان کے متعلق ایک حدیث میں ہے:

ثُمَّ صُعِدَ بِیْ اِلَی السَّمَاءِ السَّادِسَةِ فَاِذَا مُوْسٰی

"پھر مجھے چھٹے آسمان کی طرف لے جایا گیا تو وہاں موسیٰ علیہ السلام کو پایا"۔

دوسری حدیث میں:

ثُمَّ عُرِجَ بِنَا اِلَی السَّمَاءِ السَّادِسَةِ فَاِذَا اَنَا بِمُوْسٰی فَرَحَّبَ لِیْ وَدَعَا لِیْ۔

"پھر ہمیں چھٹے آسمان کی طرف اوپر لایا گیا۔ وہاں میں نے موسیٰ کو پایا، انہوں نے مجھے مرحبا کہا اور میرے لیے دعا کی"۔

تیسری حدیث میں ہے:

فَلَمَّا جَاوَزْتُ بَكٰی

جب میں آگے بڑھا تو موسیٰ علیہ السلام رو پڑے۔ آپ خود فرمائیے کہ احادیث کے ان کلمات میں کوئی تضاد ہے؟

ہم مانتے ہیں کہ بعض روایات ایسی ہیں جن میں باہمی اختلاف پایا جاتا ہے، لیکن اس کے متعلق خود علمائے حدیث نے تصریح کی ہے اور جو حدیث زیادہ صحیح اور قوی تھی اس کو خود ترجیح دے دی ہے۔ جو تضاد ممتنع ہے وہ تو یہ ہے کہ دونوں روایتیں ایک ہی پایہ کی ہوں، کسی کو کسی پر ترجیح بھی نہ دی جا سکتی ہو اور ان کو یکجا جمع بھی نہ کیا جا سکتا ہو۔

بہر حال یہ ان لوگوں کے شکوک و شبہات کا مجمل تذکرہ ہے جو کسی نہ کسی طرح دلائل نقلیہ کا سہارا لے کر جسمانی معراج کا انکار کرتے ہیں۔

اب ذرا ان حضرات کے ارشادات کی طرف توجہ فرمائیے جو معراج اور دیگر معجزات کا اس لیے انکار کرتے ہیں کہ یہ خلافِ عقل ہیں، ان لوگوں کا دعویٰ یہ ہے کہ کائنات کا یہ نظام، اس میں بے عدیل ارتباط اور موزونیت، بے مثل ترتیب اور یکسانیت، اس امر پر شاہد عادل

Marfat.com

ہے کہ یہ نظام چند قوانین اور ضوابط کے مطابق عمل پیرا ہے، جنہیں قوانین فطرت (Laws of Nature) کہا جاتا ہے اور فطرت کے قوانین اٹل ہیں۔ ان میں ردو بدل ممکن نہیں۔ ورنہ کائنات کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔ اس لیے عقل معجزات کو تسلیم نہیں کرتی، کیونکہ معراج بھی ایک معجزہ ہے اس لیے یہ بھی عقلاً محال ہے۔

اس کے متعلق گزارش یہ ہے کہ علمائے اسلام نے معجزہ کی جو تعریف کی ہے وہ یہ نہیں کہ معجزہ وہ ہوتا ہے جو قوانین فطرت کے خلاف اور نوامیس قدرت سے برسر پیکار ہو، بلکہ معجزہ کی تعریف یہ ہے کہ:

اَلْاِتْیَانُ بِاَمْرٍ خَارِقٍ لِّلْعَادَةِ یَقْصُدُ بِهٖ بَیَانَ صِدْقِ مَنِ ادَّعٰی اَنَّهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ (المسامرة و غیرها من کتب العقائد)(1)

یعنی مدعی رسالت کی سچائی ثابت کرنے کے لیے کسی ایسے امر کا ظہور پذیر ہونا، جو عادت کے خلاف ہو، اسے معجزہ کہتے ہیں۔ یہ تعریف نہیں کی گئی کہ معجزہ وہ ہے جو قانونِ فطرت اور نوامیس قدرت کے خلاف ہو۔ ان لوگوں کا اعتراض تو تب قابل التفات ہوتا، جب معجزہ کو نوامیس قدرت کے خلاف مانا جاتا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ معجزات قانونِ فطرت کے مطابق ہی رو پذیر ہوئے ہوں، لیکن ابھی تک وہ قانونِ فطرت ہمارے ادراک کی سرحد سے ماورا ہو، یہ دعویٰ کرنا کہ فطرت کے تمام قوانین بے نقاب ہو چکے ہیں اور ذہن انسانی نے ان کا احاطہ کر لیا ہے، انتہائی مضحکہ خیز اور غیر معقول ہے۔ آج تک کسی فلسفی یا سائنسدان نے اس بات کا دعویٰ نہیں کیا۔

نیز قوانین قدرت کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ اٹل اور غیر متغیر ہیں، یہ بھی ناقابل تسلیم ہے۔ یہ خیال تب قابل تسلیم ہوتا جب ان قوانین کو ہر قسم کے نقص اور عیب سے مبرا سمجھ لیا جائے اور ان کے بارے میں یہ عقیدہ اختیار کیا جائے کہ اس کائنات کی آرائش و زیبائش کے لیے یہی قوانین کفایت کرتے ہیں لیکن اہل خرد کے نزدیک یہ خیال محل نظر ہے۔ چنانچہ

1۔ المسامرة، ص ۸۹، مطبعة السعادة مصر

Marfat.com

انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا کے مقالہ نگار نے معجزہ (Miracle) پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

It is an unwarranted idealism and optimism which finds the course of nature so wise and so good that any change in it must be regarded as incredible.

(Ency. Bri. V 15 P - 586)

''یہ ایک غیر معقول تصور اور خوش فہمی ہے، جو یہ خیال کرتی ہے کہ فطرت کا طریق کار اتنا دانش مندانہ اور بہترین ہے کہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی جائز نہیں''۔

اس کے علاوہ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ کیا آپ اللہ تعالیٰ کے وجود کو مانتے ہیں یا نہیں؟ اگر آپ منکر ہیں تو آپ سے معجزات کے متعلق بحث عبث اور قبل از وقت ہے۔ پہلے آپ کو وجودِ خداوندی کا قائل کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد معجزے کے اثبات کا مناسب وقت آئے گا اور اگر آپ وجودِ خداوندی کے قائل تو ہیں، لیکن آپ کا تصور یہ ہے کہ خدا اور فطرت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں یا آپ خدا کو خالق کائنات تو مانتے ہیں، لیکن یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اس کا اب اپنی پیدا کردہ دنیا میں کوئی عمل دخل نہیں اور وہ اس میں کسی طرح کا تصرف نہیں کر سکتا بلکہ الگ تھلگ بیٹھ کر ایک بے بس تماشائی کی طرح کائنات کے ہنگامہ ہائے خیر وشر کو خاموشی سے دیکھ رہا ہے، لیکن کچھ کر نہیں سکتا، تو پھر معجزہ کے انکار کی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے، لیکن اگر آپ ذاتِ خداوندی کے قائل ہیں اور اسے خالق ماننے کے ساتھ ساتھ قادرِ مطلق اور مدبر با اختیار بھی تسلیم کرتے ہیں اور یہ بھی ایمان رکھتے ہیں کہ کوئی پتہ اس کے اذن کے بغیر جنبش تک نہیں کر سکتا تو پھر آپ کا نوامیس فطرت کو غیر متغیر یقین کرنا اور اس بنا پر معجزات کا انکار ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا عام معمول یہ ہے کہ وہ علت ومعلول اور سبب ومسبب کے تسلسل کو قائم رکھتا ہے اور ظہور معجزہ کے وقت اس نے اپنی قدرت اور حکمت کے پیش نظر، خلافِ معمول اس تسلسل کو نظر انداز کر دیا ہے، کیونکہ وہ ایک با اختیار ہستی ہے۔ وہ جب چاہے اپنے معمول کو بدل دے۔

ایک شخص کی سالہا سال کی عادت یہ ہے کہ وہ روزانہ رات کو دس بجے سوتا ہے اور صبح

Marfat.com

چار بجے بیدار ہوتا ہے۔ اگر کسی روز آپ اسے ساری رات جاگتے ہوئے دیکھیں تو آپ اس مشاہدہ کا انکار نہیں کر سکتے۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہی کہہ سکتے ہیں کہ آج خلافِ معمول فلاں صاحب رات بھر جاگتے رہے۔ اسی طرح ان قوانین فطرت کو عادتِ خداوندی اور معمول ربانی سمجھنا چاہیے اور کسی چیز کا خلافِ معمول وقوع پذیر ہونا، قطعاً اس کے ناممکن ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا۔

The laws of nature may be regarded as habits of the divine activity, and miracles as unusual acts which, while consistant with the divine character, mark a new stage in the fulfilment of the purpose of God.

(Ency. Bri. V 15 P - 586)

''قوانین قدرت کو ہم عادتِ خداوندی کہہ سکتے ہیں اور معجزات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی حکمت کے پیش نظر خلافِ عادت ایسا کیا ہے اور یہ قطعاً ناروا نہیں''۔

مغربی فلاسفہ میں سے ڈیوڈ ہیوم (David Hume) نے معجزات پر بحث کی ہے اور بڑے شد و مد سے ان کا انکار کیا ہے۔ اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے جو طریقہ اس نے اختیار کیا ہے، وہ توجہ طلب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہمارا تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ عالم ایک مخصوص نہج اور متعین انداز کے مطابق چل رہا ہے اور معجزات ہمارے تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف رو پذیر ہوتے ہیں اس لیے معجزہ کو ثابت کرنے کے لیے ہمارے پاس جو دلائل ہیں وہ تجربہ اور مشاہدہ کے دلائل و براہین سے جب تک قوی و مضبوط نہ ہوں، اس وقت تک ہم معجزہ کو تسلیم نہیں کر سکتے اور کیونکہ ثبوت معجزہ کے لیے ایسے وزنی دلائل موجود نہیں، اس لیے عقلاً معجزہ کا امکان تسلیم کرنے کے باوجود ہم ان کے وقوع کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ انسائیکلو پیڈیا کا مقالہ نگار ہیوم کے اس نظریہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''ہم تمہارا یہ قاعدہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ معجزات تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہوتے

Marfat.com

ہیں۔ تجربات سے تمہاری کیا مراد ہے؟ کیا تم یہ کہتے ہو کہ معجزہ تمام تجربات کے خلاف ہوتا ہے؟ تو آپ کا یہ قاعدہ کلیہ محتاج دلیل ہے۔ پہلے آپ یہ تو ثابت کرلیں کہ آپ نے تمام تجربات کا احاطہ کرلیا ہے۔ پھر آپ کو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ یہ معجزہ ان تمام تجربات کے خلاف ہے۔ جب تک آپ اپنی دلیل کی کلیت ثابت نہیں کر سکتے اس وقت تک آپ کی دلیل قابل قبول نہیں اور اگر آپ یہ کہیں کہ تجربات سے مراد تجرباتِ عامہ ہیں، یعنی معجزہ تجربات عامہ کے خلاف ہے تو پھر اس سے فقط اتنا ہی ثابت ہوا کہ معجزہ عام تجربات اور عام معمولات کے خلاف ہے۔ تمام تجربات اور مشاہدات کے مخالف ہونا تو لازم نہ آیا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ معجزہ کسی تجربہ کے عین مطابق ہو، لیکن وہ تجربہ آپ کے فہم کی رسائی سے ابھی بلند ہو''۔

The phrase itself (that miracle is contrary to experience) is as paley pointed out, ambiguous. If it means all experience it assumes the point to be proved, if it means only common experience then it simply asserts that the miracle is unusual a truism.

(Ency. Bri. V 15 P - 586)

استاد احمد امین مصری ہیوم کے فلسفہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہیوم نے اپنے ایک مقالہ میں معجزات پر بحث کی ہے اور بڑی کوشش سے ان کا بطلان ثابت کیا ہے۔

اس میں اس نے لکھا ہے:

''کیونکہ معجزات ہمارے تجربے کے خلاف ہیں اس لیے ناقابل تسلیم ہیں''۔

استاد موصوف لکھتے ہیں کہ ہمیں یہ حق پہنچتا ہے کہ ہم ہیوم سے پوچھیں کہ ایک طرف تو تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ علت و معلول اور سبب و مسبب کا حقیقت الامر سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ ہم بارہا مشاہدہ کرتے آئے ہیں کہ ایسا ہو تو یوں ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہم نے ایک چیز کو دوسری چیز کی علت فرض کرلیا، حالانکہ حقیقت میں اس کا علت ہونا ضروری نہیں اور دوسری طرف تم معجزہ کا انکار اس اساس پر کرتے ہو کہ یہ مشاہدہ اور تجربہ کے خلاف ہے۔

Marfat.com

جب تمہارے نزدیک علیت و معلولیت کا کوئی قانون ہی نہیں۔ ہر چیز بغیر تحقیق علیت وقوع پذیر ہو رہی ہے، دوسری کسی چیز کے ساتھ ربط نہیں، تو پھر اگر معجزہ کا وقوع ہوا، جس کی ہم تعلیل کرنے سے قاصر ہیں تو کون سی قباحت ہو گئی۔ پہلے بھی جتنی چیزیں معرضِ وجود میں آئیں وہ علت حقیقیہ کے بغیر موجود تھیں اور یہ امر بھی بغیر علت کے ظاہر ہوا، پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ ایک تو تم تسلیم کرتے ہو اور دوسرے کے انکار میں اتنا غلو کرتے ہو کہ تمہیں اپنے فلسفہ کی بنیاد بھی سرے سے فراموش ہو گئی ہے؟ (قصۃ الفلسفۃ الحدیثۃ جزو اول صفحہ نمبر ۲۴۵، ۲۴۶، مطبعۃ لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر، والقاہرہ)

اور بعض صاحبان نے اپنے جذبۂ تجسس کو یہ تھپکی دے کر سلا دیا کہ ان واقعات کی کوئی حقیقت نہیں، بلکہ یہ معجزات محض عقیدتمندوں کے جوش عقیدت کی کرشمہ سازیاں ہیں کہ انہوں نے معمولی عادی واقعات کو مبالغہ آمیزی سے اس طرح بیان کیا کہ انہیں خرقِ عادت بنا کر رکھ دیا۔ جو لوگ تحقیق و جستجو کی خارزار وادیوں میں آبلہ پائی کی زحمت برداشت کرنا نہ چاہتے ہوں ان کے لیے محفوظ اور آسان ترین یہی طریقہ کار ہے، لیکن کیا یہ کسی مشکل کا حل ہے؟ یا اس سے کوئی عقدۂ لاینحل کھل سکتا ہے؟ یہ غور طلب ہے۔

آخر میں ایک اہم مقالہ کی طرف اشارہ کرنے کی اجازت طلب کرتا ہوں۔ معجزات کے بارے میں جناب محترم سرسید احمد خان نے ایک مفصل مقالہ لکھا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ معجزہ اس وقت تک معجزہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ قوانین قدرت کے خلاف نہ ہو کیونکہ اگر وہ کسی قانون قدرت کے مطابق ہوگا، تو اس کا ظہور نبی کے علاوہ کسی اور شخص سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے معجزہ کا خلافِ قانون ہونا ضروری ہے۔ قانون قدرت اٹل ہے۔ ان میں کسی قسم کی تبدیلی یا ردوبدل کا رونما ہونا قطعاً باطل ہے، کیونکہ نصوصِ قرآنیہ میں بار بار یہ تصریح کی گئی ہے کہ قانونِ رحمت میں تغیر و تبدل نہیں آسکتا۔ اس لیے ثابت ہوا کہ معجزہ کا وقوع باطل ہے۔ (مقالات سرسید، ج ۱۳، ص ۹۱۔ ۷۸، ملخصاً)

آپ نے سرسید محترم کا استدلال ملاحظہ فرمالیا۔ انہوں نے معجزہ کی من گھڑت تعریف

Marfat.com

کر کے معجزہ کا بطلان کیا ہے، حالانکہ ہم پہلے بتا آئے ہیں کہ علمائے اسلام نے معجزہ کی یہ تعریف نہیں کی کہ وہ قوانین فطرت کے خلاف ہو، بلکہ معجزہ وہ ہے جو خارق عادت ہو۔ نیز معجزات کو قوانین فطرت کے خلاف کہنے کا دعویٰ تو تب درست ہو سکتا جب کہ پہلے تمام قوانین فطرت اور سنن الہیہ کا احاطہ کرنے کے دعویٰ کو کوئی ثابت کر لے اور جب تک یہ ثابت نہ ہو اور جو یقیناً ثابت نہیں تو پھر معجزات کو سنن الہیہ کے خلاف ٹھہرانا سراسر لغو ہوگا۔

بہر حال جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے، اس کے قادر مطلق ہونے کو تسلیم کرتا ہے اور یہ مانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بے بس تماشائی کی طرح اس ہنگامۂ خیر وشر کو دور سے بیٹھا ہوا دیکھ نہیں رہا بلکہ اس کے حکم، اس کی حکیمانہ تدبیر اور اس کے اذن سے نبض ہستی محوِ خرام ہے، اسے قطعاً ایسے معجزات کے بارے میں شک نہیں ہونا چاہیے جو صحیح اور قابل وثوق ذریعہ سے ثابت ہو چکے ہیں۔

قرآنِ کریم میں حضور سرورِ کائنات ﷺ کے اس عظیم ترین معجزۂ معراج کو جس مخصوص اسلوب سے بیان کیا گیا ہے، اس پر غور کرنے کے بعد عقل سلیم کو بلا چون و چرا ماننا پڑتا ہے کہ یہ واقعہ جس طرح آیاتِ قرآنی اور احادیث صحیحہ میں مذکور ہے، وہ سچ ہے، اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

Marfat.com

اقبال کا نظریہ محبت

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

صرف افراد اور اقوام ہی زوال و انحطاط سے دو چار نہیں ہوتیں بلکہ ان کی مخصوص اخلاقی قدریں، ان کے بنیادی نظریات، بلکہ ان کے زبان زد الفاظ تک زوال و انحطاط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کی رعنائیاں چھن جاتی ہیں۔ ان میں پنہاں حیات بخش قوتیں دم توڑ دیتی ہیں۔ کاوش و کوشش کا ہنگامۂ رستاخیز موت کے سکوت میں بدل جاتا ہے۔ وہ بے جان و بے حس خاک کے تودوں کی طرح اپنے پاس سے گزرنے والے برق رفتار قافلوں کو خاموش، اداس، پھٹی پھٹی نگاہوں سے صرف دیکھتے رہ جاتے ہیں اور کوئی مسیحا نفس ہی ان بے جان نظریات اور مردہ الفاظ کو حیاتِ نو بخشتا ہے۔ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا وجود اللہ تعالیٰ کی وہ نعمت عظمیٰ ہے۔ جس کی سپاس گزاری سے ملت اسلامیہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ اس کی ضربِ کلیمی نے اگر جبر و استبداد کے ہر پیکر کو چور چور کیا، اس کی بانگ درا نے اگر آسودۂ خواب غفلت قوم کو بیدار کیا، اس کی بالِ جبرئیل نے اگر درماندۂ راہ کو پر و بال دیے اور ملت کو شوقِ پرواز بخشا، تو اس صاحب صور اسرافیل نے ہماری مردہ اخلاقی قدروں، بے جان نظریوں اور بے روح لفظوں کو ایک نئی زندگی سے بھی ہمکنار کیا۔

غور فرمائیے! فقر وہ مادر مشفق ہے۔ جس کی گود میں ہم نے آنکھیں کھولیں، جس کے دامن شفقت میں ہم پروان چڑھے، لیکن چند صدیوں سے ہمارے نزدیک فقر کا مفہوم اس کے بغیر کیا رہ گیا تھا کہ اقوام وملت کی قیادت کی ذمہ داریوں سے دست برداری، دنیا و مافیہا سے کنارہ کشی، رقص و سرود کی بے رنگ محفلیں اور ان میں شورش ہا و ہو۔ گوشۂ خانقہی اور یاس و قنوط میں لپٹا ہوا گھپ اندھیرا۔ اقبال آیا اور اس نے اپنی پرسوز اور پر زور قلندرانہ ادا میں لوگوں کو اسلامی فقر سے روشناس کیا۔ اسلامی فقر کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

یعنی آں فقرے کہ داند راہ را
بیند از نورِ خودی اللہ را

اندرون خویش جوید لا الٰہ
در تہ شمشیر گوید لا الٰہ

مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

چیست فقر اے بندگانِ آب و گل!
یک نگاہِ راہ بیں یک زندہ دل
با سلاطیں درفتد مرد فقیر
از شکوہ بوریا لرزد سریر (1)

فقر کی باطل سوز اور حق افروز بے پناہ اور بے باک قوتوں کا بیان ہوتا ہے

فقر چوں عریاں شود زیر سپہر
از نہیب او بلرزد ماہ و مہر
فقر عریاں گرمئ بدر و حنین
فقر عریاں بانگ تکبیر حسین (2)

معلوم نہیں ہمارے اس مرد فقیر پر غم واندوہ کا کون سا پہاڑ ٹوٹا ہوگا؟ جب اس نے اپنے گردوپیش نظر ڈالتے ہوئے لکھا ہوگا۔

فقر را تا ذوق عریانی نہ ماند
آں جلال اندر مسلمانی نہ ماند (3)

توحید، ملت اسلامیہ کی اساس ہے اور ایمان بتقدیر اور توکل اس کا طبعی ثمر ہے اور صدیوں ہماری زیست کے دھارے اس سے ابلتے رہے۔ زوال کے گردوغبار نے اس کے حسن کو بھی مستور کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ مصائب وحوادث کے سیل بے پناہ میں

1۔ پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق صفحہ 68، کلیات اقبال فارسی صفحہ 864، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور
2۔ ایضاً، صفحہ 20، (کلیات صفحہ 816)
3۔ پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق مع مسافر صفحہ 22 (کلیات صفحہ 818)

Marfat.com

تنکوں کی طرح بے بسی اور خاموشی سے بہے چلے جانے کا نام ایمان بتقدیر اور توکل رہ گیا۔ اقبال کی نوائے شعلہ پرور نے خس وخاشاک کے اس ڈھیر کو بھی خاکستر بنا دیا۔ وہ طنز و تشنیع کے انداز میں ازراہِ حیرت واستعجاب پوچھتے ہیں۔

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ (1)

پھر فرماتے ہیں۔

کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلمان
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی (2)

اور واشگاف الفاظ میں اپنی قوم کو بتاتے ہیں کہ عمل اور توکل دو متضاد چیزیں نہیں بلکہ ان کا باہمی رشتہ تو تیر وکمان کا رشتہ ہے۔

مومن از عزم و توکل قاہر است
گرنہ دارد ایں دو جوہر کافر است (3)

انہیں الفاظ سے ایک بہت مظلوم اور نہایت ستم رسیدہ لفظ محبت ہے۔ ہمارے کرم فرما ہمیں یہ یقین دلا رہے تھے کہ محبت کی کل کائنات بس اتنی ہی ہے۔

رنگ زرد و آہ سرد و چشم تر

ہمارا قیس جستجوئے لیلیٰ میں صحرا نورد نہیں تھا، بلکہ محض وقف جمود ہو کر رہا گیا تھا۔ ہمارے فرہاد سے تیشۂ خاراشگاف چھن چکا تھا۔ بڑے بوڑھے اسے یہی نصیحت کر رہے تھے کہ میاں! اب اپنی زبان کے تیشۂ فولاد کو حرکت دو اور گیخسرو کی عیاری اور مکاری کی مرثیہ خوانی کیا کرو اور مرزا نوشہ نے تو چشم بد دور یہاں تک فرما دیا تھا۔

1۔ارمغان حجاز، صفحہ 57 (کلیات اقبال اردو صفحہ 749) اقبال اکیڈمی لاہور
2۔بال جبریل صفحہ 46 (کلیات اقبال اردو صفحہ 370)
3۔پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق صفحہ 8 (کلیات اقبال فارسی صفحہ 804)

Marfat.com

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے (1)

گویا کسی مقصد کے لیے خود فراموشی اور مراق کے مارے کی بے ہوشی میں کچھ فرق ہی نہیں۔ افق پر خوفناک قسم کا اندھیرا تھا، فضا گرد وغبار سے اٹی پڑی تھی کہ عشق کا محرم، اپنے ساقی کی نگاہِ کرم کا پروردہ، سمند شوق پر سوار اپنے کندھوں پر پورا میخانہ محبت اٹھائے جلوہ افروز ہوا۔ جب اس نے اپنی محفل جمائی اور اپنے جام سوزلحن میں شراب محبت و مستی بھر بھر کر پلائی تو خود فراموش رندوں کو ہوش آنے لگا، ان کے اٹے ہوئے جذبات کو تپش خرام نصیب ہوئی۔

تفصیلات سے بحث کرنے سے پیشتر یہ جاننا از حد اہم ہے کہ محبت ہے کیا؟ اس سوال کا جواب اگر آپ لغت کی بھاری بھر کم کتابوں سے تلاش کریں گے یا فلسفہ اور نفسیات کے گراں بہا صحائف سے دریافت کریں گے تو بجز پریشانی اور حیرت آفرینی سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ علامہ ابن قیم نے کتنے پتے کی بات کہی ہے کہ محبت کی جتنی تعریف اور وضاحت کی جائے گی اتنا ہی ابہام بڑھے گا اور پیچیدگیوں میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ محبت کی صحیح اور واضح تعریف یہی ہو سکتی ہے کہ محبت محبت ہے۔ (2)

لیکن آخر سخن طرازی بھی تو کوئی چیز ہے۔ ہر چند اس اختصار سے کہ محبت محبت ہے، گو مفہوم واضح ہو جائے، لیکن نہ کہنے والے کی حسرت پوری ہو اور نہ سننے والے کا ارمان مٹے۔ اس لیے تھوڑا سا اور سن لیجئے۔ حسن و جمال کی قدر شناسی کو محبت کہتے ہیں اور حسن و جمال کسی ایک صورت ولباس کی اسیر وزندانی نہیں۔ کسی بت طناز کی چشم نیم باز، کسی سرو قامت کا خرام ناز، کسی کا لحن داؤدی، کسی کا سحر بیاں، کسی کی نڈر شجاعت، کسی کی پاکیزہ اور بے داغ سیرت اور کسی کا اخلاق بلند، یہ سب آفتاب حسن و جمال کی کرنیں ہیں۔ حسن کسی رنگ میں ہو، دل کش ودلربا ہی ہوا کرتا ہے اور اپنے قدردانوں کے دلوں میں وصال وحصول کی ایک تڑپ

1۔ دیوان غالب صفحہ 282، مطبع زاہد بشیر پرنٹرز لاہور
2۔ مدارج السالکین، جلد 3، صفحہ 9، دار الکتب العربیۃ بیروت

Marfat.com

اور پیاس سی پیدا کر دیتا ہے اور جب عقل کے رنگ محل میں محبت کا چراغ جگمگانے لگتا ہے تو وادیٔ ایمن بن جاتا ہے اور جب ہوش و خرد کے بت کدہ میں خلیل عشق قدم رنجہ فرماتا ہے تو ہواؤ ہوس، حیلہ سازی، مصلحت کوشی کے بت پاش پاش ہوکر پیوند خاک ہو جاتے ہیں۔

ہمارا فیلسوف اسی عشق کا نقیب ہے۔انہوں نے ہمیں بتایا کہ عشق و محبت کی چند امتیازی خصوصیات ہیں جن کے بغیر عشق عشق نہیں، بوالہوسی ہے، لذت طلبی ہے۔ محبت محبت نہیں، عیش کوشی ہے، نفس پرستی ہے۔ عشق کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کا قلم حقیقت رقم کرتا ہے کہ عشق بے نیاز ہوتا ہے۔ تہی دست، تہی دامن ہونے کے باوجود اس کے پہلو میں دل (از ہر دو عالم بے نیاز ے) دھڑک رہا ہوتا ہے، وہ بے باک اور نڈر ہوتا ہے۔ کسی سے ہراساں ہونا جانتا ہی نہیں۔

نہ محتاجِ سلطاں نہ مرعوب سلطاں
محبت ہے آزادی و بے نیازی
مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے
یہ آدم گری ہے وہ آئینہ سازی (1)

عشق کبھی مرثیہ خواں یا نوحہ کناں نہیں ہوتا، بلکہ حیات بخش و قوت آفرین ہوتا ہے۔

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دمبدم
آدمی کے ریشہ ریشہ میں سما جاتا ہے عشق
شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم (2)

عشق وہ چشمہ ہے جس سے پاکیزہ اور پر جوش عمل کے دھارے پھوٹتے ہیں۔ یہ زندہ جاوید ہے۔ فنا کا ہاتھ، جس کی ہلاکت آفرینیوں سے سارے چمن ہستی میں صف ماتم بچھتی

1۔ بال جبریل، صفحہ 152 (کلیات صفحہ 476)
2۔ ایضاً صفحہ 44 (کلیات، صفحہ 368)

Marfat.com

ہے، عشق کے شہباز تک نہیں پہنچ سکتا۔

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات، موت ہے اس پر حرام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات (1)

عشق روباہ مزاج نہیں، اس کی فطرت اسد اللہی ہے۔ وہ حیلہ ومکر سے نہیں، بلکہ زورِ بازو سے اپنے مقابل کو پچھاڑتا ہے۔

آئین جواں مرداں، حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی (2)

عشق عقل کو ناکارہ نہیں کرتا، بلکہ اس کا مربی ہے۔ اس کی تنگ دامانی کو بیکراں وسعتیں بخشتا ہے۔ اس کی سرحدوں کو فراخ کرتا ہے۔ عشق شریعت کے قوانین کی روح ہے ؎

عقل و دل نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصورات (3)

اقبال اپنی ملت کے دلوں کو ٹٹولتے ہیں۔ ان کے سینوں میں جھانکتے ہیں اور جب انہیں پتہ چلتا ہے کہ محبت کا آتش کدہ بجھ چکا ہے تو چیخ اٹھتے ہیں ؎

بجھی عشق کی آگ، اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے (4)

عشق کے بغیر فرد ہو یا قوم، فنا پذیر ہے۔ اسے کوئی ظاہری جاہ وحشمت اپنے ہولناک انجام سے بچا نہیں سکتی۔ اپنی قوم کی پستی کی وجہ بتاتے ہوئے فرماتے ہیں:

1۔ ایضاً، صفحہ 97-96 (کلیات صفحہ 21-420)

2۔ بال جبریل، صفحہ 62 (کلیات صفحہ 386)

2۔ ایضاً، صفحہ 115 (کلیات، صفحہ 439)

3۔ ایضاً، صفحہ 128 (کلیات، صفحہ 452)

Marfat.com

شئے　پیش　خدا　بگریستم　زار
مسلماناں　چرا　زارند　و　خوارند
ندا　آمد　نمی　دانی　کہ　ایں　قوم
دلے　دارند　و　محبوبے　نہ　دارند (1)

لیکن عشق کی برکتیں اور فیوض اپنے کیف وکم اور قیمت و اہمیت میں یکساں نہیں ہوتے، بلکہ محبوب کے ساتھ ان کا گہرا ربط ہوتا ہے۔ اگر کسی کا مرکز عشق وہ ہے، جس میں حسن کا ایک پہلو ہے تو اس کا فیض بھی محدود ہوگا اور محبوب کی رعنائیوں کا حلقہ جتنا وسیع ہوتا جائے گا، اس کی برکتیں بھی عام ہوتی جائیں گی۔ اس بازارِ ہستی میں جبکہ قدم قدم پر حسن و جمال کی دوکانیں بجی ہوئی ہیں، جہاں ہر سمت کوئی نہ کوئی لالہ رو، آہو چشم، کمانِ ابرو میں ناوک مژگان رکھے دل شکار کرنے کی سوگند اٹھائے پھر رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس صورتِ حال میں دل کا سودا کرے تو کس سے، مرکز عشق بنائے تو کس کو؟

دنیا میں ایسے بھی تو گزرے ہیں جو اپنی تلخ نوائی سے سوتوں کو چونکا تو دیتے ہیں، لیکن منزل کا پتہ نہیں دیتے، یا منزل تو بتاتے ہیں، لیکن راہِ منزل سے ناآشنا ہونے کے باعث راہی کو چوراہے پر لا کر چھوڑ دیتے ہیں تا کہ مسافر عمر بھر بھٹکتا پھرے اور سر پٹختا پھرے اور حسرت ویاس میں دم توڑ دے۔

لیکن ابر رحمت برسے اور تا قیامت برستا رہے اس قبر پاک پر جہاں خضر امت استراحت فرما ہے، جس نے خوابِ غفلت سے جگایا، منزل بھی بتائی اور راہ بھی دکھائی، جو منزل تک اپنے راہی کو یقیناً پہنچا دیتی ہے۔ بشرطیکہ راہی حجت بازی اور تاویل کا خوگر نہ ہو۔ آیئے! اس مضمون کی آخری لیکن اہم ترین کڑی کو مختصراً مفکر اسلام، فیلسوف مشرق، شاعر رنگین نوا، مرد قلندر اور فقیر حق شناس و درویش حق گو کے الفاظ ہی میں سن لیں۔

1۔ ارمغان حجاز، صفحہ 41 (کلیات اقبال فارسی صفحہ 923)

Marfat.com

نقطۂ نورے کہ نام او خودی است
زیر خاک ما شرار زندگی است
از محبت مے شود پائندہ تر
زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر
از نگاہِ عشق خارا شق بود
عشق حق آخر سراپا حق بود

عشق کا اعجاز و کمال بیان فرمانے کے بعد اب محبوب کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

عاشقی آموز و محبوبے طلب
چشم نوحے قلب ایوبے طلب (1)

اب جبکہ آفتابِ حسن کی ہر کرن ''نظارہ دامن دل میکشد کہ جا اینجا است'' کہتے ہوئے خود کعبۂ محبت بننے کا دعویٰ کر رہی ہے تو ہم کیا کریں؟ اس پوشیدہ گرہ کو بھی ہمارا روشن ضمیر فیلسوف یوں صفائی سے کھولتا ہے۔ اے مومن! تیری نگاہ تلاشِ حبیب میں کیوں آوارۂ کاخ وکو ہے؟ تو ہر صیاد کا نخچیر کیوں ہے؟ ذرا دیکھ تو اپنے دل کے آئینہ میں، تیرا محبوب تو اپنی جہانگیر رعنائیوں کے ساتھ، اپنی آفاقی دلربائیوں کے ساتھ، حسن و جمال کی ساری نزاکتوں اور لطافتوں کو سمیٹے، ترے آئینہ دل میں جلوہ گر ہے۔

ہست معشوقے نہاں اندر دلت
چشم اگر داری بیا بنمائمت (2)

اس کی کیا شان ہے اس کی کیا آن ہے! دوسرے حسین تو خود حسین ہوتے ہیں مگر تیرا وہ

1۔ اسرار و رموز صفحہ 18 (کلیات اقبال فارسی صفحہ 18)
2۔ ایضا صفحہ 19 (کلیات اقبال فارسی صفحہ 19)

Marfat.com

نرالا محبوب ہے۔

عاشقان او ز خوبان خوب تر
خوشتر و زیبا تر و محبوب تر
دل ز عشق او توانا مے شود
خاک ہمدوش ثریا مے شود (1)

اور اگر اب بھی نہیں پہچان سکے تو صاف سن لو۔

در دل مسلم مقامِ مصطفیٰ ست
آبروئے ما زنام مصطفیٰ ست
طور موجے از غبار خانہ اش
کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش
کمتر از آنے زاوقاتش ابد (2)
کاسب افزائش از ذاتش ابد
بوریا ممنون خواب راحتش
تاج کسریٰ زیر پائے امتش
ماند شب ہا چشم او محروم نوم
تا بہ تخت خسروی خوابید قوم (3)

جاننے والے خوب جانتے ہیں کہ اقبال کا سارا کلام عشق مصطفیٰ علیہ اطیب التحیۃ واجمل الثناء میں بسا ہوا ہے۔ ہر کتاب اسی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ اسی کی عطر بیز خوشبو سے اس کا صفحہ صفحہ، سطر سطر، بلکہ حرف حرف مہک رہا ہے۔

طوالت کا خوف ہے اور آپ کے اکتا جانے کا اندیشہ، ورنہ جو مزا بیان حکایت گیسوئے عنبر بار حبیب میں ہے، وہ کسی اور بات میں نہیں۔

1۔ ایضاً، صفحہ 19 (کلیات اقبال فارسی صفحہ 19) 2۔ ایضاً، صفحہ 19 (کلیات اقبال فارسی صفحہ 19)
3۔ اسرار و رموز، صفحہ 19 (کلیات اقبال فارسی صفحہ 19)

Marfat.com

مومناں زیر سپہر لاجورد زندہ از عشق اندو نے از خواب و خورد
مے ندانی عشق و مستی از کجا است ایں شعاع آفتاب مصطفیٰ است
زندہ تا سوز او در جانِ تست
ایں نگہ دارندۂ ایمان تست (1)

راہی بیدار ہو چکا ہے۔ رخت سفر باندھے آمادۂ رحیل ہے۔ منزل کا تعین ہو چکا۔ اب راہی کونسی راہ اختیار کرے کہ لیلائے مقصود سے وصال میسر ہو، منزل مقصود تک رسائی ہو؟ اس کے لیے واضح طور پر ارشاد فرماتے ہیں:

عاشقے محکم شو از تقلید یار تا کمند تو شود یزداں شکار
لشکرے پیدا کن از سلطانِ عشق جلوہ گر شو بر سر فارانِ عشق
تا خدائے کعبہ بنوازد ترا
شرح اِنّی جَاعِلٌ سازد ترا (2)

1۔ پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق مع مسافر صفحہ 68 (کلیات اقبال فارسی صفحہ 864)
2۔ اسرار و رموز صفحہ 22 (کلیات اقبال فارسی صفحہ 22)

اسلام

اور

مزارعت

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پاکستان ٹائمنر کے ۲۷ اگست ۱۹۷۲ء کے شمارہ میں ایک مضمون شائع ہوا ہے، جس کا عنوان ہے ''نبی کریم ﷺ کی زرعی اصلاحات''۔ اس میں فاضل مضمون نگار نے دعویٰ کیا ہے کہ اسلام میں زمین کو بٹائی پر دینا یا پٹہ پر دینا حرام ہے۔ انہوں نے اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے چند آیات اور احادیث طیبہ سے استدلال کیا ہے اور اس کے ساتھ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تعامل کو بھی حجت قرار دیا ہے کہ آپ نے شام اور عراق کی مفتوحہ زمینیں مسلمان غازیوں میں تقسیم نہ کیں، بلکہ ان کو جوں کا توں رہنے دیا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم مضمون نگار کے ان دلائل کا بنظر غائر مطالعہ کریں تا کہ مزارعت کے بارے میں اسلام کا نظریہ کھل کر ہمارے سامنے آجائے شک وشبہ کے اندھیرے دور ہو جائیں، صراطِ مستقیم واضح ہو جائے، تا کہ جو سعادت مند صدقِ دل سے اس پر گامزن ہونا چاہتا ہے، وہ ایسا کر سکے۔

موصوف نے جن متعدد آیات سے استدلال کیا ہے، ان سب کا مضمون ایک ہی ہے کہ زمین و آسمان کی ہر چیز کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ انسان کی حیثیت ایک امین کی ہے اور کسی امین کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ مالک کی مرضی کے بغیر اس کی کسی چیز میں کسی قسم کا تصرف کرے۔

ہم قرآنِ کریم کے بیان کردہ ان حقائق کو بسر وچشم تسلیم کرتے ہیں۔ اس میں شک کی ذرہ بھر گنجائش نہیں۔ بلاشبہ زمین و آسمان کی ہر چھوٹی بڑی چیز کا خالق اور مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کی اجازت کے بغیر اور اس کے حکم کے خلاف اس میں کسی قسم کی مداخلت اور تصرف سراسر ناجائز ہے، لیکن مقالہ نگار نے ان آیات سے مزارعت کی حرمت پر جو استدلال کیا ہے، وہ محلِ نظر ہے، کیونکہ ان آیات میں صرف مزروعہ زمین کو ہی اللہ تعالیٰ کی ملکیت قرار نہیں دیا گیا، بلکہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں ہے۔ منقولہ اور غیر منقولہ کی بھی اس میں کوئی تخصیص نہیں۔

Marfat.com

کیا آپ ہر چیز کو اجرت پر دینے سے روکیں گے؟ آخر زندگی کا کاروبار کیسے چلے گا؟ نیز ان آیات پر غور کرنے سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ان میں کوئی ایسا جملہ نہیں ہے، جس سے زمین کو کاشت کے لیے بٹائی یا پٹہ پر دینے کی ممانعت ثابت ہوتی ہو۔

بعض احادیث میں مزارعت اور مخابرت سے منع کیا گیا ہے اور انہی احادیث کی وجہ سے فاضل مقالہ نگار کو یہ دھوکا ہوا ہے کہ شریعت اسلامیہ میں مزارعت مطلقاً ناجائز اور ممنوع ہے، لیکن اگر وہ تھوڑی سی زحمت برداشت کرتے اور کتب حدیث کا مطالعہ فرماتے تو ان پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اس زمانہ میں مزارعت کا کون سا طریقہ عام طور پر رائج تھا اور اس میں کیا نقائص تھے، جن کی وجہ سے اس کو منع کیا گیا؟ انہوں نے حضرت رافع بن خدیج کی مجمل روایت کو پیش نظر رکھا، لیکن انہی کی وہ مفصل روایتیں شاید نہیں پڑھیں، جن میں انہوں نے اس وقت کی مزارعت کی صورت کا ذکر کیا ہے۔ آپ کے ملاحظہ کے لیے ان کی روایت پیش خدمت ہے:

عَنْ حَنْظَلَةَ بْنِ قَيْسٍ الْاَنْصَارِيْ قَالَ سَمِعْتُ رَافِعَ بْنَ خُدَيْجٍ قَالَ: كُنَّا اَكْثَرَ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَزْرَعًا كُنَّا نَكْرِى الْاَرْضَ بِالنَّاحِيَةِ مِنْهَا مُسَمًّى لِسَيِّدِ الْاَرْضِ۔ قَالَ: فَمِنْ مَا يُصَابُ ذٰلِكَ وَ تَسْلَمُ الْاَرْضُ وَ مِمَّا تُصَابُ الْاَرْضُ وَ يُسَلَّمُ ذٰلِكَ فَنُهِيْنَا۔ (صحیح بخاری)

"حضرت حنظلہ بن قیس انصاری فرماتے ہیں کہ میں نے رافع بن خدیج سے سنا۔ انہوں نے کہا کہ اہل مدینہ میں سے ہمارے پاس زرعی زمین سب سے زیادہ تھی۔ ہم زمین کو کرایہ پر دیتے اور اس کا طریقہ یہ تھا کہ زمین کا ایک حصہ مالک زمین کے لیے مخصوص کر دیا جاتا اور اس میں جو فصل تیار ہوتی، وہ اس کو ملتی اور زمین کا دوسرا حصہ کاشت کار کو دیا جاتا، اس میں جو فصل بوئی جاتی اس کو کاشت کار برداشت کرتا۔ اس طرح کبھی کاشت کار کے حصۂ اراضی میں کسی وجہ سے فصل برباد ہو جاتی اور مالک کا حصۂ اراضی بالکل سلامت رہتا اور کبھی مالک کا حصہ برباد ہو جاتا اور کاشت کار کا حصہ محفوظ رہتا۔ اس لیے ہمیں اس طرح

Marfat.com

کی مزارعت سے منع کر دیا گیا"۔

سونے اور چاندی سے زمین پٹہ پر لینے کا اس وقت رواج ہی نہ تھا۔ انہی رافع بن خدیج کی دوسری روایت ملاحظہ فرمائیے:

عَنْ رَافِعٍ رضی اللّٰہ عنہ قَالَ کُنَّا اَکْثَرَ اَھْلِ الْمَدِیْنَۃِ حَقْلًا وَّ کَانَ اَحَدُنَا یَکْرِیْ اَرْضَہٗ فَیَقُوْلُ ھٰذِہِ الْقِطْعَۃُ لِیْ وَ ھٰذِہٖ لَکَ فَرُبَّمَا اَخْرَجَتْ ذِہٖ وَلَمْ تُخْرِجْ ذِہٖ فَنَھَاھُمُ النَّبِیُّ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم (1)

"حضرت رافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اہل مدینہ میں سے سب سے زیادہ مزروعہ زمینیں ہمارے پاس تھیں۔ جب ہم میں سے کوئی شخص زمین مزارعت پر دیتا تو وہ یہ کہتا کہ زمین کا یہ ٹکڑا میرے لیے ہے اور وہ ٹکڑا تیرے لیے اور بسا اوقات ایسا ہوتا کہ ایک ٹکڑے میں فصل پیدا ہوتی اور دوسرے میں برباد ہو جاتی۔ اس لیے حضور علیہ السلام نے اس طرح کی مزارعت سے منع فرما دیا"۔

علامہ ابن حجر نے اس حدیث پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

وَاَشَارَ بِھٰذِہِ التَّرْجُمَۃِ اِلٰی حَمْلِ النَّھْیِ فِیْ حَدِیْثِ رَافِعٍ عَلٰی مَا اِذَا تَضَمَّنَ الْعَقْدُ شَرْطًا فِیْہِ جِھَالَۃٌ اَوْ یُؤَدِّیْ اِلٰی غَرَرٍ۔ (2)

ترجمہ: یعنی مزارعت کی اس شکل کو اس لیے منع کیا گیا ہے کہ اس میں ایسی شرط عائد کی گئی ہے، جس سے ایک فریق کو سراسر نقصان اٹھانا پڑتا ہے اور دوسرا فریق ہر قسم کی منفعت کا مالک بن جاتا ہے۔ نیز اس طرح ایک فریق سے دھوکا ہوتا ہے۔

ان دونوں روایتوں سے واضح ہو گیا کہ اس طرح کی مزارعت میں بسا اوقات ایک فریق (مالک زمین یا کاشت کار) بالکل محروم ہو جاتا ہے اور دوسرا فریق مالا مال ہو جاتا ہے اور اسی قسم کے کاروبار کو شریعت میں "ربا" کہا جاتا ہے، جس میں ایک کا فائدہ یقینی ہو۔ اسلام میں

1۔ صحیح بخاری، باب ما یکرہ من الشروط فی المزارعۃ، جلد 1، صفحہ 313

2۔ فتح الباری، جلد 10، صفحہ 81، مکتبۃ الکلیات الازہریۃ مصر

Marfat.com

صرف ایسے کاروبار کی اجازت ہے، جس میں فریقین نفع اور نقصان میں برابر کے شریک ہوں۔ جب ساری زمین کی پیداوار مشترک ہوگی تو اگر فصل زیادہ ہوگی تو دونوں کو فائدہ پہنچے گا اور اگر کم ہوگی تو دونوں کو برابر کا نقصان ہوگا۔ اس صورت میں "ربو" کے پائے جانے کا کوئی امکان نہیں۔ مزید وضاحت کے لیے ایک اور حدیث ملاحظہ فرمایئے، جسے امام مسلم، ابو داؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی بھی حضرت رافع بن خدیج ہیں:

اِنَّمَا کَانَ النَّاسُ یُؤَاجِرُوْنَ عَلٰی عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وآله وسلم عَلَی الْمَاذِیَانَاتِ وَ اِقْبَالِ الْجَدَاوِلِ وَ اَشْیَاءَ مِنَ الزَّرْعِ فَیَهْلِکُ هٰذَا وَ یَسْلَمُ هٰذَا وَ یَسْلَمُ هٰذَا وَ یَهْلِکُ هٰذَا فَلَمْ یَکُنْ لِلنَّاسِ کِرًی اِلَّا هٰذَا. فَلِذٰلِکَ زُجِرَ عَنْهُ فَاَمَّا شَیْءٌ مَعْلُوْمٌ مَضْمُوْنٌ فَلَا بَاْسَ بِهٖ. (1)

"یعنی عہد رسالت میں لوگ جب زمینیں کاشت پر دیتے تھے تو یہ شرط لگاتے تھے کہ ماذیانات (مسائل الماء، پانی کی گزرگاہیں) کے پاس جو فصل ہوگی وہ ہماری ہوگی اور نالیوں کے سروں پر جو فصل ہوگی وہ ہماری ہوگی اور ہم پیداوار سے کچھ غلہ لے لیں گے، باقی کھیت تمہارا ہوگا۔ اس طرح بسا اوقات جو جگہ مالک اپنے لیے مخصوص کرتا وہ تباہ ہو جاتی اور دوسری جگہ فصل خوب ہوتی اور بسا اوقات اس کے برعکس ہوتا تو مالک کی فصل اچھی ہوتی اور مزارع کی فصل برباد ہو جاتی اور لوگوں میں زمین مزارعت پر دینے کا یہی طریقہ تھا۔ اس لیے اس سے حکماً منع کر دیا گیا، لیکن اگر معلوم اور مضمون چیز پر مزارعت ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے"۔

خط کشیدہ الفاظ پر آپ دوبارہ نظر ڈالیں تو آپ کو اس زمانہ میں مزارعت کا رائج طریقہ معلوم ہو جائے گا۔ اس صورت میں جس طرح ایک فریق کو سراسر نقصان اٹھانا پڑتا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اس لیے علامہ شوکانی نے اسی نہی کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

وَ هٰذَا الْحَدِیْثُ یَدُلُّ عَلٰی تَحْرِیْمِ الْمُزَارَعَةِ عَلٰی مَا یُفْضِیْ اِلَی الْغَرَدِ

1۔ صحیح مسلم، باب کراء الارض، جلد 2، صفحہ 13، قدیمی کتب خانہ کراچی

Marfat.com

وَالْجِهَالَةِ وَ يُوْجِبُ الْمُشَاجَرَةَ (1)

''یعنی اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ مزارعت صرف اس وقت حرام ہے جب یہ دھوکے اور جہالت کا سبب بنے اور باہمی جھگڑے کا باعث ہو''۔

ان کے علاوہ متعدد دیگر احادیث بھی پیش کی جاسکتی ہیں جن سے اس وقت کے طریقہ مزارعت پر روشنی پڑتی ہے اور اس طریقہ میں جو ظلم، دھوکہ اور ایک فریق کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے، وہ ہر شخص پر عیاں ہو جاتی ہے۔ اس لیے محدثین نے صراحۃً لکھا ہے کہ جن احادیث میں ''مخابرۃ'' یعنی مزارعت کی ممانعت آئی ہے ان سے وہی مخابرت مراد ہے جو زمانہ جہالت سے ان میں مروج تھی اور فریقین کے لیے طرح طرح کی پریشانیوں اور محرومیوں کا سبب بنتی تھی۔ بعض احادیث میں وضاحت کی ضرورت محسوس نہ کی گئی، کیونکہ اس رواج سے وہاں کا ہر آدمی واقف تھا، اس لیے اجمالی تذکرہ پر اکتفاء کیا۔

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے میں ایک اور حدیث پاک پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ امید ہے اس کے مطالعے سے ہر طرح کی غلط فہمی کا قلع قمع ہو جائے گا:

عَنْ اُسَيْدِ بْنِ زهير قال كَانَ اَحَدُنَا اِذَا اسْتَغْنٰى عَنْ اَرْضِهٖ اَوِ افْتَقَرَ اِلَيْهِ اَعْطَاهَا بِالنِّصْفِ وَالثُّلُثِ وَالرُّبُعِ وَ يَشْتَرِطُ ثَلَاثَ جَدَ اوِلَ وَالْقُصَارَةِ وَمَا يَسْقِى الرَّبِيْعُ وَ كَانَ يَعْمَلُ فِيْهَا عَمَلًا شَدِيْدًا وَ يُصِيْبُ مِنْهَا مَنْفِعَةً۔ فَاَتَانَا رَافِعُ بْنُ خُدَيْجٍ فَقَالَ نَهَى النَّبِىُّ صلى الله تعالىٰ عليه وآله وسلم عَنْ اَمْرٍ كَانَ لَكُمْ نَافِعًا۔ وَطَاعَةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم خَيْرٌ لَّكُمْ۔ (2)

''اسید بن زہیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے جب کسی آدمی کے پاس زائد زمین ہوتی تو وہ اس کو نصف، تہائی یا چوتھائی پر دیا کرتا اور ساتھ ہی یہ شرط لگاتا تھا کہ پانی کی تین نالیوں کے اردگرد جو کھیت ہو گا وہ میرا ہو گا۔ خوشوں کو ایک مرتبہ گاہنے کے بعد جو

1۔ نیل الاوطار، جلد 6، صفحہ 13، دار الفکر بیروت

2۔ نیل الاوطار، باب النہی عن الحقل، جلد 6، صفحہ 147

دانے خوشوں میں بچ رہیں گے وہ سارے میرے ہوں گے اور جس کھیت کو نالی سیراب کرے گی وہ میرا ہوگا۔ اس طرح بٹائی پر زمین دیتے، خوب محنت کرتے اور نفع حاصل کرتے اور جس کو زمین کی ضرورت ہوتی وہ اس شرط پر زمین لیتا۔ ایک دن رافع بن خدیج آئے اور انہوں نے آکر بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے کام سے تمہیں منع فرمادیا ہے، جس میں تمہارا فائدہ تھا اور حضور کی اطاعت تمہارے لیے سب سے بہتر ہے"۔

اس حدیث سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ مزارعت کی ممانعت کی علت یہ شروطِ فاسدہ تھیں جن کا وہاں عام رواج تھا اور جو طرح طرح کی خرابیوں کا باعث بنتی رہتی تھیں۔ نیز رافع کی حدیث جس میں اَرْبَيْتُمَا کا لفظ آیا ہے کہ تم دونوں (مالک زمین اور کاشتکار) نے سودی کاروبار کیا ہے۔ یہ حدیث قابل حجت نہیں، کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی بکیر بن عامر البجلی الکوفی ہے، جس کے متعلق علماء الجرح والتعدیل نے کہا ہے کہ وہ ضعیف ہے۔

ابوزرع کہتے ہیں: لَيْسَ بِقَوِيّ (1)

امام احمد نے فرمایا: لَيْسَ بِالْقَوِيِّ فِي الْحَدِيثِ۔ (2)

یحییٰ بن معین کہتے ہیں: قَالَ الْجُمْهُورُ هُوَ ضَعِيفٌ۔ (3)

ان احادیث پر بحث کرنے کے بعد جن سے بظاہر مزارعت کی ممانعت ثابت ہوتی ہے، اب ہم وہ دلائل پیش کرتے ہیں جن سے مزارعت کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

ا۔ حضور ﷺ نے جب خیبر فتح کیا تو یہودیوں نے گزارش کی کہ حضور! ہمیں یہاں سے جلاوطن نہ کیا جائے، بلکہ ہمیں یہ زمین بٹائی پر دے دیں۔ ہم اس میں کھیتی باڑی کریں گے، باغات کی آبیاری اور نگہداشت کا فریضہ انجام دیں گے، نصف غلہ اور پھل ہم لیں گے اور نصف حضور کی خدمت میں پیش کریں گے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ان کی اس

1۔ میزان الاعتدال، جلد 1، صفحہ 163، مطبعۃ السعادۃ مصر

2۔ تہذیب التہذیب، جلد 1، صفحہ 491، دار صادر بیروت

3۔ تہذیب الاسماء، جلد 1، صفحہ 135، ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ مصر

Marfat.com

عرضداشت کو منظور فرمایا۔ حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں اسی کے مطابق بٹائی ہوتی رہی۔ حضرت صدیق اکبر اور فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں یہی معمول رہا یہاں تک کہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے یہودیوں کو حجاز سے جلاوطن کر دیا۔(1)

اگر زمین مزارعت پر دینا جائز نہ ہوتا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہرگز اس کی اجازت نہ دیتے۔ حضور ﷺ کا عمل جو آخر وقت تک جاری رہا، کوئی دوسری روایت اس کی ناسخ نہیں بن سکتی۔

۲۔ حضور ﷺ جب مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف فرما ہوئے اور لٹے پٹے مہاجرین بھی وہاں پہنچ گئے تو انصارِ مدینہ نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی:

اِقْسِمْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ اِخْوَانِنَا النَّخِیْلَ قَالَ لَا فَقَالُوْا فَتَکْفُوْنَنَا الْمُؤْنَةَ وَ نُشْرِکُکُمْ فِی الثَّمْرَةِ۔ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا۔ (2)

"یارسول اللہ ﷺ! ان کھجوروں کے باغات کو ہمارے درمیان اور ہمارے مہاجر بھائیوں کے درمیان تقسیم فرمادیں۔ حضور ﷺ نے ان کی اس پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ انصار نے عرض کی کہ پھر ایسا کریں کہ ان باغات کی نگہداشت آب پاشی اور دیگر خدمات ہمارے مہاجر بھائی انجام دیں اور جو پھل ہوگا اس میں، ہم انہیں حصہ دار بنالیں گے۔ سب نے کہا ہمیں یہ منظور ہے"۔

اس سے یہ واضح ہو گیا کہ اگر زمین اور اس میں لگایا ہوا باغ ایک شخص کا ہو اور محنت اور مشقت دوسرا شخص کرے اور پھل میں دونوں حصہ دار ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ مزارعت کی بھی بعینہٖ یہی صورت ہے۔

۳۔ امام بخاری نے حضرت امام ابوجعفر محمد باقر کا یہ قول نقل کیا ہے:

1۔ صحیح بخاری، باب اذا قال رب الارض اقرک ما اقرک اللہ، جلد 1، صفحہ 315

2۔ صحیح بخاری، باب اذا قال رب الارض اقرک ما اقرک اللہ، جلد 1، صفحہ 312

Marfat.com

عَنْ اَبِیْ جَعْفَرَ قَالَ: مَا بِالْمَدِیْنَةِ اَهْلُ بَیْتِ هِجْرَةٍ اِلَّا یَزْرَعُوْنَ عَلَی الثُّلُثِ وَالرُّبُعِ۔ (1)

"امام باقر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مدینہ طیبہ میں کوئی مہاجر گھرانہ ایسا نہیں، جو تہائی اور چوتھائی پر کاشت کاری نہ کرتے ہوں"۔

۴۔ صحابہ کرام میں سے جو جلیل القدر صحابہ مزارعت پر زمینیں دیا کرتے تھے ان کے اسمائے گرامی پر بھی ایک نظر ڈالیے۔

قَالَ ابْنُ حَزْمٍ وَ مِمَّنْ اَجَازَ، اِعْطَاءَ الْاَرْضِ بِجُزْءٍ مُسَمًّی مِمَّا یَخْرُجُ مِنْهَا اَبُوْبَکْرٍ وَّ عُمَرُ وَ عُثْمَانُ وَ عَلِیٌّ وَّ ابْنُ عُمَرَ وَ سَعْدٌ وَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ وَ خَبَّابٌ وَ حُذَیْفَةُ وُ مَعَاذٌ رضی اللّٰہ تعالٰی عنھم۔ (2)

"ابن حزم فرماتے ہیں کہ وہ حضرات جو بٹائی پر انہیں زمینیں دیا کرتے تھے۔ ان میں سے بعض کے اسمائے گرامی یہ ہیں: ابوبکر، عمر، عثمان، علی، ابن عمر، سعد، ابن مسعود، جناب حذیفہ اور معاذ، رضی اللہ تعالیٰ عنہم"۔

اس فہرست میں دیگر جلیل القدر صحابہ کے علاوہ خلفائے راشدین کے اسمائے گرامی سر فہرست ہیں۔ اسلام میں ان حضرات کا جو مقام ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ پھر ان حضرات نے عملی طور پر احکام شرعیہ کو اسلامی مملکت کے گوشہ گوشہ میں نافذ کیا۔ ان احکام کا جتنا علم ان حضرات کو ہے اور کسی کو نہیں ہوسکتا۔ امام بخاری کا یہ جملہ بھی پیش نظر رہے:

وَزَارَعَ عَلِیٌّ وَ سَعْدُ بْنُ مَالِکٍ وَ عَبْدُاللّٰہِ بْنُ مَسْعُوْدٍ وَّ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِیْزِ وَ الْقَاسِمُ وَ عُرْوَةُ بْنُ زُبَیْرٍ وَآلُ اَبِیْ بَکْرٍ وَآلُ عُمَرَ وَ آلُ عَلِیٍّ وَّ ابْنُ سِیْرِیْنَ۔ (3)

1۔ صحیح بخاری، باب المزارعۃ بالشطر، جلد 1، صفحہ 313
2۔ عمدۃ القاری، جلد 10، صفحہ 166، مطبعۃ مصطفیٰ البابی مکہ مکرمہ
3۔ صحیح بخاری، باب المزارعۃ بالشطر، جلد 1، صفحہ 313

Marfat.com

''یعنی حضرات سیدنا علی، سعد بن مالک، عبداللہ بن مسعود، عمر بن عبدالعزیز، قاسم، عروہ، صدیق اکبر کا سارا خاندان، فاروقِ اعظم کا سارا خاندان، علی المرتضیٰ کا سارا خاندان اور ابن سیرین مزارعت پر اپنی اراضی دیا کرتے تھے''۔

امام بخاری نے اگرچہ اس تعلیق کی سند بیان نہیں کی، لیکن ابن ابی شیبہ اور دیگر محدثین نے ان تعلیقات کو موصولاً بیان کیا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو عینی جلد ۱۰ ص ۱۶۷

جس حدیث میں یہ الفاظ ہیں کہ انسان اپنی زمین خود کاشت کرے ورنہ اپنے بھائی کو مفت کاشت کے لیے دے دے۔ یہ حکم وجوبی نہیں، بلکہ استحباب کے لیے ہے کہ اگر کوئی ایسا کرے تو اچھا ہے۔ یہ حکم اگر وجوب کے لیے ہوتا تو وہ صحابہ کرام جن اسمائے گرامی اوپر لکھے گئے ہیں، وہ اپنی زمینیں ہرگز بٹائی پر نہ دیتے۔ نیز اس حدیث کی وضاحت ایک دوسری حدیث سے ہوتی ہے:

قَالَ عَمْرٌو قُلْتُ لِطَاؤُوسَ لَوْ تَرَكْتَ الْمُخَابَرَةَ فَإِنَّهُمْ يَزْعُمُوْنَ اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللّٰہ تعالٰی علیه وسلم نَهٰى عَنْهُ قَالَ اَیْ عَمْرٌو فَاِنِّیْ اُعْطِيْهِمْ وَ اُعِيْنُهُمْ وَ اِنَّ اَعْلَمَهُمْ اَخْبَرَنِیْ يَعْنِی ابْنَ عَبَّاسٍ رَّضِیَ اللّٰہ عنهما اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللّٰہ تعالٰی علیه وسلم لَمْ يَنْهَ عَنْهُ وَ لٰكِنْ قَالَ اَنْ يَّمْنَحَ اَحَدُكُمْ اَخَاهُ خَيْرٌ لَّهٗ مِنْ اَنْ يَّاْخُذَ عَلَيْهِ خَرْجًا مَّعْلُوْمًا۔(1)

''عمرو بن دینار کہتے ہیں کہ میں نے طاؤس کو کہا کہ اگر تم مخابرت ترک کردیتے تو کتنا اچھا ہوتا، کیونکہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس سے روکا ہے۔ طاؤس نے کہا: اے عمرو! میں اپنے مزارعین کو بیج وغیرہ دیتا ہوں اور زراعت کے کام میں ان کی اعانت کرتا ہوں اور ان لوگوں سے ایک بڑے عالم یعنی ابن عباس نے مجھے بتایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مزارعت سے منع نہیں فرمایا، بلکہ یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کو بطورِ عطیہ زمین دے دے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ اس سے کوئی معاوضہ لے''۔

1۔ صحیح بخاری، باب المزارعۃ بالشطر، جلد 1، صفحہ 313

اس تفصیل سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ اس قسم کی مزارعت جس میں شرائط پائی جاتی ہوں جو باہمی نزاع، جنگ و جدل اور فریب دہی کا سامان بنتی ہوں، ایسی مزارعت ممنوع ہے اور جس میں شروطِ فاسدہ نہ ہوں وہ جائز ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے یہودِ خیبر کو بٹائی پر زمین دی۔ خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ بٹائی پر زمینیں دیتے تھے۔ اس لیے مزارعت کو حرام قرار دینا قطعاً درست نہیں۔

آخر میں ہم فاضل مضمون نگار کی اس دلیل کا جائزہ لیتے ہیں، جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب عراق فتح کیا تو ان زرعی زمینوں کو مجاہدین کے درمیان تقسیم نہیں کیا، بلکہ انہیں اپنے پہلے مالکوں کے پاس ہی رہنے دیا۔ بے شک یہ درست ہے، لیکن آپ کے اس فیصلہ کا مزارعت کے جواز اور حرمت کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں۔ آپ کا مقصد یہ تھا کہ اگر یہ زمینیں مجاہدین میں تقسیم کر دی گئیں تو ان سے صرف عشر وصول کیا جا سکے گا، جس کی مقدار مقرر ہے اور جس کے مصارف متعین ہیں اور اس صورت میں بیت المال کی آمدنی کم ہو جائے گی اور عام مسلمانوں کی بہبود اور فلاحی اسلامی مملکت کے لیے جتنا سرمایہ درکار ہے، وہ مہیا نہ ہو سکے گا اور اگر زمینیں انہی لوگوں کے پاس رہنے دی جائیں تو ان سے خراج وصول ہوگا، جس کی مقدار بھی کافی ہوگی اور جسے خرچ کرنے کے لیے میدان بھی وسیع ہوگا۔ چنانچہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے موقف کی توضیح کرتے ہوئے بارہا اس امر کی صراحت کی۔ اس لیے اس فیصلہ کا مزارعت کے جواز اور عدمِ جواز کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں اور اگر آپ مزارعت کو ناجائز سمجھتے تو خود اپنی زمینیں مزارعت پر کیوں دیتے اور صحابہ کرام اس طریقہ کار کو کیوں اختیار کرتے؟ صحابہ کرام کی سیرت قول و عمل کے تضاد سے یکسر منزہ اور پاک ہے۔ وہ جس چیز کو ناجائز کہتے تھے اس کے نزدیک بھی نہیں پھٹکتے تھے۔ فقط وہی کام کرتے تھے جن کے جواز اور حلت پر ان کا ایمان ہوتا۔

حضرت امام ابوحنیفہ کے متعلق بھی یہ خیال کرنا کہ آپ بھی پٹہ پر زمین دینے کو ناجائز سمجھتے تھے، درست نہیں۔ آپ پٹہ پر اراضی دینے کو جائز سمجھتے ہیں۔ بٹائی کے متعلق عدم

Marfat.com

جواز کا جو قول آپ سے مروی ہے، اس کی وجہ فقہاء نے یہ لکھی ہے کہ اس طرح منفعت مجہولہ پر مزارعت طے پاتی ہے جو آپ کے نزدیک جائز نہیں۔

قَالَ الشَّافِعِیُّ وَ اَبُوْ حَنِیْفَہَ وَالْعِتْرَۃُ وَ کَثِیْرُوْنَ اَنَّہٗ یَجُوْزُ کِرَاءُ الْاَرْضِ بِکُلِّ مَا یَجُوْزُ اَنْ یَکُوْنَ ثَمَنًا فِی الْمَبِیْعَاتِ مِنَ الذَّھَبِ وَالْفِضَّۃِ۔ (1)

''یعنی امام شافعی، ابو حنیفہ، ائمہ اہل بیت اور دوسرے کثیر التعداد علماء زمین کو سونے اور چاندی یعنی درہم و دینار کے عوض پٹہ پر دینا جائز سمجھتے ہیں''۔

بھارت کا قانون نہ ہمارے لیے حجت ہے اور نہ سند اور نہ ہم اس کی پیروی کے مکلّف ہیں۔

1۔ نیل الاوطار، جلد 6، جلد 10

Marfat.com

اسلام میں اجتہاد
کی
اہمیت اور ضرورت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ہمارا یہ ایمان ہے کہ سرور عالم محمد مصطفیٰ ﷺ خاتم النبیین ہیں اور حضور پر جو کتاب نازل ہوئی یہ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد نہ کسی نبی کی آمد کا امکان ہے اور نہ اس کتاب کے بعد کوئی اور آسمانی کتاب نازل ہو گی۔ تمام بنی نوع انسان کے لیے قیامت تک یہی کتاب صحیفۂ رشد و ہدایت ہے اور اس نبی مکرم کا لایا ہوا دین، وہ روشن چراغ ہے جو اپنی شعاعوں سے تاابد زندگی کی شاہراہ کو منور کرتا رہے گا۔

اسی طرح یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ زندگی ایک دریا کی طرح رواں دواں ہے۔ ایک لمحہ کے لیے بھی اس میں ٹھہراؤ ممکن نہیں۔ ہر زمانہ کے اپنے مخصوص مسائل ہوتے ہیں اور ہر معاشرہ کے اپنے الگ تقاضے ہیں۔ کوئی نظریۂ حیات اگر ان مسائل کا مثبت جواب نہیں دیتا اور ان تقاضوں کو پورا نہیں کرتا تو وہ زندگی کے کارواں سے بچھڑ جاتا ہے اور کچھ عرصہ بعد اسے یکسر فراموش کر دیا جاتا ہے یا ماضی کے عجائب گھر میں اسے کوئی جگہ دے دی جاتی ہے۔

بعض لوگوں کے دلوں میں اس خیال کا پیدا ہونا بعید از امکان نہیں کہ وہ کتاب جسے نازل ہوئے چودہ صدیاں بیت چکی ہیں، کیا اس کا لایا ہوا نظامِ حیات آج ان بدلے ہوئے حالات میں انسانی معاشرہ کی رہنمائی کا فریضہ ادا کر سکتا ہے؟ کیا اس کی تعلیمات میں یہ دم خم ہے کہ اس ترقی یافتہ دور میں نوع انسانی کو خوشحالی اور فلاح کی منزل تک پہنچا سکے؟ یہ تسلیم کہ ایک زمانہ میں اس کتاب کی برکت سے اس کے ماننے والے اور اس پر عمل کرنے والے زمین کی پشتوں سے اٹھے اور عرش کی بلندیوں پر آشیاں بند ہو گئے۔ اس نورِ مبین نے ان کو انفرادی اور اجتماعی بد اخلاقی کی ظلمتوں سے نکالا اور ہدایت کی وادئ ایمن تک پہنچایا جس کا ہر ہر گوشہ انوارِ الٰہی سے جگمگا رہا تھا، لیکن ان بدلتے ہوئے حالات میں کیا اب بھی وہ کتاب اپنا دیرینہ کردار انجام دے سکتی ہے؟ عالم انسانی کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو ساحل آشنا

Marfat.com

کرنے کی ہمت رکھتی ہے؟ ہمارے نزدیک اس کا قطعی جواب یہ ہے، جس میں ہمیں ادنیٰ سا تردد بھی نہیں، کہ بیشک یہ کتاب آج بھی یہ معجزہ دکھا سکتی ہے۔ پہلے کی طرح قعر مذلت میں گرے ہوئے افراد اور قومیں اس کا دامن پکڑنے سے ہمدوش ثریا بن سکتے ہیں۔

یہ جواب محض عقیدت کی بنا پر نہیں، بلکہ حقائق اس کی تائید کرتے ہیں۔ اگر اس دین میں عصر حاضر کے چیلنج کو قبول کرنے کی ہمت نہ ہوتی، اگر اس نبی مکرم ﷺ کی تعلیمات ایک مخصوص زمانہ تک ہی لوگوں کو راہِ ہدایت پر گامزن کر سکتیں، تو اللہ تعالیٰ نبوت کے دروازے کو بند نہ کرتا۔ نئے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کسی نئے نبی کو مبعوث کرتا تاکہ نوع انسانی وحی کی روشن تعلیمات اور برکات سے محروم نہ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کریم ﷺ پر سلسلۂ نبوت کا اس لیے اختتام کیا کہ اس آفتابِ عالم تاب کے طلوع ہونے کے بعد اب کسی چراغ کی ضرورت نہیں۔ اس مہر نیمروز کی تابشیں ہر زمانہ کے لیل و نہار کو منور اور روشن کرتی رہیں گی۔

قرآن کریم میں جو اوامر و نواہی مذکور ہیں ان میں غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کائنات کی ہر چیز کا خالق بھی ہے اور مالک بھی، اس کے ان احکام میں کسی آمر کی مطلق العنانی کی بو تک نہیں۔ جب ہم ان احکامات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ان کے آئینہ میں اللہ تعالیٰ کی صفات، ''العلیم'' اور ''الحکیم'' کے جلوے منعکس نظر آتے ہیں۔ جہاں کوئی امر فرمایا ہے وہاں ان برکات و سعادات کا بھی ذکر کر دیا ہے جو اس امر کی بجا آوری سے انسان کو مرحمت کی جاتی ہیں اور جہاں کسی کام سے روکا گیا ہے وہاں ان مفاسد اور مضرات کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے جو ان منہیات کے ارتکاب پر مرتب ہوتے ہیں۔ ایک دو مثالیں سماعت فرمائیے۔

اقامت صلوٰۃ کا حکم جس کثرت اور شدت سے دیا گیا ہے وہ محتاج بیان نہیں، لیکن اس کی حکمت بھی بیان فرما دی۔ ارشاد ہے:

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنۡهٰى عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡكَرِ (العنکبوت۔ ۴۵)

Marfat.com

یعنی تمہیں اقامت صلوٰۃ کا بار بار حکم اس لیے دیا جا رہا ہے کہ نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔ خود ہی سوچیے۔ وہ انسان کتنا خوش بخت اور معاشرہ کے تمام طبقات میں محترم اور معزز ہوگا جس کی زندگی کا دامن فواحش اور منکرات سے منزہ ہو اور وہ انسان جو فواحش و منکرات کے ارتکاب سے باز نہیں آتا، جاہ و منصب کے اعتبار سے وہ کتنا ہی بلند و بالا ہو، کسی شریف انسان کے دل میں اس کے لیے عزت و تکریم کا جذبہ نہیں پایا جاتا۔ یوں نماز کا حکم بھی دیا اور اس کی حکمت بھی بتا دی۔

شراب نوشی اور قمار بازی عرب کے جاہل معاشرہ میں امارت کی نشانیاں سمجھی جاتی تھیں۔ عرب کی نوے فیصد آبادی ان دونوں چیزوں کی خوگر تھی۔ قرآن کریم نے محض ایک آرڈیننس کے ذریعہ ان کی حرمت بیان نہیں کی، بلکہ اس کی وجہ بھی شرح و بسط کے ساتھ ذکر فرما دی۔ ارشاد ہے:

اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ وَ یَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾

"یعنی شیطان چاہتا ہے کہ مے نوشی اور قمار بازی کے ذریعے تمہارے درمیان دشمنی اور بغض کی آگ بھڑکا دے۔ نیز تمہیں اللہ تعالیٰ کے ذکر اور نماز سے باز رکھے۔ کیا ایسی مہلک اور تباہ کن چیزوں سے تم باز نہیں آؤ گے"؟ (المائدہ)

یعنی تمہیں شراب نوشی اور قمار بازی سے اس لیے نہیں روکا جا رہا کہ تمہیں زندگی کے عیش و نشاط سے محروم کر دیا جائے، بلکہ اس پر مرتب ہونے والے اثرات بے حد مہلک ہیں ان سے تمہیں بچانا مقصود ہے۔

قرآن و سنت میں اوامر و نواہی کا جہاں بھی ذکر آیا ہے وہاں ان کی حکمتیں بھی بیان کر دی گئی ہیں۔ کبھی صراحۃً، کبھی کنایۃً۔ اس سے دو فائدے بیک وقت حاصل ہو رہے ہیں۔ پہلا یہ کہ اوامر و نواہی کے سلسلہ میں انسانی ذہن اور ضمیر کو مطمئن کر دیا جائے کہ ان احکام کے بجا لانے میں خود ان کا اپنا فائدہ ہے۔ اس لیے اگر اس سلسلہ میں انہیں کچھ تکلیف

Marfat.com

برداشت کرنا پڑے یا ضبط جذبات سے کام لینا پڑے تو لوگ اس کو بخوشی گوارا کر لیں، اس میں بوجھ اور اکتاہٹ محسوس نہ کریں۔ دوسرا فائدہ جو اہمیت اور افادیت کے لحاظ سے بہت بڑا فائدہ ہے، یہ ہے کہ جہاں بھی یہ مصلحتیں پائی جائیں، اگرچہ ان کے بارے میں صراحۃً کوئی نص نہ ہو، تو بھی ایسے مفید اور نیک افعال کا ارتکاب اور ایسے مضر اور برے اعمال سے اجتناب ضروری ہے۔ اسلامی تعلیمات کا یہی وہ پہلو ہے جس کے باعث اسلام کو نوعِ انسانی کا ابدی دین بنا دیا گیا ہے اور اس کی ہدایت کی روشنی میں کاروانِ انسانیت قیام قیامت تک اپنی رفیع منزل کی طرف رواں دواں رہے گا۔

احکامِ الٰہی کے ساتھ ساتھ حکمتوں اور مصلحتوں کے بیان نے اجتہاد کا دروازہ کھول دیا ہے اور ہر عہد کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی راہ ہموار کر دی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ قرآن وسنت میں کثیر التعداد ایسے اشارات موجود ہیں جن سے نئے مسائل کا حل دریافت کرنے کے لیے اجتہاد کی تاکید کی گئی ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا والی مقرر فرمایا اور جب وہ اپنے عہد کی ذمہ داریاں انجام دینے کے لیے روانہ ہونے لگے تو رحمت عالم ﷺ نے ان سے پوچھا کہ اے معاذ! اگر تمہارے سامنے کوئی مقدمہ پیش ہو تو تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ انہوں نے عرض کیا کہ کتاب اللہ کے مطابق۔

فرمایا: اگر اس کا صحیح جواب کتاب اللہ میں نہ ملے تو پھر!

عرض کی: سنت نبوی ﷺ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔

فرمایا: اگر سنت میں بھی اس کا صحیح جواب نہ ملے تو پھر کیا کرو گے؟

انہوں نے عرض کی: اَجْتَهِدُ رَأْيِیْ وَلَا آلُوْ۔ میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کروں گا۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ سن کر رسول مکرم ﷺ نے میرے سینہ پر ہاتھ پھیرا اور فرط مسرت سے فرمایا:

اَلحمدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ وَفَّقَ رَسُوْلَ رَسُوْلِ اللّٰہِ لِمَا یَرْضٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ (1) کہ اس اللہ تعالیٰ کی تعریف کرتا ہوں جس نے اپنے رسول کے پیغامبر کو ایسی چیز کی توفیق بخشی جس کو اللہ تعالیٰ کا رسول پسند کرتا ہے۔

اسی طرح حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے قاضی شریح کی طرف ایک گرامی نامہ بھیجا جس میں مقدمات کے فیصلہ کرنے کے اصول ان کی طرف تحریر فرمائے۔ آپ نے لکھا:

اِقْضِ بِمَا اسْتَبَانَ لَکَ مِنْ کِتَابِ اللّٰہِ. فَاِنْ لَمْ تَعْلَمْ کُلَّ کِتَابِ اللّٰہِ فَاقْضِ بِمَا اسْتَبَانَ لَکَ مِنْ قَضَاءِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم. فَاِنْ لَمْ تَعْلَمْ کُلَّ اَقْضِیَۃِ رَسُوْلِ اللّٰہِ فَاقْضِ بِمَا اسْتَبَانَ لَکَ عَنِ الْاَئِمَّۃِ الْمُجْتَھِدِیْنَ. فَاِنْ لَمْ تَعْلَمْ کُلَّ مَا قَضَتْ بِہِ الْاَئِمَّۃُ الْمُجْتَھِدُوْنَ فَاجْتَھِدْ رَاْیَکَ وَاسْتَشِرْ اَھْلَ الْعِلْمِ وَالصَّلَاحِ.

یعنی جب کوئی مقدمہ تمہارے سامنے پیش ہو تو کتاب اللہ کے مطابق اس کا فیصلہ کرو۔ اگر تم کتاب اللہ سے معلوم نہ کر سکو تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فیصلہ کے مطابق فیصلہ کرو اور اگر تمہیں اس بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فیصلہ کا علم نہ ہو تو ائمہ مجتہدین کے فیصلہ کے مطابق فیصلہ کرو اور اگر ائمہ مجتہدین سے بھی پتہ نہ چلے تو اپنی رائے سے اجتہاد کرو اور اہل علم و صلاح سے مشورہ کرو۔

اس طرح کی کثیر التعداد آیات، احادیث اور آثار خلفائے راشدین موجود ہیں جن سے اجتہاد کے جواز کا ہی پتہ نہیں چلتا بلکہ اجتہاد کرنے کی تاکید معلوم ہوتی ہے۔

پاکستان کے مطالبہ کا مقصد ہی یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسا خطۂ زمین مل جائے جہاں ہم آزادی سے اپنے نظام حیات کو اس کے تمام پہلوؤں سمیت اسلام کے قالب میں ڈھال دیں اور اس میں شک کی قطعاً گنجائش نہیں کہ بیسویں صدی میں قومی زندگی کے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی پہلوؤں میں ایسے نئے نئے مسائل رونما ہو گئے ہیں جو پہلے زمانوں

1۔ سنن ابوداؤد، باب اجتہاد الرائی فی القضاء، جلد 2، صفحہ 505، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی

Marfat.com

میں موجود نہ تھے۔ جن کے بارے میں قرآن وسنت میں ہمیں صراحۃً کوئی حکم نہیں ملتا اور وہ مسائل اتنے اہم اور ناگزیر ہیں کہ ان سے پہلوتہی بھی نہیں کی جاسکتی۔ نہ ہمارے لیے یہ ممکن ہے کہ ہم ان کو یکسر نظر انداز کر دیں اور نہ ہم ان کو موجودہ نئے نظاموں کی روشنی میں حل کر سکتے ہیں۔ ورنہ ہماری اجتماعی زندگی چوں چوں کا مربہ بن جائے گی۔ زندگی کے کچھ مسائل تو ہم اسلام کی روشنی میں حل کریں اور جدید مسائل کو حل کرنے کے لیے مشرق ومغرب کے جدید نظام ہائے حیات سے مدد لیں۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو اس دوغلی پالیسی کی اجازت نہیں دیتا۔ ہمارے لیے صرف یہی طریقہ کار ممکن ہے کہ کتاب وسنت میں جو واضح احکام، جو ارشادات اور جو ہدایات موجود ہیں، ان کی روشنی میں ہم ان مسائل کا حل تلاش کریں۔ فقط اسی صورت میں ہم اپنی ساری زندگی کو اسلامی رنگ میں رنگ سکتے ہیں۔ اس لیے اہل علم و دانش کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اجتہاد سے کام لیتے ہوئے اپنے مسائل کا اسلامی حل تلاش کریں۔

علومِ اسلامیہ میں اصول فقہ کو ایک منفرد حیثیت حاصل ہے۔ علماء نے اس فن میں جہاں ان قواعد وضوابط پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں، جن سے احکام شریعت کا استنباط کیا جاتا ہے، وہاں انہوں نے اجتہاد کے موضوع کو اپنی خصوصی توجہ کا مستحق سمجھا ہے اور بڑی تفصیل سے اس کے بارے میں اظہارِ خیال فرمایا ہے۔ انہی مباحث کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں، تاکہ ان اصول وضوابط پر آپ آگاہ ہو جائیں، جن کی پابندی ایک مجتہد کے لیے ضروری ہے تاکہ آپ قرآن وسنت کے اتباع میں اور ہوائے نفس کی پیروی میں واضح فرق محسوس کریں اور ہوائے نفس کے اتباع سے احتراز کرتے ہوئے قرآن وسنت کی پیروی اختیار کریں۔ یہاں بڑے اختصار کے ساتھ تین چیزیں بیان کی جائیں گی۔

۱۔ اجتہاد کسے کہتے ہیں؟

۲۔ مجتہد کے منصب پر کون فائز ہو سکتا ہے؟ اس کے لیے کن کن شرائط کا پایا جانا ضروری ہے؟

۳۔ کون سے مسائل ہیں جن میں اجتہاد کی اجازت ہے؟

Marfat.com

یہ بحث بے شک بہت پیچیدہ بھی ہے اور خشک بھی۔ اس میں تفنن طبع کا بھی کوئی سامان نہیں۔ شاید بہت سے لوگوں کے لیے اس کا تذکرہ بار خاطر ہو، لیکن ان مباحث کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر اس کے بیان سے مفر نہیں۔ امید ہے آپ حضرات صبر، توجہ اور ضبط سے ان معروضات کو سننے کی زحمت گوارا فرمائیں گے۔

علمائے اصول نے اجتہاد کی جو تعریفات کی ہیں ان کے الفاظ میں معمولی تفاوت ضرور ہے، لیکن مقصد اور مآل کے نقطۂ نظر سے ان میں کوئی فرق نہیں۔ میں یہاں ان متعدد تعریفات میں سے علامہ ابوالحسن علی الآمری کی تعریف کرنے پر اکتفا کروں گا۔

اَلاِجْتِهَادُ: فَهُوَ فِی اللُّغَةِ عِبَارَةٌ عَنِ اسْتِفْرَاغِ الْوُسْعِ فِیْ تَحْقِیْقِ اَمْرٍ مِّنَ الْاُمُوْرِ مُسْتَلْزِمٍ لِلْكُلْفَةِ وَالْمَشَقَّةِ وَ لِهٰذَا یُقَالُ اجْتَهَدَ فُلَانٌ فِیْ حَمْلِ حَجَرِ الْبَزَّارَةِ وَلَا یُقَالُ اجْتَهَدَ فِیْ حَمْلِ خَرْدَلَةٍ۔ (1)

ترجمہ: لغت میں اجتہاد کا مفہوم یہ ہے کہ کسی کام کے کرنے میں اپنی امکانی طاقت کو صرف کر دینا اور اس میں کلفت اور مشقت برداشت کرنا۔ اہل عرب یوں تو کہتے ہیں کہ اجْتَهَدَ فُلَانٌ فِیْ حَمْلِ حَجَرٍ کہ فلاں شخص نے بھاری پتھر اٹھانے میں کوشش کی، لیکن یہ کوئی نہیں کہتا کہ اجْتَهَدَ فُلَانٌ فِیْ حَمْلِ خَرْدَلَةٍ کہ رائی کے دانے کے اٹھانے میں فلاں نے کوشش کی۔

گویا اہل لغت اجتہاد کا لفظ اس موقع پر استعمال کرتے ہیں جب کسی کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کوشش کی جائے اور اس کوشش میں دقت اور مشقت بھی ہو۔ اجتہاد کا لغوی معنی ذہن نشین کرنے کے بعد اب علمائے اصول کے نزدیک اس کی جو تعریف ہے وہ سماعت فرمائیے۔

وَفِی الْاِصْطِلَاحِ، اِسْتِفْرَاغُ الْوُسْعِ فِیْ طَلَبِ الظَّنِّ بِشَیْءٍ مِّنَ الْاَحْكَامِ الشَّرْعِیَّةِ عَلٰی وَجْهٍ یُّحَسُّ مِنَ النَّفْسِ الْعِجْزُ عَنِ الْمَزِیْدِ فِیْهِ۔ (2)

1۔ الاحکام فی اصول الاحکام، جلد 4، صفحہ 141 2۔ الاحکام فی اصول الاحکام للآمدی، جلد 4، صفحہ 141

Marfat.com

یعنی فقہاء کی اصطلاح میں اجتہاد کا مفہوم یہ ہے کہ احکامِ شرعیہ میں سے کسی حکم کے بارے میں غلبۂ ظن حاصل کرنے کے لیے اپنی کوشش کی انتہا کر دینا، اس طرح کہ نفس اس سے زیادہ کوشش کرنے سے عاجز ہو۔

اجتہاد کی تعریف پوری طرح سمجھ لینے کے بعد اب یہ دیکھنا ہے کہ اجتہاد کے منصب کا اہل کون ہے؟ کیا ہر شخص کو اجازت ہے کہ وہ اپنے زعم و گمان کے مطابق اجتہاد کرتا رہے اور احکام شرعیہ کے بارے میں فتوے صادر کرتا رہے۔ اگر شریعت اسلامیہ میں اجتہاد کرنے کی یوں کھلی چھٹی ہوتی تو شریعت اسلامیہ کبھی کی اپنی افادیت کھو دیتی اور بچوں کا کھیل بن کر رہ جاتی۔ اس لیے علمائے اصول نے مجتہد کے بارے میں بڑی شرح و بسط سے بحث کی ہے جس کے مطالعہ کے بعد مجتہد کے منصب کی اہمیت اور اس منصب جلیلہ پر فائز ہونے کی اہلیت کے بارے میں شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

علامہ ابو اسحاق شاطبی نے اپنی مشہور کتاب الموافقات میں مجتہد کی جو تعریف کی ہے وہ مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی جامع بھی ہے۔ فرماتے ہیں:

اِنَّمَا تَحۡصُلُ دَرَجَةُ الاِجۡتِهَادِ لِمَنِ اتَّصَفَ بِوَصۡفَيۡنِ. اَحَدُهُمَا فَهۡمُ مَقَاصِدِ الشَّرِيۡعَةِ عَلٰى كَمَا لِهَا. وَ الثَّانِى التَّمَكُّنُ مِنَ الۡاِسۡتِنۡبَاطِ بِنَاءً عَلٰى فَهۡمِهٖ فِيۡهَا. (1)

یعنی اجتہاد کا درجہ اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جو ان دو وصفوں سے متصف ہو:

۱۔ شریعت کے مقاصد کو مکمل طور پر سمجھتا ہو۔

۲۔ مقاصد شریعت کے سمجھنے کے ساتھ ساتھ اس میں استنباط احکام کا بھی پورا پورا ملکہ ہو۔

علامہ شوکانی نے مجتہد کی جو تعریف کی ہے وہ بڑی واضح ہے۔ اس کے سمجھنے کے بعد مجتہد کے مقام کو سمجھنے میں کوئی التباس باقی نہیں رہتا۔ وہ لکھتے ہیں:

---

1 الموافقات، جلد 4، صفحہ 06-105، المطبعۃ الرحمانیہ مصر

Marfat.com

اَلْمُجْتَهِدُ: هُوَ الْفَقِيْهُ الْمُسْتَفْرِغُ لِوُسْعِهِ لِتَحْصِيْلِ ظَنٍّ بِحُكْمٍ شَرْعِيٍّ وَلَا بُدَّانَ يَكُوْنَ بَالِغًا عَاقِلًا قَدْ ثَبَتَتْ لَهُ مَلَكَةٌ يَقْتَدِرُ بِهَا عَلَى اسْتِخْرَاجِ الْاَحْكَامِ مِنْ مَآخَذِهَا۔ (1)

یعنی ''مجتہد وہ فقیہ ہے جو کسی حکم شرعی کو جاننے کے لیے اپنی ساری قوت خرچ کر دے۔ اس کا عاقل اور بالغ ہونا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں ایسے ملکہ اور استعداد کا پایا جانا بھی ناگزیر ہے جس کی وجہ سے وہ قوانین اسلامی کے ماخذوں سے احکام کا استخراج کر سکے''۔

کسی فقیہہ میں یہ استعداد کب پیدا ہوتی ہے اور استخراج احکام کا ملکہ اسے کب میسر آتا ہے؟ اس کے لیے علمائے اصول نے پانچ شرائط رقم کی ہیں:

۱۔ اَنْ يَكُوْنَ عَالِمًا بِنُصُوْصِ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ فَاِنْ قَصَرَ فِيْ اَحَدِهِمَا لَمْ يَكُنْ مُجْتَهِدًا وَّلَا يَجُوْزُ لَهُ الْاِجْتِهَادُ۔ (2)

یعنی وہ کتاب اور سنت کے نصوص کا عالم ہو۔ اگر ان دو میں سے کسی میں اس کا علم ناقص ہو تو وہ مجتہد نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اجتہاد کرے۔

لیکن کیا تمام آیاتِ قرآنی اور تمام سنن نبوی کا جاننا مجتہد کے لیے شرط اول ہے۔ اس کے بارے میں علمائے اصول نے تصریح کی ہے کہ کم از کم ان آیات کا علم ضروری ہے جن کا تعلق احکام سے ہے اور علماء کی تحقیق کے مطابق ان کی تعداد پانچ صد ہے۔ اسی طرح احادیث سے مراد بھی وہی احادیث ہیں جن کا تعلق احکامِ شرعیہ سے ہے۔ اہل علم کے نزدیک ان کی تعداد بارہ سو ہے۔

قَالَ اَحْمَدُ رَحِمَهُ اللّٰهُ. الْاُصُوْلُ الَّتِیْ يَدُوْرُ عَلَيْهَا الْعِلْمُ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللّٰہ تعالٰی علیه وسلم يَنْبَغِیْ اَنْ تَكُوْنَ اَلْفًا وَّ مائتين۔ (3)

1۔ ارشاد الفحول، جلد 2، صفحہ 292، دار الکتب العلمیہ بیروت

2۔ ایضاً، صفحہ 293، دار الکتب العلمیہ بیروت　2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 94-293

امام احمد فرماتے ہیں کہ وہ اصول، جن پر اس علم کا دارومدار ہے جو بارگاہِ نبوی سے مستفاد ہوتے ہیں، ان کی تعداد بارہ سو ہے۔

عقل سلیم بھی اس کو تسلیم کرتی ہے کہ اجتہاد کرنے کا حق صرف اس شخص کے لیے تسلیم کیا جائے جو قرآن وسنت میں ماہرانہ دسترس رکھتا ہو، کیونکہ یہی وہ دو چشمے ہیں جن سے احکام شرعیہ کا استنباط کیا جاتا ہے۔ جس شخص کو ان دونوں یا ان میں سے کسی ایک میں ماہرانہ دسترس نہ ہو، اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اجتہاد کی مسند پر متمکن ہونے کا خواب دیکھ سکے۔

۲۔ اَنْ یَّکُوْنَ عَارِفًا بِمَسَائِلِ الْاِجْمَاعِ حَتّٰی لَا یُفْتِیَ بِخِلَافِ مَا وَقَعَ الْاِجْمَاعُ عَلَیْہِ۔ (1)

مجتہد بننے کے لیے دوسری شرط یہ ہے کہ کتاب وسنت کے علاوہ وہ ان مسائل سے بھی باخبر ہو جن پر علماء کا اجماع ہو چکا ہے تاکہ وہ ایسا فتویٰ نہ دے جو اس مسئلہ کے خلاف ہو جس پر پہلے اجماع متحقق ہو چکا ہے۔

۳۔ اَنْ یَّکُوْنَ عَالِمًا بِلِسَانِ الْعَرَبِ بِحَیْثُ یُمْکِنُہٗ تَفْسِیْرُ مَا وَرَدَ فِی الْکِتَابِ وَالسُّنَّۃِ مِنَ الْغَرِیْبِ وَنَحْوِہٖ۔ (2)

تیسری شرط یہ ہے کہ عربی زبان کا عالم ہو، تاکہ جو مشکل اور غریب الفاظ قرآن کریم اور سنت نبویہ میں استعمال ہوتے ہیں، ان کی تشریح کر سکے۔

۴۔ صرف ونحو، معانی اور بیان میں بھی مہارت رکھتا ہو، تاکہ جملوں کی ترکیب کر سکے اور عبارت میں دیگر لطائف وبلاغت، جو پنہاں ہیں، ان پر آگاہی حاصل کر سکے۔ (3)

۵۔ ان یّکُوْنَ عَارِفًا بِالنَّاسِخِ وَالْمَنْسُوْخِ۔ (4)

یعنی وہ آیات اور احادیث میں سے ناسخ اور منسوخ کو جانتا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ عدم واقفیت کی وجہ سے وہ ناسخ کے ہوتے ہوئے منسوخ پر عمل پیرا رہے۔

1۔ ارشاد الفحول، جلد 2، صفحہ 295، دار الکتب العلمیہ بیروت 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 295
3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 296 4۔ ایضاً

Marfat.com

امام علاؤ الدین البخاری نے کشف الاسرار میں، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے المستصفی میں، مجتہد کی شرائط کو بڑی شرح وبسط کے ساتھ قلمبند کیا ہے اور ان علوم کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جن میں کسی مجتہد کا ماہر ہونا ضروری ہے۔

غزالی اس بحث کے اختتام پر فرماتے ہیں:

وَ مُعظَمُ ذٰلِکَ یَشتَمِلُ عَلَیهِ ثَلاثَۃُ فُنُونٍ۔ عِلمُ الحَدِیثِ وَ عِلمُ اللُّغَةِ وَ عِلمُ اُصُولِ الفِقهِ۔ (1)

یعنی تین علوم میں مجتہد کا ماہر ہونا ضروری ہے۔ علم حدیث، تاکہ مسائل شریعت کے بارے میں ارشادِ نبوت کا اسے پوری طرح علم ہو۔ نیز حدیث کے صحیح اور ضعیف ہونے میں فرق کر سکے، رواۃ حدیث کے بارے میں فن رجال کے علماء نے جو جرح و تعدیل کی ہے اس سے واقف ہو۔ فقط اس صورت میں وہ ہر حدیث کو اس کے صحیح مقام پر محمول کر سکے گا اور اس سے جس قسم کا حکم ثابت ہو سکتا ہے اسے مستنبط کر سکے گا۔ علم لغت میں بھی اور اصولِ فقہ میں بھی دسترس رکھتا ہو، تاکہ خاص و عام، مطلق ومقید، حقیقت ومجاز، صریح و کنایہ، نیز دلالت کی اقسام یعنی دلالۃ النص، عبارۃ النص، اشارۃ النص، اقتضاء النص اور اس کی دیگر اقسام سے پوری طرح باخبر ہو۔

آپ ان شرائط کو سننے کے بعد بلا جھجک یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ شرائط بلاوجہ نہیں، بلکہ ایک مجتہد میں ان کا پایا جانا ازبس ضروری ہے۔ اگر ان میں سے کوئی شرط بھی مفقود ہوگی تو ایسے خود ساختہ مجتہد کا اجتہاد، قوم کو کتاب وسنت سے دور پھینک دے گا اور ہدایت کے بجائے ضلالت وغوایت کے گڑھے میں گرادے گا۔

عصر حاضر میں اجتہاد کے پرجوش علمبردار اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ مجتہد شریعت کے ہر مسئلہ میں اجتہاد کا حق رکھتا ہے اور اگر وہ چاہے تو زمانے کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان احکام میں بھی تغیر و تبدل کر سکتا ہے جو دلائل قطعیہ سے ثابت ہیں۔ اس لیے ضروری معلوم

1۔ المستصفی، جلد 2، صفحہ 172، دار احیاء التراث العربی بیروت

Marfat.com

ہوتا ہے کہ اجتہاد کے دائرۂ کار کے بارے میں بھی وضاحت کر دی جائے کہ کون سے مسائل ہیں، جن میں مجتہد کو اجتہاد کرنے کی اجازت ہے اور کون سے ایسے مسائل ہیں جو اس دائرۂ کار سے خارج ہیں؟

علمائے اصول نے صاف طور پر لکھا ہے کہ مجتہد کو شریعت کے تمام احکام کے بارے میں اجتہاد کی اجازت نہیں ہے، بلکہ اس کا ایک محدود دائرۂ کار ہے جس کی حدود کی پابندی اس پر لازم ہے۔ اگر وہ ان حدود سے تجاوز کرے گا تو پھر وہ مجتہد نہیں رہے گا، بلکہ مستقل قانون ساز (مقنن) کا درجہ حاصل کرے گا۔ کسی اور نظامِ حیات میں اس کی گنجائش ہو تو ہو، اسلام ایسے قانون ساز کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ قانون سازی کا حقیقی منصب اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے جو کائنات کی ہر چیز کا خالق اور مالک ہے یا اس کے اذن سے اس کا رسول، قانون ساز ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بڑے سے بڑا عالم، کوئی بڑے سے بڑا فرمانروا اور کوئی بڑے سے بڑا فاتح، قانون سازی کے اختیارات کو اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتا۔ اسے بہر حال اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے محبوب کریم ﷺ کی سنت کی اتباع کرنا ہوگی۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وَالْمُجْتَهَدُ فِيْهِ، كُلُّ حُكْمٍ شَرْعِيٍّ لَيْسَ فِيْهِ دَلِيْلٌ قَطْعِيٌّ۔ (1)

یعنی صرف اس حکم شرعی میں اجتہاد کی ضرورت ہے جس کے لیے کوئی قطعی دلیل نہ ہو۔

اس کے بعد غزالی فرماتے ہیں کہ وہ امور جن کا تعلق عقلیات سے ہے، یا وہ مسائل جن کا تعلق عقائد سے ہے، یا وہ مسائل جو دلائل قطعیہ سے ثابت ہیں، ان میں کسی کو اجتہاد کی اجازت نہیں۔ ان امور میں اگر کوئی رائے زنی کرے گا تو اجتہاد نہیں ہوگا بلکہ تحریف ہوگی اور دین میں تحریف کی اجازت نہیں۔

آج سے پہلے بھی کئی ایسے مدعیانِ اجتہاد رونما ہوئے جنہوں نے کتاب و سنت سے ثابت شدہ احکام میں بھی رد و بدل کیا اور اسے اجتہاد کا عنوان دیا، لیکن تاریخ گواہ ہے کہ

1۔ المستصفی، جلد 2، صفحہ 173

Marfat.com

ملت اسلامیہ کے اجتماعی ضمیر نے ان کی ان جسارتوں کو کبھی قبول نہیں کیا، کیونکہ ملت اسلامیہ کا ہر فرد صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب مکرم ﷺ کو مستقل قانون ساز تسلیم کرتا ہے اور ان کے ہر ارشاد کے سامنے سر تسلیم خم کرنا جانتا ہے۔ ان کے علاوہ جس کسی نے بھی شریعت اسلامیہ میں اپنی من مانی کرنا چاہی اور اسے اجتہاد کے عنوان سے ہی کیوں نہ پیش کیا، ملت اسلامیہ نے اسے اور اس کے اجتہاد کو مسترد کر دیا اور کبھی در خو اعتناء نہیں سمجھا۔ ماضی بعید اور ماضی قریب میں ایسی شخصیتوں سے آپ بھی اچھی طرح واقف ہیں جنہوں نے کتاب وسنت کی نصوص میں ردو بدل کرنا چاہا، لیکن انہیں چند خوشامدیوں کے بغیر کہیں پذیرائی نصیب نہیں ہوئی۔

ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ عہد حاضر میں بعض مشکل مسائل ایسے ہیں جن کو حل کرنے کے لیے اہل علم و دانش کے اجتہاد کی اشد ضرورت ہے، لیکن ان مجتہدین کو ان اصول وضوابط کو پیش نظر رکھنا ہوگا جو علمائے اصول نے بیان فرمائے ہیں اور یہ اہم کام انفرادی طور پر کرنے کے بجائے اگر اجتماعی طور پر کیا جائے، یعنی ایسے علماء وفضلاء کی مجلس مقرر کی جائے جو ان مسائل پر سیر حاصل بحث وتمحیص کے بعد کوئی فیصلہ صادر کرے تو یہ از حد مفید ہوگا۔

اسلام
کا
ایک تعزیری قانون

Marfat.com

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلزَّانِیَةُ وَ الزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۪ وَّ لَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَ لْیَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ (النور)

شریعت اسلامیہ کے تعزیزی قوانین میں سے ایک اہم قانون کا ذکر ہو رہا ہے۔ انسان کی جان، مال، ناموس کی حفاظت اسلامی قوانین کا مقصد اولین ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کی جان کو تلف کرتا ہے تو قاتل سے قصاص لیا جائے گا۔ اگر کسی کے مال پر دست اندازی کرتا ہے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا اور اگر کوئی شخص کسی کی عزت و ناموس کو داغدار کرتا ہے تو اس کو دروں اور رجم کی سزا دی جائے گی۔ اسلام نے جو سزائیں مقرر کی ہیں ان میں دو باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ مجرم کو اس کے کیے کی سزا دی جائے، دوسری یہ کہ وہ لوگ جن میں جرائم کے ارتکاب کا میلان پایا جاتا ہے وہ اس خوفناک سزا سے ڈر کر جرم کا ارتکاب نہ کریں اور چاہیے بھی ایسا۔ اگر کسی سزا میں یہ دو عنصر مفقود ہیں تو اسے سزا کہنا ہی غلط ہے۔ گناہ کے ارتکاب سے جو لذت اور فائدہ حاصل ہوتا ہے اس کے مقابلے میں اگر سزا ہلکی ہو گی تو لوگ اس سزا کو خاطر میں نہیں لائیں گے اور حصولِ لذت کے لیے وہ جرم کا ارتکاب کرتے رہیں گے اور اگر سزا میں دوسروں کے لیے عبرت کا پہلو نہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ چاہتے ہی نہیں کہ اس جرم کا سدباب ہو اور کوئی اس کے نزدیک نہ پھٹکے۔ آپ صرف ضابطے کی کارروائی پوری کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کو اس سے سروکار نہیں کہ اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ یہ تو ایک بچوں کا کھیل ہوا۔ اس کے پیش نظر معاشرہ کو گناہوں سے پاک کرنا اور ان کے خطرناک نتائج سے محفوظ رکھنا نہ ہوا۔

اسلام یہ چاہتا ہے کہ جس ملک میں اس کا پرچم لہرا رہا ہے وہاں امن ہو، سکون ہو، محبت ہو، پیار ہو، تاکہ وہاں کے بسنے والے اپنی صلاحیتوں کو نیکی اور اصلاحی سرگرمیوں میں خرچ

Marfat.com

کر سکیں۔ تعمیری کاموں کے لیے ان کے پاس وقت کی قلت نہ ہو۔ عداوت، حسد، منافرت کے شعلے ان کے خرمن عافیت کو جلا کر خاکستر نہ کرتے رہیں۔ اس لیے اس نے انسدادِ جرائم کی ادھوری اور غیر مؤثر کوشش نہیں کی، بلکہ ایک جامع منصوبہ بنایا ہے جس پر عمل کرنے سے سوسائٹی ان جرائم سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ سب سے پہلے اس نے اپنے ماننے والوں کے دلوں میں خداوند ذوالجلال پر ایمان اور روزِ محشر کے محاسبہ کا خوف پیدا کیا اور یہ حقیقت ان کے سامنے واضح کر دی کہ جس خدا کو تم اپنا معبود کہتے ہو، جو تمہارا اور سارے عالم کا خالق و مالک ہے، اس نے ان اعمال کو جرم قرار دیا ہے۔ اگر تم ان کا ارتکاب کرو گے تو وہ ہمہ دان اور ہمہ بین بھی ہے، تم اس سے اپنا کوئی عمل چھپا نہیں سکتے۔ تصنع اور بناوٹ کے رنگین غلافوں میں لپیٹنے کی کوئی کوشش وہاں کامیاب نہیں ہوسکتی۔ تم اپنے حسن نیت یا مجبوری کو کتنے مؤثر پیرایہ میں بیان کرو، تم اسے فریب نہیں دے سکتے۔ وہ تمہارے اعمال، ان اعمال کے محرکات اور عوامل سے خوب آگاہ ہے اور قیامت کے دن تم اپنے ان اعمال کی جواب دہی کے لیے اس کی بارگاہ میں ضرور پیش کیے جاؤ گے۔

اسلام دین فطرت ہے۔ اس کا نظامِ شریعت ایسا نہیں جو انسان کے فطری تقاضوں سے ہر وقت برسرِ پیکار ہو۔ اللہ تعالیٰ ان فطری تقاضوں کا خالق ہے اور ان تقاضوں کی تخلیق میں بڑی بڑی حکمتیں ہیں۔ اس لیے اس نے ان کی تکمیل کے تمام جائز، مناسب اور خوب صورت طریقوں کو جائز قرار دیا ہے۔ فطری تقاضوں کی تکمیل کے جائز طریقوں کے ہوتے ہوئے جو شخص غلط راستہ اختیار کرتا ہے اسے وہ سزا دیتا ہے اور سزا بھی ایسی جس سے اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس جرم کا ارتکاب کر کے اس نے اپنے ساتھ سراسر زیادتی کی ہے۔ بلکہ دیکھنے اور سننے والوں کو بھی ایسی عبرت ہوتی ہے کہ وہ اس کے ارتکاب کی جسارت شاذ و نادر ہی کیا کرتے ہیں۔

وہ متعدد اعمال، جن کے ارتکاب کو اسلام نے جرم قرار دیا ہے، ان میں زنا بھی ہے۔ قرآن کریم نے ایک دوسری آیت میں اس سے ممانعت کی حکمت بڑے بلیغ انداز میں

Marfat.com

صرف دو لفظوں میں بیان کر دی۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝ (بنی اسرائیل)

''یعنی زنا کے قریب بھی نہ جاؤ۔ یہ بڑی بے حیائی ہے اور بہت ہی برا راستہ ہے''

یعنی تمہیں اس فعل بد سے ہم اس لیے نہیں روک رہے کہ تم لطف نہ اٹھاؤ، تمہاری زندگی کا دامن مسرتوں سے خالی رہے، بلکہ اس میں سراسر تمہارا ہی فائدہ ہے۔ یہ فعل مجسم بے حیائی ہے۔ اگر تم ارتکاب کرو گے تو شرم و حیا کی قوت جو تمہیں ہر برے کام سے، ہر رذیل حرکت سے، ہر خلاف مروت اقدام سے روکتی ہے، بلکہ گناہوں اور بدکاریوں کے سیلاب کے سامنے سد سکندری بن کر کھڑی ہو جاتی ہے، وہ کمزور پڑ جائے گی، وہ بیمار پڑ جائے گی حتی کہ دم توڑ دے گی اور جب یہ قوت فنا ہو جائے گی تو غیرت و حمیت کا جنازہ نکل جائے گا۔ پھر اگر کوئی یہ فعل شنیع، جس کے تصور سے ہی تم کانپ اٹھتے ہو، تمہاری بیوی، بہن بلکہ بیٹی کے ساتھ بھی کرے گا تو تم اسے کوئی اہمیت نہ دو گے۔ یورپ، امریکہ اور ان سے متاثر ہونے والے ملکوں میں کیا ہو رہا ہے۔ رقص گاہوں میں لوگ اپنی آنکھوں سے اپنی بہو بیٹیوں کو دوسروں کی آغوش میں دیکھتے ہیں اور ٹس سے مس نہیں ہوتے، بلکہ وہ دیوث فخر سے اترا رہے ہوتے ہیں اور داد دے رہے ہوتے ہیں۔

ممکن ہے کسی مسخ شدہ ذہن والے آدمی کے نزدیک اخلاقِ عالیہ کی یہ گراں بہا قدریں کوئی اہمیت نہ رکھتی ہوں۔ وہ محض انہیں قدامت پرستی اور رجعت پسندی کی علامت قرار دیتا ہو، لیکن سَآءَ سَبِيْلًا (یعنی بہت برا راستہ) فرما کر ایسے کند ذہن کو بھی حقائق کی تلخیوں، حالات کی بے رحمیوں اور واقعات کی سنگینیوں کے روبرو کر کے کھڑا کر دیا۔ یعنی یہ راستہ ہی بہت برا راستہ ہے۔ چند لمحوں کی فانی اور جھوٹی مسرت کے لیے انسان اپنی صحت کو کن خطرات سے دوچار کر دیتا ہے۔ آتشک، سوزاک وغیرہ موذی امراض کس کا کرشمہ ہے؟ یہ تحائف کون دیتا ہے اور کسے دیتا ہے؟ وہ عورت جو مرد کی شہوت رانی کا شکار ہوتی ہے، اسے اگر حمل ٹھہر گیا تو وہ کہاں سر چھپائے گی؟ حمل گرانے کی صورت میں وہ اپنی جان

Marfat.com

بھی کھو سکتی ہے۔ ہم نے مانا کہ یورپ کے ترقی یافتہ ممالک میں ایسے ہسپتال اور کلینک موجود ہیں جو اسقاطِ حمل کی خدمت انجام دیتے ہیں اور ایسی پناہ گاہیں بھی موجود ہیں جہاں غیر شادی شدہ ماؤں کو پناہ مل جاتی ہے، لیکن کیا سوسائٹی میں انہیں کوئی قابل احترام مقام نصیب ہو سکتا ہے؟ ہم نے مانا کہ ان دونوں نے اپنے کیے کی سزا پائی، لیکن وہ بچے جو اس طرح پیدا ہوتے ہیں ان کا کیا قصور؟ اس ہوسناک باپ نے بھی ان سے آنکھیں پھیر لیں۔ ماں بھی اسے محتاج خانے میں چھوڑ کر چلی گئی۔ نہ ان کو ماں کی آغوشِ محبت نصیب ہوئی نہ باپ کا ظل عاطفت۔ یہ محرومیاں اسے ورثہ میں کیوں ملیں؟ یہ سزا انہیں کس گناہ کی مل رہی ہے؟ کیا ان بچوں کے اذہان متاثر نہیں ہوتے؟

چند ماہ ہوئے امریکہ کی ایک خاتون کوریا گئی، وہاں اس نے بے شمار ایسے معصوم بچے دیکھے جن کی مائیں تو کوریا کی تھیں، لیکن ان کے باپ امریکہ کے وہ سپاہی تھے جو کوریا کی جنگ میں اہل کوریا کی مدد کے لیے تشریف لائے تھے۔ وہ کوریا والوں کو کمیونسٹوں کی غلامی سے چھڑانے آئے تھے۔ وہ انہیں جمہوریت کی بالادستی کا سبق ازبر کرانے آئے تھے۔ وہ سبق تو انہیں ازبر ہوا یا نہیں، البتہ یہ ضرور ہوا کہ ہزاروں بلکہ لاکھوں کورین دوشیزائیں ان کے ڈالروں کی جھنکار سے مسحور ہو کر یا جنگ کی لائی ہوئی محرومیوں اور فاقوں سے مجبور ہو کر اپنی عصمت کی دولت لٹا بیٹھیں اور ان کے مہربان امریکی حلیف انہیں حرامی بچوں کا ایک لشکر جرار دے گئے۔ خود تو وہ اپنے وطن واپس چلے گئے اور وہ معصوم بچے اپنے ظالم جفاکار اور طوطا چشم باپوں اور غربت زدہ ماؤں کی مفارقت کے صدمے برداشت کرنے کے لیے کوریا میں رہ گئے اور وہ اب تک وہاں کے گلی کوچوں میں دھکے کھا رہے ہیں۔ ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ امریکہ کی اس خاتون نے جب یہ حال دیکھا تو رحم کی ایک رَو نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اس نے امریکہ کے اخبارات میں ایک اپیل شائع کی کہ ان بچوں کی سرپرستی کے لیے امریکہ کے دولت مند چندہ دیں۔ لاکھوں ڈالر چندہ ہوا۔ اخبارات میں امریکہ کی غریب پروری اور انسانیت نوازی کی تشہیر ہوئی اور خوب تشہیر ہوئی، لیکن

Marfat.com

سوچئے ان لاکھوں بچوں میں سے اگر ہزار دو ہزار بچے کفالت میں لے بھی لیے گئے تو یہ مسئلہ حل ہو گیا؟ باقی رہ جانے والے بچوں کے دکھ کا مداوا اور درد کا درماں ہو گیا؟ ان کفالت میں لیے جانے والے بچوں کو ماں کا پیار اور باپ کی محبت بھی مل گئی؟ وہ محترمہ اس ہنگامہ آرائی کے بجائے اگر اپنے سپوتوں کو شرم و حیا کا درس دیتی اور اس فعل شنیع سے باز آنے کی تلقین کرتی تو کیا یہ اچھا نہ ہوتا؟ آگ لگا کر اسے بجھانے کی ناکام کوشش سے کیا یہ بہتر نہیں کہ لگانے کی حماقت نہ کی جائے؟ وَسَآءَ سَبِيْلًا کے الفاظ کتنے جامع ہیں، آپ ان افراد، ان خاندانوں اور قوموں کا جتنی گہری نظر سے تجزیہ کریں گے آپ کے سامنے ہولناک حقائق بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے۔ آپ بڑے فراخ دل، مغربیت زدہ اور جدت پسند ہونے کے باوجود کانپ جائیں گے، لرز جائیں گے۔

دوسری جنگ عظیم میں امریکہ کے سپاہی اپنے دوست ملک برطانیہ کی مدد کے لیے تشریف لائے تھے، وہ چند سال برطانیہ میں ٹھہرے اور جب گئے تو سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۷۰ ہزار حرامی بچے چھوڑ کر گئے۔ اس کے علاوہ جو جنسی لاعلاج بیماریاں انہوں نے ایک دوسرے کو بطورِ تحفہ دی ہوں گی، ان کا کون اندازہ لگا سکتا ہے؟

یہ درست ہے کہ آپ اپنے قانون ساز اداروں کے ذریعے ایک فعل کو جرائم کی فہرست سے نکال سکتے ہیں۔ اگر آج تک وہ حرام اور ممنوع رہا ہے، تو آپ ایک بل پاس کر کے اسے جائز قرار دے سکتے ہیں، لیکن کیا کسی قانون ساز ادارہ میں یہ طاقت ہے کہ ان جرائم کو جنہیں اب قانون کی سند مل گئی ہے، ان کے برے نتائج و عواقب سے الگ کر سکے؟ مغرب کے بیشتر ممالک میں اگر کوئی غیر شادی شدہ مرد یا عورت اپنی مرضی سے اس فعل شنیع کا ارتکاب کرے تو وہاں ملکی قانون کی رو سے یہ جرم نہیں، آپ انہیں کوئی سزا نہیں دیں گے، لیکن کیا قدرت کی گرفت سے بھی کوئی انہیں بچا سکتا ہے؟ قدرت کی گرفت کے مختلف انداز ہیں جن میں سے بعض کا ذکر اوپر ہوا۔ کیا قدرت کا بے لاگ قانون انہیں مختلف قسم کے شکنجوں میں کس نہیں رہا؟ یورپ کے بعض ملکوں میں حرامی بچوں کی شرح پیدائش ساٹھ فیصد سے بھی متجاوز ہو گئی

ہے اور غیر شادی شدہ ماؤں میں ہوشربا اضافہ ہو رہا ہے۔ طلاقوں کی کثرت ہے، گھروں میں سکون کی دولت نہیں ملتی۔ میاں بیوی میں اعتماد مفقود ہے۔ میاں بیوی وہ میں سچی محبت، جس کے ہم یہاں خوگر ہیں، جس کی وجہ سے میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے قربانی اور ایثار کی حیران کن مثالیں قائم کرتے ہیں، اس کا نام ونشان تک وہاں نہیں۔ برداشت اور ایثار کا جذبہ ختم ہو چکا ہے۔ کوئی بات کسی کی مرضی کے خلاف ہوگئی جھٹ طلاق حاصل کر لی۔ خود غور فرمائیے! گھر معاشرہ کی خشت اول ہے۔ یہ وہ محکم اساس ہے جس پر معاشرے کا محل تعمیر کیا جاسکتا ہے۔ اگر یہ بنیاد ہی کمزور ہوگی تو صحت مند معاشرہ کیسے تعمیر ہوگا۔

اس لیے جب آپ شریعت اسلامیہ کا مطالعہ فرمائیں تو ازراہِ خدا بھڑکے ہوئے جذبات کی رو میں بہتے ہوئے مرعوبیت کے احساس کے زیر اثر ہو کر نہ کیا کریں، بلکہ ان تمام چیزوں سے بلند ہو کر کیا کریں۔ بے شک آپ جذبۂ عقیدت کو بالائے طاق رکھ دیں۔ لیکن حقیقت کا دامن تو کسی کے کہنے یا بہلانے سے نہ چھوڑ دیا کریں۔ اسلام دین فطرت ہے، اس کی حقیقت پسندی جب آپ کے سامنے عیاں ہوگی تو اس کا حسن خود ہی آپ کو مسحور کر لے گا۔

اسلام نے جن چیزوں کو بجالانے کا حکم دیا ہے اس میں ہمارا، ہماری قوم کا بلکہ ساری انسانیت کا بھلا ہے اور جن چیزوں سے روکا ہے اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ اس میں ہمارا، ہماری قوم کا اور ساری انسانیت کا نقصان ہے، کیونکہ یہ دین ابد تک کے لیے ہے، اس لیے کوئی ایسا وقت نہیں آسکتا کہ اس کی حرام کی ہوئی چیزیں حلال ہو جائیں یا ان پر مرتب ہونے والے نقصانات ختم ہو جائیں۔

یورپ کے کئی ممالک میں شراب پینا اور جوا کھیلنا قانوناً جائز ہے۔ اس کی یہ وجہ نہیں کہ وہاں شراب پینے اور جوا کھیلنے سے وہ مضرتیں رونما نہیں ہوتیں جن کے باعث شراب وقمار کو ممنوع کیا گیا تھا، بلکہ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ان کے ذریعہ سے حکومت کو بہت بڑی آمدنی ہوتی ہے اور اگر ان چیزوں کو ممنوع قرار دیا جائے، تو حکومت اس آمدنی سے محروم ہو جائے

Marfat.com

گی۔ غور فرمایا آپ نے عقل انسانی کی قلابازیوں کا کیا حال ہے؟ جب جرائم اور قبائح کے متعلق اسلام کا نقطہ نظر ہی الگ ہے تو ان کے انسداد کے لیے اسلام کا طریقہ کار اگر دیگر اقوام سے الگ ہو تو اس میں قطعاً کوئی حیرت نہیں۔ مجرم کے ساتھ ایسی مہربانی اور شفقت، جو دوسرے بے شمار لوگوں کو جرم کے ارتکاب پر جری کر دے، اس سے وہ سختی بہتر ہے جو مجرم سے وہ ہمت چھین لے کہ وہ دوبارہ اس کا ارتکاب کر سکے اور دوسرے لوگوں کے دلوں میں ایسی دہشت اور خوف پیدا کر دے کہ کسی کے دل میں اس جرم کے ارتکاب کا خیال ہی پیدا نہ ہو۔

زنا کا فعل قبیح کیونکہ گوناگوں ایسی ہی لازمی اور متعدی خرابیوں کا سرچشمہ تھا، اس لیے اسلام نے اس سے بڑی سختی سے منع فرمایا۔ اگرچہ قانونِ اسلام کو معطل ہوئے عرصہ دراز گزر چکا ہے، شرم وحیا کی اس چادر کو تار تار کرنے کی بڑی منظم کوششیں بھی شروع ہیں، لیکن اپنے ماننے والوں کے دلوں میں اسلام نے جو نفرت اس سے پیدا کر دی ہے، اس کے باعث اس فعل شنیع کا ارتکاب نسبتاً بہت ہی کم ہے۔ چند مسخ شدہ گھروں کے علاوہ سارے ملک میں عصمت وعفت کا مقام بہت ہی بلند ہے۔

یہ عرض کرنے کے بعد اب بدکار عورت اور بدکار مرد کے لیے اسلام نے جو سزا تجویز کی ہے اس کو مختصراً پیش کرتا ہوں۔ انہیں آپ ابتدائی معلومات ہی قبول فرمائیں۔ تفصیلات کے لیے کتب فقہ کی طرف رجوع کریں۔ یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ اس مسئلہ کے جملہ پہلوؤں کو بالتفصیل پیش کیا جا سکے۔

زانی مرد اور زانیہ عورت کو شریعت نے دو قسموں میں تقسیم کیا ہے اور اسی تقسیم کے پیش نظر ان کی سزاؤں میں تفاوت ہے۔

۱۔ غیر شادی شدہ مرد اور غیر شادی شدہ عورت۔

۲۔ شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت۔

زمانۂ جاہلیت میں دیگر قباحتوں کے ساتھ ساتھ زنا کا رواج بھی عام تھا اور اس کا ارتکاب بے دھڑک کیا جاتا تھا۔ پیشہ ور عورتیں بڑے ٹھاٹھ سے اپنی دکانیں سجاتی تھیں۔

Marfat.com

اونچے اونچے جھنڈے ان کے مکانوں پر لہرایا کرتے تھے۔ انہیں اور ان کے پاس آنے والوں کو قطعاً حجاب معلوم نہ ہوتا تھا۔

كَانَ فِيْ ذٰلِكَ الزَّمَانِ زِنَا النِّسَاءِ فَاشٍ وَ كَانَ لِإِ مَاءِ الْعَرَبِ وَ بَغَايَا الْوَقْتِ رَايَاتٌ وَ كُنَّ مُجَاهِرَاتٍ بِذٰلِكَ۔ (1)

اسلام جو انسان کو رذالت و کمینگی کی ان پستیوں سے نکالنے کے لیے آیا تھا، وہ اس کو کیسے گوارا کرتا؟ چنانچہ سورۃ الفرقان، جو مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی، اس میں اہل ایمان کی دیگر صفات کے ساتھ یہ بھی ذکر کیا گیا کہ وہ زنا کا ارتکاب نہیں کرتے۔ وَلَا يَزْنُوْنَ (فرقان:68) اور سورۃ الممتحنہ میں جہاں عورتوں کے مشرف باسلام ہونے اور بیعت کرنے کا ذکر ہے، وہاں ان سے یہ وعدہ بھی لیا جاتا ہے کہ وَلَا يَزْنِيْنَ (12) کہ وہ آئندہ زنا نہیں کریں گی۔ یاد رہے کہ سورۃ الممتحنہ بھی مکہ میں نازل ہوئی تھی۔ یہ تو روحانی اور اخلاقی تربیت تھی جس کی تلقین ہر اسلام قبول کرنے والے کو پہلے دن ہی کی جاتی اور اس سے یہ وعدہ لیا جاتا جس کی پابندی اس پر ضروری ہوتی۔

اس جرم شنیع کا ارتکاب کرنے والوں کے متعلق جو حکم ہوا وہ سورۂ نساء کی آیت نمبر ۱۵ میں مذکور ہے کہ شادی شدہ عورت اگر اس جرم کا ارتکاب کرے تو اس کو گھر میں محبوس کر دو یہاں تک کہ وہ مر جائے یا اللہ تعالیٰ کوئی دوسرا حکم نازل کرے۔ فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا (النساء) اور غیر شادی شدہ مرد اور عورت کے لیے ابتداء میں یہ سزا تجویز کی گئی کہ انہیں لعنت ملامت کی جائے اور خوب اذیت دی جائے۔ وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا (النساء:16) کچھ عرصہ اسی حکم کے مطابق عمل ہوتا رہا، پھر پانچ یا چھ ہجری میں جب سورۃ النور نازل ہوئی تو یہ حکم نافذ ہوا کہ زانی مرد اور زانیہ عورت کو سو کوڑے لگائے جائیں۔ ساری امت محمدیہ علی صاحبہا الف الف صلوٰۃ وسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ سزا غیر شادی شدہ مرد اور عورت کے لیے ہے۔ شادی

1۔ الجامع لاحکام القرآن للقرطبی، جلد 12، صفحہ 160، دار الکتب المصریہ قاہرہ

شدہ مرد اور عورت کی سزا یہ ہے کہ اسے رجم کر دیا جائے یعنی اس پر اتنے پتھر برسائے جائیں کہ وہ مر جائے۔ صرف خوارج کا یہ قول ہے کہ سو کوڑوں کی سزا ہر زانی اور زانیہ کے لیے ہے۔ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کی کوئی تخصیص نہیں۔ انہوں نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے۔ یہاں مطلق زانی اور زانیہ کی سزا مقرر کی گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں جن روایات سے رجم کی سزا کا ثبوت ملتا ہے، وہ قرآن کریم کی مخصص یا ناسخ نہیں ہو سکتیں۔ قدیم خوارج کے علاوہ اس زمانہ کے جدید خوارج کا بھی یہی قول ہے۔ ان کی خدمت میں مختصراً اتنی گزارش ہے کہ رجم اخبار آحاد سے نہیں، بلکہ احادیث متواترہ سے ثابت ہے۔ حضور سرورِ عالمیاں صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس آیت کے نزول کے بعد بھی متعدد بار رجم کی سزا دی جن کی تفصیل کتب احادیث میں مذکور ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت فاروقِ اعظم، حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہم، سب نے اپنے اپنے عہد خلافت میں شادی شدہ زانی اور زانیہ کو رجم کیا۔ ایک معمولی سمجھ کا انسان بھی اس بات کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ اس آیت کا مفہوم قدیم و جدید خوارج سے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بہر حال بہتر سمجھتے تھے اور حضور کے خلفائے راشدین، جن کی زندگی کا ہر لمحہ اقامت دین میں صرف ہوا، وہ قطعاً کوئی ایسا کام کرنے کے لیے تیار نہ تھے جس سے فرمانِ الٰہی کی خلاف ورزی ہو۔ ایسے واضح تعامل کے باوجود شادی شدہ کے لیے رجم کا انکار کرنا کھلی ہوئی زیادتی ہے اور اس کا ارتکاب صرف خارجی ہی کر سکتے ہیں۔

ثبوتِ زنا

اس کے دو طریقے ہیں:

۱۔ اقرار

۲۔ شہادت (1)

کیونکہ یہ بہت گھناؤنا جرم ہے، اس سے انسان کی عزت و آبرو، جو اس کا متاعِ گراں

1۔ الہدایہ، جلد 2، صفحہ 07-506، مکتبہ شرکتہ علمیہ ملتان

Marfat.com

بہاہے، متاثر ہوتی ہے نیز اس کی سزا بھی از حد سنگین ہے، اس لیے اس جرم کو ثابت کرنے کے لیے بڑی احتیاط ملحوظ رکھی گئی ہے۔ جس اقرار سے یہ جرم ثابت ہوتا ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ اس فعل کا ارتکاب کرنے والا امام یا نائب امام کے سامنے چار مرتبہ صاف الفاظ میں اقرار کرے کہ اس نے یہ فعل شنیع کیا ہے۔ حضور کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے جب ماعز بن ملک سلمٰی نے آکر یہ عرض کی، یا رسول اللہ! مجھے پاک فرمائیے میں نے زنا کیا ہے، تو حضور نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور فرمایا:

وَيُحَكَ اِرْجِعْ فَاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ وَتُبْ اِلَيْهِ (1) (اے جوان! واپس چلا جا اور توبہ و استغفار کر)۔

اس نے پھر سامنے ہو کر یہی کہا۔ حضور نے پھر منہ پھیر لیا۔ تیسری مرتبہ بھی اس نے اقرار کیا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اسے متنبہ کیا کہ اب اگر چوتھی بار تو نے ایسا ہی کہا تو تجھے رجم کر دیا جائے گا، لیکن وہ باز نہ آیا۔ چوتھی مرتبہ بھی وہ الفاظ کہے۔ (2) اب حضور اس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

لَعَلَّكَ قَبَّلْتَ اَوْ غَمَزْتَ اَوْ نَظَرْتَ (شاید تو نے بوسہ لیا ہو یا نظر بازی کی ہو۔) لیکن وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ حضور نے فرمایا:

اَبِكَ جُنُوْنٌ؟ قَالَ لَا۔ کیا تو مجنوں تو نہیں؟ اس نے کہا نہیں۔ پھر فرمایا کیا تو شادی شدہ ہے؟ اس نے عرض کی: ہاں یا رسول اللہ! آخر میں حضور نے فرمایا: اِذْهَبُوْا بِهٖ فَارْجُمُوْهُ۔ (اسے لے جاؤ اور رجم کر دو)۔ (3)

شہادت

شہادت میں بھی حد درجہ کی احتیاط کی گئی ہے۔ چار ایسے مرد گواہ ہونے چاہئیں جو

1۔ صحیح مسلم، باب حد الزنا، جلد 2، صفحہ 67

2۔ موطا امام مالک، باب ما جاء فی الرجم، صفحہ 684، مطبع مجتبائی پاکستان لاہور

3۔ صحیح بخاری، باب ما یقول الامام للمقر لعلک لمست او غمزت، جلد 2، صفحہ 1008

Marfat.com

مسلمان، عاقل، بالغ، آزاد اور عادل ہوں، جن کی صداقت اور دیانت ہر شک وشبہ سے بالا تر ہو اور گواہی بھی اس طرح دیں کہ انہوں نے ملزم اور ملزمہ کو عین حالت مباشرت میں دیکھا ہے۔ كَالْمِيلِ فِي الْمُكْحَلَةِ وَالرِّشَاءِ فِي الْبِيْرِ. (یعنی جس طرح سرمہ میں سلائی اور کنویں میں رسی۔) اگر گواہوں کی گواہی میں جگہ، وقت مزنیہ وغیر ہا امور کے متعلق اختلاف پایا جائے، تو گواہی مردود ہوگی اور حد نہ لگائی جائے گی۔

اثبات زنا کے لیے اتنی سختی اور احتیاطی تدابیر اختیار کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ شریعت کو لوگوں کو سزا دینے کا شوق نہیں، تاکہ جہاں کہیں کسی نے انگشت نمائی کر دی وہاں کوڑے برسنے لگے اور لہو بہنے لگا۔ یا ذرا موقع پاتے ہی پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا۔ یہ سزا ایک انتہائی اقدام ہے جو صرف ایسے شخص کے خلاف ہی کیا جائے گا جس کے دل میں نہ خدا کا خوف ہے، نہ قیامت کا ڈر ہے نہ آیاتِ قرآنی اور احادیث نبوی کا پاس ہے اور نہ اسے سوسائٹی میں رسوا اور ذلیل ہونے کا کوئی اندیشہ ہے۔ اس نے یہ کام اس طرح کیا کہ چار آدمیوں نے عین حالت مباشرت میں دیکھ لیا۔ نیز شریعت نے یہ بھی ضروری قرار نہیں دیا کہ جو شخص تنہائی میں چھپ کر یہ کام کر بیٹھے وہ ضرور عدالت میں حاضر ہو کر اس کا اعتراف کرے۔ گواہوں پر بھی یہ ضروری نہیں کہ وہ اس کے خلاف ضرور جا کر گواہی دیں، بلکہ اسے چاہیے کہ خود بھی اپنا پردہ فاش نہ کرے اور گواہوں کے لیے بھی بہتر ہے کہ وہ اس کی پردہ دری نہ کریں۔ حدیث پاک میں ہے:

مَنْ اَتٰى شَيْئًا مِنْ هٰذِهِ الْقَاذُوْرَاتِ فَلْيَسْتَتِرْ بِسِتْرِ اللّٰهِ. فَاِنْ اَبْدٰى لَنَا صَفْحَتَهٗ اَقَمْنَا عَلَيْهِ كِتَابَ اللّٰهِ.(1)

یعنی جس کسی سے اس قسم کا گندہ فعل صادر ہوا، اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پردے کو فاش نہ کرے اور جو شخص ہمارے سامنے اپنے آپ کو ظاہر کرے گا ہم اس پر حکم الٰہی ضرور جاری کریں گے۔ ہزال بن معین جس نے ماعز کو بارگاہِ رسالت میں اس جرم کا اقرار کرنے

1۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 3، صفحہ 85-284، دار الکتب العلمیہ، بیروت

Marfat.com

کے لیے بھیجا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا لَوْ سَتَرْتَهُ بِثَوْبِكَ لَكَانَ خَيْرًا لَكَ (1) اگر تو اسے اپنے کپڑے میں ڈھانپ لیتا، تو تیرے لیے بہتر ہوتا، لیکن اگر یہ چیز حاکم وقت کے سامنے پیش کر دی جائے اور اقرار یا شہادت سے پایہ ثبوت کو پہنچ جائے تو پھر حاکم کو یہ اختیار نہیں کہ وہ حد قائم نہ کرے۔ تَعَافَوُا الْحُدُوْدَ فِيْمَا بَيْنَكُمْ فَمَا بَلَغَنِيْ مِنْ حَدٍّ فَقَدْ وَجَبَ۔ (2) (ابوداؤد۔ نسائی) آپس میں حدوں سے درگزر کرتے رہو، لیکن جب وہ حد مجھ تک پہنچ جائے گی، تو پھر اس کا نفاذ ضروری ہو جائے گا۔

نیز یہ جرم قابل مصالحت نہیں کہ کچھ معاوضہ دے کر قصہ ختم کر دیا جائے۔ ایک لڑکا کسی آدمی کے ہاں کام کرتا تھا۔ اس نے اس کی بیوی کے ساتھ بدکاری کی۔ لڑکے کے باپ نے سو بکریاں اور ایک لونڈی اس کے خاوند کو دے کر راضی کر لیا، لیکن جب مقدمہ بارگاہِ نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پیش ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اَمَّا غَنَمُكَ وَجَارِيَتُكَ فَرَدٌّ عَلَيْكَ۔ (3) وہ تیری بکریاں اور تیری لونڈی تجھے واپس کر دی جائے گی اور تیرے لڑکے پر حد لگے گی۔

جس کوڑا کے ساتھ مارا جائے وہ نہ زیادہ سخت ہو، نہ زیادہ نرم اور حد جسم کے ایک حصے پر ہی نہ لگائی جائے بلکہ منہ، سر اور شرمگاہ کے علاوہ جسم کے مختلف حصوں پر لگائی جائے۔

حضور کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن ایسے حاکم کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کیا جائے گا، جس نے حد میں کمی کی ہوگی، اس سے پوچھا جائے گا: لِمَ فَعَلْتَ ذٰلِكَ؟ تو نے ایسا کیوں کیا؟ وہ کہے گا: رَحْمَةً لِعِبَادِكَ۔ تیرے بندوں پر رحمت و شفقت کے لیے۔ اسے کہا جائے گا: اَاَنْتَ اَرْحَمُ بِهِمْ مِنِّيْ؟ کیا تو مجھ سے زیادہ ان پر رحم کرنے والا ہے؟ فَيُؤْمَرُ بِهٖ اِلَى النَّارِ۔ اسے دوزخ میں پھینک دینے کا حکم دیا جائے گا۔

1۔ سنن ابوداؤد، باب الستر علی اہل الحدود، جلد 2، صفحہ 601

2۔ سنن نسائی، باب ما یکون حرزا و ما لا یکون، جلد 2، صفحہ 255، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی

3۔ ایضاً، باب صون النساء عن مجلس الحاکم، جلد 2، صفحہ 308

Marfat.com

پھر ایسے حاکم کو پیش کیا جائے گا جس نے مقررہ حد سے ایک کوڑا زیادہ مارا ہوگا، اس سے اس کی وجہ پوچھی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے أَأَنْتَ اَحْکَمُ بِهٖ مِنِّیْ. فَیُؤْمَرُ بِهٖ اِلَی النَّارِ. (1) کیا تو مجھ سے زیادہ حکم کرنے والا ہے؟ پھر اسے بھی آگ میں پھینکے جانے کا حکم صادر ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ احکامِ خداوندی کی صحیح طور پر تعمیل میں ہی ہماری فلاح ہے۔ اپنی خود ساختہ مصلحتوں کے پیش نظر ان میں کمی یا زیادتی کرنا خطرناک نتائج کا باعث ہوتا ہے۔ جہاں بھی حدود کے قیام میں تساہل کیا گیا، جرائم میں ہوشربا اضافہ ہوا۔ قتل کی وارداتوں میں آئے دن جو زیادتی ہو رہی ہے، اس کی ایک بڑی وجہ یہی فعل مذموم ہے۔ جب اس شخص کی دادرسی نہیں ہوتی جس کی عصمت لوٹ لی گئی، تو وہ جوشِ غضب سے مغلوب ہو کر خود انتقام لینے کے لیے بڑھتا ہے اور فتنہ و فساد کی آگ بھڑکا دیتا ہے۔ اس لیے رافت اور مہربانی یہ نہیں کہ ایک جان بچانے کے لیے بیسیوں جانیں تلف کرنے کا دروازہ کھول دیا جائے۔

کیونکہ اس سزا کا ایک اہم مقصد دوسروں کو عبرت دلانا ہے، اس لیے حکم دیا کہ یہ حد مجمع عام میں قائم کی جائے، تاکہ عام لوگ اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور مجتنب رہیں۔ جب کوئی شخص حد قائم کرنے کے باعث مر جائے تو اس کی نعش کی تذلیل اور توہین نہیں کی جائے گی، بلکہ عام مسلمانوں کی طرح اسے غسل دیا جائے گا، کفن پہنایا جائے گا، نمازِ جنازہ ادا کی جائے گی اور مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔ اِذَا مَاتَ فِی الْحَدِّ یُغَسَّلُ وَیُکَفَّنُ وَ یُصَلّٰی عَلَیْهِ وَیُدْفَنُ فِیْ مَقَابِرِ الْمُسْلِمِیْنَ. (2)

1۔ تفسیر کبیر، سورۂ نور، جلد 12، صفحہ 50-149، دار الفکر، بیروت
2۔ ایضاً، صفحہ 148

Marfat.com

مزدوروں کی
گمشدہ جنت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یہ ایک کتاب کا نام ہے (Workers Paradise Lost) اس کا مصنف ای لیونیز ای (E. Lyonse) ہے جو چھ سال تک ماسکو میں اخباری نمائندہ رہا۔ ابتداء میں وہ اشتراکیت کا جانثار معتقد تھا، لیکن جب اس نے روس میں رہ کر اپنی آنکھوں سے حالات کا مشاہدہ کیا تو اسے حقیقت کی سنگینی کا علم ہوا۔ ۱۹۶۷ء میں جب روسیوں نے اشتراکی انقلاب کی پچاسویں سالگرہ منائی اور اس میں اپنے انقلاب کی کامیابی کے بلند بانگ دعوے کیے تو مصنف نے یہ عظیم اور معرکۃ الآراء کتاب لکھ کر حقیقت حال کو عریاں کر دیا۔

پاکستان آج جس نازک مرحلے سے گزر رہا ہے اس کے پیش نظر ضروری معلوم ہوا کہ اس اہم کتاب کے ضروری ابواب کا خلاصہ اپنے نوجوانوں کی خدمت میں پیش کیا جائے، تاکہ وہ کسی فریب میں مبتلا ہو کر اپنے ہاتھوں سے اپنے مستقبل کو تاریک نہ بنا دیں۔

''اشتراکیت کی مشعل کو بلند رکھتے ہوئے روس کے باشندوں نے عالمی تاریخ کے ایک نئے عہد کا آغاز کیا ہے۔ اشتراکیت کی قوت پایاں ناپذیر ہے۔ اس کا برپا کیا ہوا انقلاب کامیابی سے ہمکنار ہو رہا ہے، سوشلزم آج انسانوں کا حال ہے اور آئندہ سارے نوعِ انسانی کا مستقبل''۔

یہ فقرے ایک ایسے اعلان سے لیے گئے ہیں جو تیس صفحات پر مشتمل ہے اور جسے اشتراکی انقلاب کی پچاسویں سالگرہ پر شائع کیا گیا ہے۔ اس میں واضح طور پر دعویٰ کیا گیا ہے کہ روس میں اشتراکی انقلاب مکمل طور پر کامیاب ہو گیا ہے۔ دیرینہ عادت کے مطابق اس میں بڑی لاف زنی سے کام لیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ روس میں بے روزگاری کا مکمل طور پر خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ معاشی اور عمرانی طور پر بے نظیر ترقی کی گئی ہے۔ سرمایہ داری کا بیڑا غرق کر دیا گیا ہے۔ اجتماعی زراعت اور صنعت نے بڑے کارنامے سرانجام دیے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

Marfat.com

کل کی ناکامیوں کو پروپیگنڈے کے ذریعے شاندار کامیابیاں بتایا جارہا ہے۔ حقائق کو موڑ توڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ غرضیکہ اس تقریب پر جو دستاویزی ثبوت پیش کیے جارہے ہیں وہ عصر حاضر کی دیومالا کی ایک ناقابل تصور مثال ہے۔

ہمیں غور کرنا چاہیے کہ روسی اشتراکیوں کی یہ لاف زنیاں حقیقت سے کیا تعلق رکھتی ہیں؟ کیا واقعی اشتراکی نظام کامیاب ہوگیا ہے؟ کیا واقعی روسی باشندوں کو غربت وافلاس کا اب کوئی اندیشہ نہیں رہا؟ کیا مارکس اور لینن کا یہ نظریہ درست ثابت ہوگیا ہے کہ اشتراکی نظام کو بروئے کار لانے کے لیے جو جبر وتشدد کیا جارہا ہے، انجام کار یہ سچی جمہوریت، امن اور آزادی کی طرف رہنمائی کرے گا؟ اس دعویٰ کی حقیقت کیا ہے؟ پچاس سالہ طویل اشتراکی تجربے کے بعد اب یہ مناسب ترین وقت ہے کہ حقائق کی روشنی میں ہم ان دعاوی کا جائزہ لیں۔

میں روس کے منہ پر تھوکتا ہوں

چھ سات نومبر ۱۹۱۷ء کی درمیانی رات کو جو واقعہ رونما پذیر ہوا، اسے نصف صدی تک ایک انقلابی واقعہ کہا جاتا رہا، حالانکہ یہ سراسر جھوٹ ہے۔ لینن، ٹراٹسکی (Trotsky) اور ان کے ذہین ساتھیوں نے اس رات کا کام انجام دیا۔ اس کے باعث انقلاب برپا نہیں ہوا بلکہ ان کے اس اقدام نے جمہوری اور عوامی انقلاب کو ناکام بنادیا۔ حقیقت میں انہوں نے جمہوری نظام کو پارہ پارہ کردیا جو روس کی تاریخ میں وہاں پہلی مرتبہ قائم کیا گیا تھا۔ لینن نے خود اعتراف کیا کہ اس انقلاب سے روسی حکومت دنیا کی سب سے زیادہ حریت پسند مملکت تھی۔ روس میں جمہوری انقلاب مارچ ۱۹۱۷ء میں وقوع پذیر ہوا، جس نے روسی شہنشاہیت کا خاتمہ کرکے جمہوری آئین کی داغ بیل ڈالی اور الیگزنڈر (Alexander Kerensky) کی قیادت میں ایک عبوری جمہوری حکومت قائم کی گئی۔

یہ بات غلط ہے کہ بالشویکوں نے روسی باشندوں کو زار روس کے پنجۂ استبداد سے آزاد کرایا۔ حقیقت یہ ہے کہ روسی باشندوں نے بالشویکوں کو جلاوطنی سے رہائی دلائی اور اپنے

ملک کے دروازے ان کے لیے کھول دیے اور جو لوگ اندرونِ ملک قید و بند کی سختیاں برداشت کر رہے تھے، انہیں رہائی کا مژدہ سنایا۔ جب زار کا تختۂ حکومت الٹا گیا تو لینن سوئٹزرلینڈ میں جلاوطنی کے دن گزار رہا تھا۔ اس نے زار کی شکست کی خبر وہاں کے اخبارات میں پڑھی۔ ۱۶ اپریل کو وہ اپنے تیس ساتھیوں کے ساتھ روسی دارالخلافہ پیٹروگراڈ میں پہنچا۔ ٹراٹسکی اس وقت نیویارک میں تھا۔ وہ مئی میں واپس آیا۔ سٹالن اور دوسرے اشتراکی لیڈروں کے مختلف قید خانوں میں قید تھے اور اس انقلاب کے بعد انہیں رہا کیا گیا۔ لینن اور اس کے ساتھی ایک نہایت مختصر طبقہ کے نمائندے تھے۔ ہوس اقتدار کے سوا ان کے پاس کوئی واضح پروگرام نہ تھا۔ آخر کار لینن کا عزم اور پختہ ارادہ ان کا رہنما ثابت ہوا۔ لینن کے نزدیک انقلاب عوام الناس کے بل بوتے پر برپا نہیں کیے جاتے، بلکہ ایک چست، چالاک اور منظم گروہ ہی انقلاب برپا کر سکتا ہے۔ لینن کہا کرتا تھا کہ مجھے پیشہ ور انقلابیوں کی ایک تنظیم دے دو، میں چند دنوں میں روس کا تختہ الٹ کر رکھ دوں گا۔ پس و پیش کرنے والے لوگ اس کے نزدیک احمق اور بزدل ہوتے ہیں۔ لینن نے اپنے بالشویک ساتھیوں کے ساتھ وہ انتہائی اقدام کیا جسے اس کے اکثر ماننے والوں کی تائید حاصل نہ تھی اور وہ اسے پرخطر مہم خیال کرتے تھے۔ ان سے یہ حقیقت مخفی نہ تھی کہ عوام کی اکثریت اشتراکیت کی خواہش مند نہیں۔ اس لیے انہوں نے جمہوری نعروں اور جھوٹی قسموں کے ساتھ لوگوں کو اپنا گرویدہ بنایا اور اپنے اصل مقاصد کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ روس کے مشہور اخبار ''پراودا'' جو اس وقت کے مولوٹوف اور سٹالن کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ لوگوں نے پختہ وعدہ کیا کہ وہ لوگوں کی سماجی آزادیوں، رائے شماری کے مخفی طریقے اور ہڑتال کرنے کے حقوق اور غیر روسیوں کا یہ حق کہ وہ روس سے واپس جا سکیں گے، حقوق کو تسلیم کرتے ہیں۔(1)

1۔ لینن کے پاکستانی پرستار آج ہم سے بھی وہی وعدے کر رہے ہیں جو ان کے لیڈر نے اپنے ہم وطن روسیوں سے کیے تھے۔ جو انجام ان وعدوں کا ہو بعینہٖ وہی انجام پاکستانی اشتراکیوں کے مواعید کا بھی ہوگا۔

Marfat.com

لینن کے الفاظ میں حقیقی اقدام ایک ایسے گروہ کے ذریعے کیا گیا جو حیرت انگیز حد تک مختصر تھا۔ جس فوج نے اس کام میں حصہ لیا اس کی تعداد بیس ہزار سے بھی کم تھی اور ان میں سے بیشتر سرخ محافظ (Red Guards) کے وہ دستے تھے جنہیں ابھی بھرتی کیا گیا تھا اور اس حملہ اور فوج کے سادہ لوح سپاہیوں کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرادی گئی تھی کہ وہ آزادی اور مزدوروں کے حقوق کی بازیابی کے لیے جنگ کر رہے ہیں۔ معمولی سی جدوجہد اور قتل کی تھوڑی سی وارداتوں کے ساتھ بالشویکی شورش پسندوں نے پیٹروگراڈ کے ٹیلی فون اور تار گھر کے دفتروں، پولیس کے صدر دفتر، مشہور اخبارات اور چند اہم ناکوں پر قبضہ کرلیا۔ عبوری حکومت کی ہائی کمانڈ کو جو اس وقت قصر سرما (Winter Palace) میں موجود تھی، اپنے محاصرہ میں لے لیا۔ ہائی کمانڈ نے بڑی بہادری سے ان شورش پسندوں کا مقابلہ کیا۔ اس وقت ایوان حکومت کی حفاظت کے لیے صرف عورتوں کی ایک بٹالین ڈیوٹی پر تھی جنہوں نے دادِ شجاعت دیتے ہوئے اپنی جانیں قربان کر دیں۔ جنگی جہاز آرود (Aurora) نے دریا میں کھڑے ہو کر قصر حکومت پر بمباری کی۔ سرخ محافظ دستوں نے اس محل کرنسکی کا محاصرہ کرلیا اور چند دوسرے ارکان حکومت بالشویکوں کے محل پر قبضہ کرنے سے پہلے وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

زار کی بادشاہی کے خاتمہ پر روسی باشندے اپنی نمائندہ قومی حکومت قائم کرنے کے لیے قانون ساز اسمبلی کے انتخابات پر اپنی امیدیں لگائے بیٹھے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ اسمبلی ان کے لیے ایک جمہوری آئین منظور کرے گی۔

لینن اور اس کے پیروکار بیچ میں کود پڑے اور یہ پروپیگنڈہ کرنا شروع کر دیا کہ حقیقت میں وہی لوگ جمہوریت کے سچے دوست اور جمہوری آئین کو پاس کرنے کے لیے سب سیاسی پارٹیوں سے زیادہ مخلص ہیں۔ ان سے جب یہ پوچھا جاتا کہ اگر تم انتخابات میں ہار گئے تو تمہارا ردعمل کیا ہوگا؟ تو وہ قسمیں اٹھا اٹھا کر کہتے کہ ہم عوام کے فیصلے کا احترام کریں گے۔ جمہوری حکومت کے انتخاب کے متعلق پراودا اخبار نے صاف طور پر لکھا تھا کہ ہم عوام

کے فیصلے کو ہرگز نظرانداز نہیں کریں گے، اگرچہ ان کا فیصلہ ہماری رائے کے خلاف بھی ہو۔

چنانچہ ۲۵ نومبر سے ۹ دسمبر ۱۹۱۷ء تک الیکشن ہوتے رہے۔ اگرچہ بیشتر ووٹ بالشویکوں کی نگرانی میں ڈالے گئے، بایں ہمہ ۳ کروڑ ساٹھ لاکھ ووٹوں میں سے صرف نوے لاکھ ووٹ لینن کو ملے، بقیہ دو کروڑ ستر لاکھ ووٹ مخالف پارٹیوں کو دیے گئے۔

قانون ساز اسمبلی معطل کر دی گئی

حسب ضابطہ ۱۸ جنوری 1918ء کو پیٹروگراڈ میں اسمبلی کا پہلا اجتماع ہونا قرار پایا تھا۔ اس روز مزدور اور کسان جوق در جوق شاداں و فرحاں اپنے اپنے پرچم لہراتے ہوئے جمہوریت زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگاتے ہوئے اسمبلی حال کے سامنے میدان میں جمع ہوئے تاکہ اپنی مسرت کے اظہار کے ساتھ ساتھ جمہوریت پر اپنے کامل اعتماد کا اعلان کریں۔

جب یہ غیر مسلح اور پرامن جلوس محل کے قریب پہنچا تو لینن کے غنڈ نے ان پر بے تحاشا فائرنگ شروع کر دی، ایک سو کے قریب آدمی مارے گئے، سینکڑوں زخمی ہوئے، باقی لوگ دہشت وسراسیمگی کے عالم میں وہاں سے بھاگ گئے۔

اس خونی حادثہ کے باوجود قانون ساز اسمبلی کے ارکان اسمبلی حال میں جمع ہوگئے، اسمبلی کی گیلریوں میں اوباش لوگ جو نشے میں دھت تھے، کثیر تعداد میں جمع ہوگئے۔ انہیں لینن کے فوجی دستوں نے وہاں داخل ہونے کی اجازت دی تھی۔ جب اسمبلی کی کارروائی شروع ہوئی تو ان بن بلائے مہمانوں نے قوم کے منتخب نمائندوں پر آوازے کسنے شروع کر دیے۔

اس اثناء میں لینن ان سیڑھیوں پر ٹہلتا اور مسکراتا رہا جو سپیکر کے پلیٹ فارم کی طرف جاتی تھیں۔ وہ ان غیر شریفانہ حرکات پر ان اوباشوں کی حوصلہ افزائی کرتا رہا اور شور وغوغا کرنے پر انہیں اکساتا رہا، حتیٰ کہ اسمبلی کے اجلاس کو مجبوراً ملتوی کرنا پڑا۔ اسمبلی کے وہ ارکان جو خوش فہم اور رجائی واقع ہوئے تھے دوسرے روز اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے تشریف لائے۔ جب وہاں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ ایوانِ حکومت کے سارے دروازے مقفل کر دیے گئے ہیں اور انہیں اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ اس کے بعد عوام کی منتخب شدہ

Marfat.com

اسمبلی کا اجلاس پھر کبھی منعقد نہ ہو سکا۔ اس طرح مٹھی بھر بالشویکوں نے عوامی انقلاب کو ناکام بنا دیا اور جبر و تشدد اور مکر و فریب سے زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لی۔ لینن کے ساتھیوں نے جب اس سے یہ شکایت کی کہ تمہارے اس غیر جمہوری اقدام نے روس کو بدنام کر دیا ہے، تو اس نے صاف الفاظ میں کہا کہ میں روس کے منہ پر تھوکتا ہوں۔ عالمی انقلاب برپا کرنے کے لیے ہمارا اس مرحلہ سے گزرنا ناگزیر ہے۔

بغاوت اور سرخ خطرہ

بالشویکوں کے اس اقدام نے عوام میں شدید مخالفت کی ایک لہر دوڑا دی جو آخر کار طویل خانہ جنگی میں بدل گئی۔ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۱ء تک روس عجیب قسم کی نظریاتی کشمکش اور جنگ و جدل کی آماجگاہ بنا رہا۔ سفید فوجیں زار کی شہنشاہیت کو بحال کرنے کے لیے برسر پیکار ہو گئیں اور کچھ فوجیں یوکرائن، جارجیا، کاکیشیا کی آزادی حاصل کرنے کے لیے مصروف ہو گئیں۔

وسط ایشیا کی مسلم ریاستیں بھی اپنے آپ کو اشتراکی غلامی سے نجات دلانے کے لیے میدان میں نکل آئیں۔ ملک کی غالب اکثریت جمہوری دستور کی بحالی کے لیے برسر پیکار ہو گئی۔ باہم دست بہ گریباں جماعتیں سب کی سب کمیونسٹوں کے مخالف تھیں، لیکن باہمی رقابتیں اور عداوتیں اتنی شدید تھیں کہ وہ اشتراکیت کے خطرے کا مؤثر مقابلہ کرنے کے لیے متحدہ محاذ نہ بنا سکیں۔ (1)

انجام کار بالشویک ان تمام جماعتوں کو شکست دے کر تہس نہس کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ سرخ فوج نے ٹراٹسکی کی قیادت میں دوسری روسی فوجوں کی کمر ہمت توڑ ڈالی اور عوام کی بغاوتوں کو سرخ تشدد نے کچل دیا۔ ٹراٹسکی لکھتا ہے کہ لینن ہر موقع پر یہ بات ہمارے ذہن میں ٹھونستا رہتا تھا کہ ابتدا میں اس قسم کا تشدد اشتراکی انقلاب کو کامیابی سے ہمکنار

1۔ پاکستان کے موجودہ حالات کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ بعینہ یہی صورت حال یہاں بھی پیدا ہو چکی ہے۔ خدا تعالیٰ اس کے انجام بد سے بچائے۔

Marfat.com

کرنے کے لیے از حد ضروری ہے۔ لینن نے ایک خفیہ پولیس چیکا (Chekka) کے نام سے قائم کر دی جس نے روس کے پژمردہ جسم پر اپنی غلامی کی مہر ثبت کر دی۔

لینن اور ٹراٹسکی نے اپنی ساری توجہ بائیں بازو کی جماعتوں کو تباہ و برباد کرنے پر مرکوز کر دی، کیونکہ یہی عنصر ان کے مقاصد کے لیے دنیا بھر کے بادشاہوں سے زیادہ خطرناک تھا۔ چند دنوں میں ہی ذہین انقلاب پسندوں، جمہوریت پر عقیدہ رکھنے والوں اور دانشوروں سے ملک کے قید خانے بھر دیے گئے۔ حکومت کے خلاف مخالفت کی رَد عوام میں جوں جوں شدت اختیار کرتی گئی حکومت نے بھی خونریزی کا بازار گرم کر دیا۔ مجرموں کے بجائے بے گناہوں کا قتل عام شروع ہو گیا تا کہ ان لوگوں سے انتقام لیا جائے۔ دس آدمیوں میں سے ایک آدمی کو گولی ماردی جائے گی، خواہ وہ مجرم ہو یا بے گناہ، لیکن یہ نسبت مقررہ حد سے بڑھ گئی۔ قید و بند اور موت کی سزاؤں کے علاوہ لینن نے اپنے مخالفین کے لیے جبری محنت اور بے گار کیمپوں کی سکیم کا آغاز کر دیا اور ان کیمپوں میں ان بے گناہ لوگوں کو بھی دھکیلا جانے لگا جن کے متعلق یہ وہم کیا جا سکتا تھا کہ وہ آگے چل کر اشتراکی نظام کی مخالفت کریں گے۔

ماسکو اور پیٹر وگراڈ کے علاوہ دوسرے شہروں میں چھوٹے لینن اپنے لیڈر کی نقل کرنے لگے۔ چنانچہ برائینگ (Bryansk) میں شراب کی سزا موت مقرر کر دی گئی۔ وی آٹکا (Viatka) میں جو شخص آٹھ بجے شب کے بعد گھر سے باہر نکلتا اسے بھی موت کی سزا دی جاتی۔ بعض علاقوں میں چوری کی سزا موت قرار دی گئی۔

گریگوری زینوف نے پیٹر وگراڈ میں اعلان کیا کہ دس کروڑ روسیوں میں سے ہمیں نو کروڑ کو اپنا ہمنوا بنانا چاہیے۔ باقی ایک کروڑ جو، ان نظریات کو قبول نہ کریں گے ان کو نیست و نابود کر دیا جائے گا۔ تاریخ کے صفحات اس امر کے شاہد ہیں کہ ہلاک ہونے والوں کی تعداد اس کے مجوزہ اندازہ سے بہت زیادہ .... بھی ان لوگوں میں سے تھا، جنہیں مجرم قرار دے کر گولی سے اڑا دیا گیا۔

Marfat.com

۳۰ اگست ۱۹۱۸ء کو جب ڈورا کیپلن (Dorakaplan)، ایک مشہور سماجی انقلاب پرست نے لینن پر گولی چلا کر اس الزام میں اسے زخمی کر دیا کہ وہ جمہوری انقلاب کا غدار ہے، تو بالشویکوں کی آتش غضب بھڑک اٹھی اور انہوں نے خونریزی کی انتہا کر دی۔ اس کا انتقام لینے کے لیے پانچ سو قیدیوں کو گولی سے اڑا دیا گیا۔ پانچ سو بارہ آدمی جو بطورِ یرغمال پیٹروگراڈ میں نظر بند تھے ان کو قتل کر دیا گیا۔ ماسکو سے ایک ٹیلی گرام ملک کی تمام سوویت کونسلوں کو بھیجا گیا، جس میں یہ ہدایت کی گئی تھی کہ دشمن کو ختم کرنے میں کمزوری کو ترک کر دو۔ دشمن کو ختم کرنے میں ہر قسم کے احساسات کو نظر انداز کر دو۔ چیکا خفیہ پولیس کے ایک افسر کامریڈ لیٹس (Latsis) نے اعلان کر دیا کہ متوسط طبقہ کو سرے سے ختم کر دو۔ ان کو مجرم ثابت کرنے کے لیے کسی دلیل کا انتظار نہ کرو۔

اس جور و جفا کے باوجود عوام کی طرف سے مقابلہ جاری رہا۔ کوئی کتاب ان صدہا بغاتوں کی تفصیلات نہیں بتا سکتی جو ان سالوں میں روس کے تمام علاقوں میں برپا ہوئیں، لیکن سب سے زیادہ خطرناک بغاوت جزیرہ کرانسٹڈٹ (Kronstadt) کی تھی۔ کرانسٹڈٹ پیٹروگراڈ کے قریب واقع ہے اور یہاں روسی بحریہ کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ یہ لوگ ابتداء میں بالشویکوں کی تحریک کے حامی تھے۔ جونہی سرخ تشدد نے اپنے رخ سے نقاب الٹا اور ظلم و تشدد کا بازار گرم کیا تو ان کی آنکھیں کھلیں اور کف افسوس ملنے لگے۔ آخر کار ان کے صبر و ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ یکم مارچ ۱۹۲۱ء کو بحری فوج کے پندرہ ہزار ملاحوں اور مزدوروں کا ایک اجتماع ہوا، جس میں اشتراکیوں کے مظالم کی مذمت کی گئی۔ اس میں کہا گیا کہ موجودہ حکومت مزدوروں اور کسانوں کی نمائندہ حکومت نہیں ہے۔ اس لیے ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ از سر نو انتخابات کرائے جائیں اور خفیہ ووٹ ڈالنے کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ چار روز بعد ان ملاحوں نے ایک کمیٹی تشکیل دی جو زیادہ تر کمیونسٹوں پر مشتمل تھی۔ جس نے اس قصبہ، بحری فوج کے دفاتر اور وہاں موجود تمام جنگی جہازوں پر قبضہ کر لیا۔ ٹراٹسکی نے لینن کی اجازت سے ان ملاحوں کو بڑے سخت الفاظ میں الٹی میٹم دیا کہ وہ غیر

Marfat.com

مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیں ورنہ انہیں تیتر بٹیر کی طرح گولی کا نشانہ بنا دیا جائے گا۔

جب اس کمیٹی نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا تو ٹراٹسکی نے جنرل مکھل کو ان پر ہلہ بولنے کا حکم دیا۔ جب پیٹروگراڈ کے مزدوروں کو پتہ چلا تو وہ سمندر کی برفانی منجمد سطح کو عبور کر کے اپنے ملاح بھائیوں کے ساتھ آملے۔ جنرل مکھل ساٹھ ہزار منتخب شدہ لشکر کے ساتھ ان پر حملہ آور ہوا اور اس لشکر کے عقب میں خفیہ پولیس (چیکا) کے دستے متعین تھے جنہیں حکم دیا گیا تھا کہ اگر کوئی سپاہی ان بہادر ملاحوں پر حملہ کرنے میں پس و پیش کرے تو اسے فوراً گولی مار دی جائے۔ زمینی محاصرہ کے ساتھ ساتھ ہوائی جہازوں سے بمباری کی گئی اور توپوں کے دہانے ان پر گولے برسانے لگے۔ ان ملاحوں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ جب سرخ فوج نے پیش قدمی کی تو کئی مقامات پر برف کی تہہ ٹوٹ جانے سے سینکڑوں فوجی ڈوب کر ہلاک ہو گئے لیکن یہ حملہ کامیاب رہا اور سرخ فوجوں نے اس جزیرہ پر قبضہ کر لیا۔

فاتح جرنیل نے خود تسلیم کیا کہ قتل و خونریزی کا ایسا ہولناک منظر اس نے عمر بھر کبھی نہیں دیکھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ یہ جنگ نہیں تھی بلکہ ایک آتش فشاں پہاڑ پھٹ گیا تھا۔ ملاح وحشی درندوں کی طرح ہمارے ساتھ لڑتے۔ مجھے یہ راز اب تک معلوم نہیں ہوا کہ اس غیظ و غضب کی وجہ کیا تھی؟ ہمیں ہر گھر پر قبضہ کرنے کے لیے جنگ لڑنی پڑی۔ جنرل مذکور نے ۱۷ مارچ کو ٹراٹسکی کو اطلاع دی کہ اس کے حکم کی تعمیل کر دی گئی ہے۔ اٹھارہ ہزار باغی قتل کر دیے گئے ہیں اور سینکڑوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ انہیں بھی امن بحال کرنے کے لیے گولی سے اڑا دیا گیا۔

ملاحوں کے اس سفاکانہ قتل عام نے روسی عوام اور اشتراکی حکومت کے درمیان آخری رابطہ کو بھی منقطع کر دیا۔ اشتراکی حکومت کے قدم جم گئے۔ اس طرح روس کے بسنے والے ایک ایسی قوم بن گئے جنہیں اندرونی دشمنی نے اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا تھا۔

اعداد و شمار کی شعبدہ بازی

لینن کو اب ایک اور خطرناک بحران سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ بحران قحط کی شکل میں نمودار

Marfat.com

ہوا۔ خشک سالی، حکومت کی طرف سے زرعی پیداوار کی ضبطی اور دیگر عوامل نے روسی کسان کو بالکل بے بس کر دیا۔ بھوک، افلاس، بخار کی وبا ہر طرف پھیل گئی۔ شب و روز ڈاکہ زنی کی وارداتیں ہوتی رہتی تھیں۔ لاکھوں بچے جنگلی حیوانوں کی طرح مارے مارے پھرتے تھے جن کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ لکھوکھہا آدمی لقمۂ اجل بن گئے۔ قحط کی شدت میں آئے دن اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ لینن نے اپنی حکومت کو تباہی سے بچانے کے لیے مجبوراً چند رعائتوں کا اعلان کیا۔ ایک نئی معاشی پالیسی اختیار کی گئی جس کے ذریعے زراعت و صنعت کے میدانوں میں نجی کاروبار کی اجازت دی گئی۔ یہ پسپائی صرف اقتصادی پہلو سے تھی۔ سیاسی طور پر گورنمنٹ کی گرفت پہلے کی طرح مضبوط تھی۔ بڑی صنعتوں، ذرائع مواصلات، بینک بیرونی تجارت کا نظم و نسق حکومت کے ہاتھ ہی میں رہا۔

اس نسبتاً نرم پالیسی کی وجہ سے اقتصادی طور پر بڑا اچھا اثر ہوا۔ آناً فاناً شہروں کی گلیوں میں ایسی دوکانیں نمودار ہوگئیں جو طرح طرح کے مال سے بھری ہوئی تھیں۔ زراعت کو بھی بڑی تقویت ملی اور زرعی پیداوار میں غیر متوقع اضافہ ہوا۔ ۱۹۲۸ء تک ملک کی اقتصادی حالت قبل از جنگ کے برابر ہوگئی، لیکن اس وقت تک لینن مر چکا تھا۔ ٹراٹسکی کو ملک بدر کر دیا گیا تھا اور سٹالن سارے روس کا واحد مالک بن بیٹھا تھا۔

سٹالن نے اختیار سنبھالتے ہی اس پالیسی کو ختم کر دیا اور اقتصادی زندگی کی ساری سرگرمیوں کو حتی کہ ریڑھیوں پر ہونے والے کاروبار کو بھی حکومت کے کنٹرول میں لے لیا گیا۔ پھر اس نے پانچ سالہ منصوبہ ۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۲ء کا اعلان کیا، تاکہ بھاری صنعتوں کے قیام اور اجتماعی زرعی سکیم پر عمل کیا جا سکے۔ اس طرح ایک بار پھر قوم کو تباہی اور بربادی کے گڑھے کی طرف دھکیل دیا گیا۔ دنیا میں آج تک کسی اقتصادی منصوبہ کی اتنی تشہیر اور اتنی تعریف نہیں کی گئی جتنی سٹالن کے پہلے پنجسالہ منصوبہ کو نصیب ہوئی۔ روس کے نصف صدی کے حالات کو جاننے کے لیے اس منصوبہ کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینا ناگزیر ہے۔ یہ بتایا گیا تھا کہ اس منصوبہ کے بروئے کار آنے سے لوگوں کی روزمرہ کی ضروریات کی صنعت کو بڑا

Marfat.com

فروغ حاصل ہوگا۔ زرعی پیداوار بڑھے گی اور رہائش کی سہولتوں میں اضافہ ہوگا اور منصوبہ بندی کی ایجنسی گاسپلین (Gosplan) نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ روسیوں کا معیارِ زندگی اس منصوبے سے بہت بلند ہو جائے گا۔ روس کی کرنسی کی قوتِ خرید میں بیس فی صد اضافہ ہوگا اور ضروریاتِ زندگی کی قیمتوں میں چودہ فیصد کمی ہو جائے گی۔

ان سنہری وعدوں کا کیا حشر ہوا؟ اس کا علم سٹالن کی اس تقریر سے ہوتا ہے جو اس نے جولائی ۱۹۳۱ء میں کی۔ اس نے شکوہ کیا کہ مزدوروں کی پیداوار میں تیس یا چالیس فیصد کمی ہو گئی ہے۔ بہت سے مزدور اپنی نوکریوں کو چھوڑ کر تلاشِ روزگار میں دوسری جگہوں پر جا رہے ہیں۔ اس نے اعتراف کیا کہ جن منصوبوں کے متعلق یہ بتایا گیا کہ وہ پایۂ تکمیل تک پہنچ گئے ہیں یہ محض کاغذی کارروائی ہے۔ اس منصوبہ کی مدت کے اختتام سے اٹھارہ ماہ پیشتر سٹالن کے اپنے الفاظ میں حالات کی یہ تصویر تھی۔ اس کے باوجود جنوری ۱۹۳۳ء میں سٹالن نے یہ اعلان کر کے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا کہ اس کا پہلا پانچ سالہ منصوبہ ۹۳.۷ فیصد تک مکمل ہو گیا ہے۔

اس منصوبہ کے اعداد و شمار میں جس شعبدہ بازی سے کام لیا گیا ہے اس کی جرأت فقط اشتراکی حکومت ہی کر سکتی ہے۔ کروڑوں عورتوں کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ اپنے گھروں کی چار دیواری اور اپنی گھریلو ذمہ داریوں کو چھوڑ کر مردوں کے دوش بدوش سڑکوں کے بنانے، کوئلے کی کانوں میں کام کرنے اور بھاری بھرکم عمارتوں کی تعمیر میں مرد مزدوروں کی طرح کام کریں اور اس المیہ کو اس خوشنما عنوان سے ان لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا کہ ہم نے عورت کو مردوں کے برابر حقوق دے دیے ہیں۔

اگر بعض چیزوں کی پیدائش میں اضافہ ہوا تو اس کے ساتھ ساتھ مصارفِ زندگی بھی کئی گنا بڑھ گئے۔ تنخواہیں کم ہو گئیں، بھوک ہر طرف پھیل گئی، استعمال کی چیزیں نایاب ہو گئیں۔ ان مضر نتائج کے باوجود اس منصوبہ کو انتہائی طور پر کامیاب منصوبہ کہا گیا۔ ان سالوں میں دنیا کے دوسرے ممالک عالمی معاشی بحران کا شکار تھے اور ایک مایوس کن فضا ہر طرف چھائی ہوئی

تھی۔ ان حالات میں سٹالن اور اس کے رفقاء کی لاف زنیوں نے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی اور کئی ترقی یافتہ ممالک اشتراکی نظام میں اپنی نجات یقین کرنے لگے۔

بیگار کیمپ

اگرچہ جبری بیگار کیمپوں کا آغاز لینن کی زندگی میں ہو گیا تھا، لیکن سٹالن کے پنجسالہ منصوبہ کے زمانہ میں یہ سکیم اپنے شباب کو پہنچ گئی تھی۔ ان کیمپوں میں جن بدنصیب لوگوں کو جبری مزدوری کے لیے بھیجا جاتا تھا ان کی حالت غلاموں سے بھی بدرجہا بدتر تھی۔ غلاموں کے مالک ان کے لباس اور ان کی خوراک کا بہر حال خیال رکھا کرتے ہیں۔ بسا اوقات وہ شادیاں کر کے اپنے گھر بھی بسا لیتے ہیں، لیکن ان بدنصیب لوگوں کے حصے میں بھوک اور بیماری کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ غلام بھی تھے اور ملک سے غداری کے مجرم بھی۔ سٹالن کی حکومت ان کے علاج اور خوراک پر روپیہ خرچ کرنے سے اس چیز کو ارزاں سمجھتی تھی کہ انہیں یوں ہی مرنے دیا جائے اور ان کی بجائے روسی شہریوں کو گرفتار کر کے ان کیمپوں میں لایا جائے اور بھوک پیاس کے باوجود جتنا عرصہ ان کی جسمانی قوت کام کر سکتی ہے اس سے کام لیا جائے۔ جب ان کی صحت اور قوت جواب دینے لگے تو انہیں بھی اپنے پیشرووں کی طرح تڑپ تڑپ کر مرنے دیا جائے۔ روس کا ہر شہری اس خطرہ سے لرزہ براندام رہا کرتا تھا کہ کسی وقت بھی اسے پکڑ کر سائبیریا کے سنسان برفستانوں کی طرف روانہ کیا جا سکتا ہے۔

مذہب کی بیخ کنی

مذہب کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کے لیے پانچ سالہ منصوبہ تیار کیا گیا۔ مسلمانوں کے علماء، عیسائیوں کے پادریوں اور یہودیوں کے ربیلن سے ان بیگار کیمپوں کو بھر دیا گیا۔ لینن نے اگرچہ پرائیویٹ کاروبار کی اجازت دی تھی، لیکن اب نجی کاروبار کو جرم قرار دے دیا گیا اور وہ لکھوکھہا روسی جو چھوٹے پیمانے پر دوکانداری، دستکاری یا کوئی اور کاروبار کیا کرتے تھے انہیں اپنی ملکیتوں سے محروم کر دیا گیا۔ انہیں اپنے گھروں سے نکال دیا گیا اور ان میں سے اکثر لوگوں کو جہازوں میں بھر کر بیگار کیمپوں میں بھیج دیا گیا۔ وہ لوگ جو اس انقلاب

Marfat.com

سے پہلے تجارت کیا کرتے تھے یا اپنے کارخانوں میں لوگوں کو ملازم رکھا کرتے تھے وہ بھی ایک فرمان کے ذریعے مجرم قرار دیے گئے۔ انہیں بھی اپنے گھروں سے نکال دیا گیا۔ انہیں راشن کارڈ دینے سے بھی حکومت نے انکار کر دیا اور بھیک مانگنے اور مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ ایسے لوگوں کی اولاد کو بھی خوراک اور تعلیم کی سہولتوں سے یکسر محروم کر دیا گیا۔ اگر کوئی شخص ملازمت کے لیے یا پارٹی کا ممبر بننے کے لیے یا تعلیم حاصل کرنے کے لیے یا صرف زندہ رہنے کے لیے درخواست دیتا تو سب سے پہلے اس سے یہ پوچھا جاتا کہ تمہارے والدین کون تھے؟

اگرچہ اس وقت روس کو کاروبار میں مہارت رکھنے والے لوگوں کی ضرورت تھی، لیکن ان تجربہ کار، ذہین لوگوں کے خلاف بڑی سفاکانہ مہم شروع کر دی گئی۔ انجینئر، ماہر کاریگر، دوا ساز خاص طور پر ہدف ستم بنائے گئے۔ انشاء پردازوں، فنونِ لطیفہ کے ماہروں، معلموں اور مؤرخوں کے طبقہ کی بار بار تطہیر کی جاتی اور جو لوگ ان کی منشا کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کے لیے تیار نہ ہوتے ان کو ختم کر دیا جاتا۔ اپنے ملک کے ماہرین کے قتل عام سے جو خلا پیدا ہوا، اس کو پر کرنے کے لیے کریملن نے مغربی ممالک سے ہزاروں کی تعداد میں ماہرین کو بلایا۔ باہر سے آنے والے ماہرین میں امریکنوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ جتنے بڑے بڑے کارخانے قائم کیے گئے، ان کے سارے اعلیٰ افسر بیرونی لوگ ہوتے اور روسی باشندے ان اجنبی افسروں کے ماتحت غلاموں کی طرح مزدوری کیا کرتے۔ اگر مغربی دنیا نے روس سے تعاون نہ کیا ہوتا تو یہ پانچ سالہ منصوبہ پیدائش سے پہلے ہی دم توڑ چکا ہوتا۔

بیرونی ممالک سے آئے ہوئے ماہرین کی تنخواہوں کی ادائیگی کا مسئلہ بڑی پیچیدگی اختیار کر گیا۔ اشتراکی حکومت کو بنکوں میں رکھے ہوئے سونے اور چاندی کے ذخائر کو استعمال کرنا پڑا۔ بڑی بڑی نادر عجائبات کو دیگر ممالک کے عجائب خانوں کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا۔ پرانے گرجوں میں جو تاریخی نوادرات تھے وہ چھین لیے گئے۔ سونا حاصل کرنے کے لیے ایک اور ذلیل حرکت کی گئی۔ وہ روسی باشندے جو دیگر ممالک میں رہائش

Marfat.com

پذیر تھے انہیں یہ کہا گیا کہ اگر وہ روس میں رہنے والے اپنے رشتہ داروں کو رہا کرانا چاہتے ہیں، یعنی انہیں اپنے پاس بلانا چاہتے ہیں تو وہ بطورِ دیت بھاری رقمیں دوسرے ممالک کی کرنسی میں ادا کریں۔ بڑے شہروں میں خاص دکانیں کھولی گئیں، جہاں کھانے کی اشیاء اور دیگر نایاب چیزیں سونے، چاندی، جواہرات اور غیر ملکی کرنسی کے عوض فروخت کی جاتیں۔

ایک اور ظالمانہ قدم یہ اٹھایا گیا کہ جن لوگوں کے متعلق حکومت کو یہ پتہ چلا کہ ان کے رشتہ دار امریکہ یا یورپ میں سکونت پذیر ہیں، تو ان لوگوں کو مجبور کیا جاتا کہ وہ اپنے رشتہ داروں کو خط لکھ کر ان سے روپیہ طلب کریں۔ اشتراکی حکومت کی خفیہ پولیس ان لوگوں کو اپنی حراست میں لے لیتی اور انہیں ہر طرح کی اذیت پہنچاتی جن کے متعلق یہ گمان ہوتا کہ ان لوگوں کے پاس قیمتی چیزیں موجود ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنے زیورات، جواہرات حتی کہ چاندی کے چمچے تک بھی حکومت کو پیش کر کے اپنی جان چھڑاتے اور حکومت یہ پروپیگنڈہ کرتی کہ فلاں فلاں آدمی نے اپنی خوشی سے اپنے سونے چاندی کے زیورات وغیرہ حکومت کو پیش کر دیے ہیں۔ جن لوگوں کو اس طرح ہراساں کیا جاتا ان میں یونیورسٹیوں کے پروفیسر، سرونٹ گرلز فیکٹری کے مزدور، سبھی قسم کے لوگ ہوتے اور ہر شخص کو ایک بار نہیں متعدد بار اس ابتلاء سے گزرنا پڑتا۔

ستر ہزار گاؤں کا جہنم زار

سٹالن نے خود چرچل کو بتایا کہ اجتماعی زرعی سکیم کو کامیاب کرنے کے لیے جتنے آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا، ان کی تعداد دوسری جنگ عظیم میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد سے بھی زیادہ تھی۔ ۲۷ ستمبر ۱۹۲۹ء کو سٹالن نے ایک نعرہ تخلیق کیا کہ تمام متمول کسانوں کا Kalaks خاتمہ کر دو۔ اس کے بعد سٹالن نے خوشحال کسان کی تعریف کرتے ہوئے بتایا کہ ہر وہ کسان جو دو یا دو سے زیادہ گائیں رکھتا ہو وہ خوشحال ہے اور عملی طور پر اس نعرہ سے مراد یہ تھی کہ جو شخص اپنی زمین کا ٹکڑا اپنے پاس رکھنے پر مصر ہو اس کو ختم کر دیا جائے۔ یہ نعرہ ایک جابرانہ حکم تھا، جس کا مدعا لاکھوں مردوں، عورتوں اور بچوں کو کم از کم

Marfat.com

وقت میں خانماں برباد کر دینا تھا تاکہ دوسرے لوگ ان سے عبرت حاصل کریں اور اپنی زمینیں حکومت کے حوالے کر دیں۔ ستر ہزار گاؤں اس جہنم زار میں جھونک دیے گئے۔ کم از کم پچاس لاکھ افراد اپنی جائیدادوں سے محروم کر دیے گئے اور انہیں مویشیوں کی گاڑیوں میں بھوسے کی طرح بھر کر سائبیریا کے منجمد علاقوں میں یا وسطی ایشیاء کے غیر آباد ریگستانوں میں پہنچا دیا گیا۔ ان میں سے ہزاروں آدمی گرمی کی شدت، بھوک اور بیماری کے باعث راستے ہی میں لقمۂ اجل بن گئے اور ان وسیع ویرانوں میں پہنچنے والے بدنصیبوں پر کیا گزری؟ اس کے متعلق کسی کو کچھ خبر نہیں۔ ماں باپ سے محروم، ویران اور خستہ حال بچے انبوہ در انبوہ گلی کوچوں میں مارے مارے پھرتے تھے اور ان کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ اس ظلم وتشدد سے دیہاتی لوگ غصے سے بے قابو ہو کر مقابلے کے لیے اتر آئے۔ حکومت کی مسلح فوجوں کے سامنے لاٹھیاں کلہاڑیاں لے کر سینہ سپر ہو گئے۔ سرخ فوج کے خون آشام دستے اور خفیہ پولیس کو ان بغاوتوں کے فرو کرنے کے لیے فوراً موقع پر بھیج دیا جاتا۔ گاؤں کے باشندے اپنے گھروں کو اور غلہ کے گوداموں کو اپنے ہاتھوں سے آگ لگا دیتے، باغوں کے مالک اپنے پھل دار درختوں کو اکھاڑ کر پھینک دیتے۔ اجتماعی زرعی سکیم کو عملی جامہ پہنانے والے افسر اندھیرے میں نکلنے کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ ان افسروں کے ادنیٰ سے اشارے پر سینکڑوں بے گناہوں کو قتل کر دیا جاتا۔ عوامی ردعمل کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ لوگوں نے لاکھوں کی تعداد میں اپنے مویشی اپنے ہاتھوں سے مار ڈالے۔ وہ اپنے پیارے جانوروں کو حکومت کی تحویل میں دینے سے انہیں ذبح کرنا بہتر سمجھتے تھے۔ کسانوں کو اس حرکت سے باز رکھنے کے لیے حکومت کو یہ قانون جاری کرنا پڑا کہ جو شخص ایک سور یا بھیڑ کو مارے گا اس کو پھانسی کی سزا دی جائے گی۔

پانچ سالہ منصوبہ کی میعاد ختم ہونے سے قبل نصف سے زیادہ مویشی اور گھوڑے ختم کر دیے گئے۔ دو تہائی بھیڑیں اور بکریاں مار ڈالی گئیں۔ یہی حالت دوسرے جانوروں کی تھی۔ روس آج تک ان جانوروں کی وہ کمی پوری نہیں کر سکا۔ ۱۹۵۳ء میں خرد شیف نے

Marfat.com

بڑے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ ہمارے پاس ۱۹۲۸ء میں جتنی گائیں تھیں آج اس سے ۹۰ لاکھ کم گائیں روس میں موجود ہیں اور یہ کمی مویشیوں کے اس قتل عام سے پیدا ہوئی جو حکومت کی غیر دانشمندانہ پالیسی کے ردعمل میں کسانوں نے کیا۔ ۱۹۳۲ء میں قابل زراعت زمین کا ۸۰ فیصد حکومت کی اجتماعی سکیم کے مطابق زیر کاشت تھا۔ اسی موسم سرما میں اشتراکی دور کا دوسرا بدترین قحط شروع ہوا۔ اس قحط کو ابتداء میں مخفی رکھا گیا، لیکن آخر کار حکومت کو اس کا اعتراف کرنا پڑا۔

اس لحاظ سے یہ قحط اپنی نظیر نہیں رکھتا کہ حکومت نے اس کے سد باب کے لیے کوئی کوشش نہیں کی، بلکہ دانستہ اس کی تباہ کاریوں کے دائرہ کو وسیع ہونے دیا۔ تاکہ چار پانچ کروڑ باغیوں کو پوری سزا دی جا سکے اور ان کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا جا سکے۔ وہ کسان، جن کی زمینوں کو جبراً اجتماعی سکیم میں لے لیا گیا تھا، انہوں نے اس سکیم کو ناکام کرنے کے لیے ایک اور چال چلی۔ وہ صرف اتنا رقبہ کاشت کرتے جس سے ان کی ضروریات پوری ہو جاتیں۔ کریملن کے سامنے یہ صورت حال تھی۔ دیگر ممالک کی منڈیوں میں غلہ ارزاں تھا۔ چند لاکھ ڈالر کا غلہ خرید کر حکومت لوگوں کو اس تباہی سے بچا سکتی تھی، لیکن سٹالن نے اس آسان طریقہ کو چھوڑ کر ایک اور ظالمانہ رویہ اختیار کیا۔ اس نے یہ حکم دیا کہ جو کسان گورنمنٹ کی سکیم کو ناکام بنانے کے لیے کوشاں ہیں ان کے سارے غلہ پر قبضہ کر لیا جائے اور انہیں بھوک سے ایڑیاں رگڑتے مرجانے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ حکم ملتے ہی ایک بار پھر فوج، خفیہ پولیس اور کمیونسٹ پارٹی کے کارکنوں نے زرعی کھیتوں پر ہلہ بول دیا اور جتنا غلہ دستیاب ہو سکا اپنے ٹرکوں میں بھر لیا اور ان دیہاتیوں اور کسانوں کے لیے ایک دانہ تک پیچھے نہ چھوڑا۔ باغات کے سب پھل توڑ لیے۔ جتنے انڈے ہتھے چڑھے وہ بھی لے لیے۔ ۱۹۳۲ء کے آخر میں قحط کی تباہ کاریاں اپنے عروج پر تھیں۔ یوکرین اور کاکیشیا کے شہروں میں رات کو جو لوگ بھوک سے مرجاتے، صبح سویرے ان کی لاشیں ٹرکوں میں بھر کر ٹھکانے لگا دی جاتیں۔ وسط ایشیا کے شہروں میں سڑکوں کے کنارے پر قطار در قطار لاشے پڑے

Marfat.com

ہوتے اور جن علاقوں میں حالات اس سے بھی زیادہ سنگین تھے وہاں لوگ انسانوں کا گوشت کھانے پر مجبور ہوگئے۔

ان انسانیت سوز مظالم کا نتیجہ

غور طلب امر یہ ہے کہ انسانیت سوز مظالم سے کمیونسٹوں کو کیا ملا؟ زراعت کا ایک ایسا طریقہ جس پر کبھی عمل نہیں ہو سکا۔ اڑتیس سال تک اجتماعی کاشتکاری Collective Farm کے باوجود ابھی تک روسی حکومت اس قابل نہیں ہوئی کہ وہ اپنے باشندوں کو مناسب خوراک مہیا کر سکے۔ ان کی فی ایکڑ زرعی پیداوار تمام ترقی یافتہ ممالک سے کم ہے۔ روس جو کسی وقت غلہ برآمد کرنے والے ممالک میں سرفہرست تھا، اب غلہ درآمد کرتا ہے۔ ۱۹۶۵ء میں اشتراکی روس میں مزروعہ رقبہ امریکہ کے مزروعہ رقبہ سے ۷۵ فیصد زیادہ تھا اور اس پر کام کرنے والے کارکنوں کی تعداد چار گنا تھی۔ اس کے باوجود اس کی زرعی پیداوار امریکہ کی زرعی پیداوار کے نصف سے بھی کم تھی۔ ان کھیتوں میں کام کرنے والے مزدور کوئی دلچسپی نہیں لیتے بلکہ دانستہ نقصان پہنچاتے ہیں، جس بے ڈھنگے پن سے وہ کھیتوں میں کام کرتے ہیں، فصل کاٹنے میں جو تاخیر کی جاتی ہے، اناج کو منڈیوں میں پہنچانے میں جو غفلت اور بے پروائی برتی جاتی ہے اور زرعی سامان کو جس بے دردی سے استعمال کیا جاتا ہے اس پر روسی پریس ہر وقت کارکنوں کو لعنت ملامت کرتا رہتا ہے۔ سرکاری اندازے کے مطابق پچیس فیصد مصنوعی کھاد کھیتوں تک پہنچتی ہی نہیں، بلکہ ریلوے اسٹیشنوں پر پڑی پڑی پتھر بن جاتی ہے۔ خردشیف نے ایک مرتبہ خود کہا تھا کہ ہم جب فصل کاشت کرتے ہیں تو کیچڑ اور برف سے لت پت ایسے ڈنٹھل اٹھاتے ہیں جو گاہے نہیں جا سکتے۔ ۱۹۶۱ء میں خردشیف نے یہ الزام لگایا تھا کہ اس کے آبائی وطن یوکرائن میں نصف فصل کاٹنے سے پہلے ہی چرالی جاتی ہے اور لوٹ لی جاتی ہے۔ متعدد دیہات میں افسروں کو ایسے پہرہ دار مقرر کرنا پڑتے ہیں جو شب و روز کھیتوں کی رکھوالی کرتے ہیں اور کسان جب کھیتوں سے واپس گھر لوٹتے ہیں تو ان کی باقاعدہ تلاشی لی جاتی ہے۔

Marfat.com

زرعی پالیسی کی یہ ناکامی سارے اشتراکی ممالک میں یکساں ہے۔ مشرقی جرمنی، چیکوسلواکیہ، ہنگری، سرخ چین سب کا یہی حال ہے۔ جب یوگوسلاویہ اور پولینڈ میں کسانوں کو اجتماعی فارم چھوڑنے کی آزادی دی گئی تو تمام کسان ان فارموں کو چھوڑ کر چلے گئے اور اپنے نجی کھیتوں میں کام کرنے لگے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قلیل عرصہ میں زرعی پیداوار میں اضافہ ہو گیا۔ نجی اور اجتماعی زرعی نظاموں میں نتائج کے لحاظ سے جو تفاوت ہے اس کی حیرت انگیز مثال خود روس میں دیکھی جا سکتی ہے۔ سٹالن نے مجبور ہو کر اجتماعی فارموں پر کام کرنے والے کسانوں کو اجازت دی کہ وہ ایک گائے اور چند دوسرے جانور رکھ سکتے ہیں۔ اپنے گھر کے قریب چھ کنال رقبہ کاشت کر سکتے ہیں اور اس کی پیداوار کو آزاد منڈی میں آزاد نرخوں پر فروخت کر سکتے ہیں۔ یہ رعایت محدود وقت کے لیے دی گئی تھی، لیکن اس کے نتائج اتنے حوصلہ افزا اور خوش کن نکلے کہ وہ رعایت آج تک بحال ہے۔

نیو یارک یونیورسٹی کے پروفیسر ای ریمانڈ (E. Remond) نے کئی مرتبہ روس کا دورہ کیا، تاکہ وہ وہاں کی زرعی اقتصادیات کا بنظر غائر مطالعہ کرے۔ ایک دورے کے متعلق اس نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں قلمبند کیے ہیں: ''میں نے دیہات کے سامنے میلوں تک پھیلا ہوا وہ رقبہ دیکھا جہاں اجتماعی طرز پر کاشتکاری کی جاتی تھی۔ اس میں گھاس اور جڑی بوٹیاں اگی ہوئی تھیں۔ سوکھے اور بدمنظر کھیت تھے، لیکن ہر جھونپڑے کے آس پاس میں نے چھوٹے چھوٹے اور سرسبز و شاداب باغ دیکھے۔ یہ وہ چھوٹے ٹکڑے ہیں جن کے متعلق روسی حکومت نے لوگوں کو اجازت دی ہے کہ وہ انہیں اپنی مرضی سے کاشت کریں۔ اس کھیت کا ایک ایک انچ بڑی ہنرمندی سے استعمال کیا جاتا ہے۔ گھر کے سامنے صحن میں بھی طرح طرح کی سبزیاں کاشت کی جاتی ہیں۔ جو خالی زمین رہ جاتی ہے اسے اس طرح صاف ستھرا رکھا جاتا ہے گویا کسی نے اس پر جھاڑو پھیر دیا ہو۔ کسانوں کو اس چھوٹے سے ٹکڑے سے جو آمدن ہوتی ہے وہ ان اجتماعی کھیتوں پر سارا دن محنت کرنے کی مزدوری سے زیادہ ہے اور اگر یہ چھوٹے چھوٹے باغیچے نہ ہوتے تو روس میں فاقہ کشی کی

نوبت آجاتی''۔

۱۹۶۶ء میں حکومت کے اپنے اعداد وشمار کے مطابق ان پرائیویٹ کھیتوں کی آمدنی جو روس میں مزروعہ رقبہ کا صرف تین فیصد ہیں، مندرجہ ذیل ہے:

اناج	تیس فی صد
آلو	ساٹھ فی صد
سبزیاں	چالیس فی صد
گوشت	اڑسٹھ فی صد

ان واضح نتائج کے باوجود روس میں اجتماعی کاشت کاری کا نظام مسلط ہے اور اسی لیے اناج کی قلت ایک مستقل مسئلہ بن گئی ہے۔ مناسب تو یہ تھا کہ ان روشن حقائق اور واضح نتائج کے بعد لوگوں کو بڑے پیمانے پر نجی طور پر کاشت کرنے کی اجازت دے دی جاتی، لیکن روسی لیڈر یہ اجازت دینے کی جرأت نہیں کر سکتے، کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر زراعت کو آزاد کر دیا جائے تو پھر صنعت اور سیاسی زندگی کو صرف چند ہاتھوں میں باقی نہیں رکھا جاسکتا۔

ہٹلر کی سب سے بڑی غلطی

ربع صدی تک اشتراکی ڈکٹیٹر شپ روس کی نئی نسل کو ایک خوفناک قالب میں ڈھالتی رہی۔ یہ سیرت سازی کی ایک عظیم مہم تھی جس کے متعلق کمیونسٹ یہ دعوے کرتے تھے کہ وہ ایک نیا اشتراکی انسان پیدا کریں گے۔ جون ۱۹۴۱ء میں نازی فوجوں نے روس پر حملہ بول دیا اور روسی حکمرانوں کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ جس نئے اشتراکی انسان کی تخلیق کے منصوبے وہ بنا رہے تھے، اس میں ناکام ہو گئے ہیں۔ اس ہنگامی وقت میں یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ کریملن لوگوں کو اپنی کمیونسٹ سوسائٹی، اپنی اجتماعی زرعی پالیسی اور اجتماعی صنعت کے تحفظ کے لیے جہاد کرنے کی دعوت دے گا، لیکن پروپیگنڈے کی مشینری سے اس وقت سوشلزم اور کمیونزم کے الفاظ نکال دیے گئے۔ مارکس اور لینن کا نام بھی ترک کر دیا گیا۔ سارے اشتراکی نعرے نظر انداز کر دیے گئے اور لوگوں کو اپنے مادرِ وطن کے تحفظ کے نام پر جنگ کی دعوت

دی گئی۔ مزید مذہب، جسے غیر قانونی قرار دے دیا گیا تھا اس سے بھی پابندی ہٹا دی گئی۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے خلاف جو مہم زور و شور سے جاری تھی اس کو بھی ترک کر دیا گیا۔ گرجوں کی گھنٹیاں عرصہ دراز تک خاموش رہنے کے بعد پھر بجنے لگیں........ اس تبدیلی کی وجہ بالکل ظاہر تھی........ نازی حملہ کے پہلے لمحہ سے ہی کمیونزم کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ پندرہ سو میل لمبے محاذ پر جرمن فوجیں بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ روسی فوجیں پسپا ہو رہی تھیں اور ہتھیار ڈال رہی تھیں۔ لوگ اس کثرت سے قیدی بن رہے تھے اور روسی سپاہی اتنی تعداد میں یونٹوں کو چھوڑ رہے تھے کہ جرمنوں کے لیے ان کے ارد گرد خار دار تار لگانا بھی مشکل ہو گیا۔ پہلے چار مہینوں میں حملہ آوروں نے چالیس لاکھ روسی قیدی بنا لیے۔ پہلے ہلہ میں ہی نازیوں نے روس کی آبادی (جو فرانس کے کل رقبہ سے کئی گنا زیادہ رقبہ میں پھیلی ہوئی تھی) پر قبضہ کر لیا۔ روسی عوام اس لمحہ کے لیے ہر وقت دعائیں مانگا کرتے تھے، کیونکہ اشتراکی غلامی کے چنگل سے نجات کی صرف یہی ایک صورت تھی اور اسی خطرہ سے بچنے کے لیے سٹالن نے ہٹلر کے ساتھ معاہدہ کیا تھا، لیکن حقیقت حال سٹالن کے تمام اندازوں سے زیادہ خوفناک اور ہولناک تھی۔

ایک جرمن صحافی جرگن (Gergon)، جس نے مشرقی محاذ کے حالات بڑی تفصیل سے قلمبند کیے ہیں، لکھتا ہے کہ روسی خوشی سے دیوانے ہوئے گئے تھے اور ہر جگہ جرمن سپاہیوں کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کرتے تھے۔ قصبوں اور دیہات میں ہر جگہ نازی فوجوں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ سویلین اپنے آپ کو غیر جنگی خدمات کے لیے رضاکارانہ طور پر پیش کر رہے تھے۔ کئی شہروں میں انہوں نے لینن، سٹالن اور مارکس کی کتابوں کو نذرِ آتش کر دیا۔

لیکن روسیوں کی اس خوشی کی میعاد طویل ثابت نہ ہوئی۔ بہت جلد نازی فاتحین کی اصلی فطرت بے نقاب ہو گئی۔ انہوں نے روسیوں پر ظلم کی حد کر دی۔ ہمیشہ کے لیے انہیں اپنا غلام بنائے رکھنے کے منصوبے شروع کر دیے۔ جنگی قیدیوں کو شدید سردی کے موسم میں کھلے میدانوں میں جمع کر دیا جاتا۔ ان کو بھوکا پیاسا رکھا جاتا اور طرح طرح کی ناروا حرکتیں کی

Marfat.com

جاتیں۔ اس طرح بے شمار روسی قیدی لقمۂ اجل بن گئے اور لاکھوں روسیوں کو جبری مزدوری کے لیے جرمنی منتقل کر دیا گیا۔ یہ ہٹلر کی فاش غلطی تھی۔ اسی نے روسیوں کے دل میں حب الوطنی کی روح بیدار کر دی۔ جو کام سٹالن نہ کر سکا وہ نازی عاقبت نااندیشوں نے کر دکھایا۔ روسیوں کو جب یہ تلخ حقیقت معلوم ہو گئی کہ جرمن فوجیں انہیں بالشویکوں کی غلامی سے آزاد کرنے کے لیے نہیں بلکہ نازی ازم کا طوق ان کے گلے میں ڈالنے آئی ہیں تو ان کے رویہ میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہو گئی، جس نے حملہ آوروں کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ جنگ کے سالوں میں روسی حکومت نے یہ کہہ کر لوگوں کی حوصلہ افزائی کی کہ اب ماضی کا وحشت انگیز دور ختم ہو گیا اور اب حریت و آزادی کا عہد زریں شروع ہوگا، لیکن جونہی جنگ ختم ہوئی ڈکٹیٹر شپ کی گرفت اور زیادہ سخت ہو گئی۔ ہر محکمہ کی تطہیر کئی بار کی گئی۔ بیگار کیمپوں کی تعداد میں ہوش ربا اضافہ ہوا۔ پرانی دہشت انگیزی پوری سطوت سے واپس آ گئی اور ایک نیا پانچ سالہ منصوبہ سامنے رکھ دیا گیا۔

اقتصادی خوشحالی کے کھوکھلے نعرے

قطب شمالی کے قریب سائبیریا کی دلدلی برفانی زمین میں، جہاں برف کے ظالم طوفان ہر وقت حشر برپا کرتے رہتے ہیں، ایک ریلوے لائن ہے جو پانچ سو پچاس میل لمبی ہے۔ اس کا لوہا اب زنگ آلود ہو چکا ہے۔ اس کے سٹیشن، پل اور ملازمین کے رہائشی مکانات برف میں کھود کر بنائے گئے ہیں۔ روسی اخبارات اسے مردہ سڑک (Dead Road) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ نہ کبھی مکمل ہوئی اور نہ کبھی اسے استعمال کیا گیا۔ اس کے بنانے کا کام جنگی قیدیوں سے لیا گیا۔ اس علاقہ میں جہاں درجہ حرارت صفر سے ساٹھ درجے کم تھا، بڑی روح فرسا مشکلات میں یہ کام شروع کیا گیا۔ ساری لکڑی اور لوہا ہزارہا میل کی مسافت سے برفانی دریاؤں کے ذریعے لایا گیا۔ اس منصوبے کا آغاز کیونکر ہوا؟ یہ ایک دلچسپ بلکہ زہرہ گداز کہانی ہے۔ سٹالن کو یہ خبط سمایا کہ اگر قطب شمالی کے متوازی ایک ریلوے لائن قائم کر دی جائے تو شمالی بعید کی بحری تجارت میں بڑی ترقی ہوگی (کیونکہ وہاں

سارے سال میں صرف دو ماہ بحری جہاز چل سکتے ہیں۔ باقی دس مہینوں میں برف باری کی وجہ سے آمد و رفت معطل ہو کر رہ جاتی ہے)۔ چنانچہ ۱۹۴۹ء میں اس نے ریلوے لائن کے بچھانے کا حکم دے دیا۔ کسی کو سٹالن کے اس غلط فیصلے پر اعتراض کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور کام کئی سال تک شروع رہا۔ اگرچہ ماسکو والوں نے اسے فراموش کر دیا تھا۔ اس کام میں جو انسانی جانیں تلف ہوئیں اور مزدوروں پر رنج و الم کے جو پہاڑ ٹوٹے اس کا بیان کرنا آسان نہیں۔ سٹالن کی موت کے بعد ۱۹۵۳ء میں اس منصوبہ کو ختم کر دیا گیا۔ یہ مردہ سڑک اس انسانیت سوز، وحشیانہ، ظالمانہ طریقہ کار کی ایک کھلی ہوئی نشانی ہے جو اشتراکی نظام میں انسانوں کے ساتھ برتا جاتا ہے۔ آج دنیا میں روسی حکومت سب سے بڑی اجارہ دار ہے۔ روس کی ہر چھوٹی بڑی چیز اس کی ملکیت ہے۔ وہی تمام منصوبوں کا انتظام کرتی ہے۔ سرکاری اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ تیرہ لاکھ افسر انتظامی امور کی انجام دہی پر متعین ہیں، بلکہ اگر تفصیلات کو دیکھا جائے تو افسروں کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ بنتی ہے۔

روس بے شک آج ایک طاقتور صنعتی ملک بن گیا ہے، لیکن اس کے لیے اسے بڑی اذیت ناک قیمت ادا کرنا پڑی۔ اس کے باوجود صنعتی ترقی میں روسی ماہرین اقتصادیات کی رائے کے مطابق دنیا میں روس کا چودھواں نمبر ہے اور مغربی ماہرین کے نزدیک اس کا بیسواں نمبر ہے۔ ان پچاس سالوں میں کئی دوسری قوموں نے اس سے بھی زیادہ ترقی کی ہے اور صنعتی میدان میں بالا دستی حاصل کرنے کے لیے انہیں انسانیت پر ایسے مظالم توڑنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی جو روس میں توڑے گئے۔ پہلی جنگ عظیم اور اشتراکی انقلاب سے پہلے بھی روس ایک ترقی یافتہ صنعتی ملک تھا اور اگر اشتراکی نظام نہ آتا تب بھی وہ موجودہ حالت سے کئی گناہ زیادہ ترقی کر چکا ہوتا۔

سپٹنک کے چھوڑنے سے روس کی معجزانہ ترقی کے خیال کو تقویت پہنچتی ہے، لیکن اس کی مثال ایسی ہے جیسے قدیم مصر کے اہرام۔ اہرام مصر اس بات کی شہادت تو دیتے ہیں کہ مصر کے حکمران بڑے طاقتور اور جابر تھے، لیکن وہ یہ گواہی دینے سے قاصر ہیں کہ مصر کے عوام

بھی اس وقت خوشحال اور فارغ البال تھے۔

اس کے باوجود روسی مصنوعات کیفیت اور عمدہ کارکردگی کے لحاظ سے بہت ہی گھٹیا ہیں۔ چنانچہ روسی صنعت کے ایک ماہر جوزف اے لکھتے ہیں:

۱۔ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ روس امریکہ سے زیادہ مشینی آلات بناتا ہے (کیونکہ امریکہ پہلے ہی ایک انتہا کو پہنچ چکا ہے) لیکن جتنے مزدوران آلات کو بنانے پر کام کرتے ہیں ان سے ساڑھے تین گنا مزدوران کی مرمت میں مصروف رہتے ہیں۔

۲۔ برقی موٹریں پہلے سال ہی اپنے کارکردگی کے اوقات کا تیس چالیس فی صد مرمت میں خرچ کرتی ہیں۔

۳۔ روسی ٹرک وغیرہ میں سے تیس چالیس فیصدی بے کار کھڑے رہتے ہیں۔

۴۔ روسی ٹریکٹروں کی مرمت کا خرچ ہر سال ان کی قیمت کا ایک تہائی حصہ ہوا کرتا ہے۔

۱۹۶۷ء میں روس میں موٹروں کی پیداوار اتنی تھی جتنی ستاون سال پہلے ۱۹۱۰ء میں امریکہ کی۔ روس میں کاروں کی صنعت کا آغاز ۱۹۳۰ء میں ہوا اور وہ اس طرح کہ روسی حکومت نے فورڈ کی فیکٹری کو اس کے آلات سمیت خرید لیا اور اس کو چلانے کے لیے امریکی ماہرین کی خدمات حاصل کیں۔ تیس سال گزرنے کے بعد آج بھی روسی حکومت اس بات کا اعتراف کرتی ہے کہ وہ موٹر سازی کا جدید کارخانے کا نقشہ انہوں نے اٹلی کی فیٹ (Fiat) کمپنی سے بنوایا ہے اور اسی کمپنی کے ماہرین کو یہ کارخانہ لگانے کا کام سپرد کیا۔ روسی حکومت جاپان اور فرانس کی موٹر کمپنیوں سے بھی گفت و شنید کر رہی ہے۔ اگر مغربی ممالک صنعت کا بنیادی مواد اور ضروری ساز و سامان روس کو مہیا نہ کریں تو روس کے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ جائیں۔ خرد شیف اور اس کے بعد کوسیگن وغیرہ نے روسی صنعت کی خامیوں کا بارہا اعتراف کیا۔ ۱۹۶۵ء میں کوسیگن نے کہا کہ ہماری صنعتی ترقی کی رفتار بہت سست ہے۔ بسا اوقات ایک مشینری نصب کی جاتی ہے اور وہ عرصہ دراز تک بیکار پڑی رہتی ہے،

Marfat.com

یہاں تک کہ وہ زنگ آلود ہو جاتی ہے۔

روس کے ایک مشہور عالم پروفیسر ایبل نے ماسکو یونیورسٹی میں لیکچر دیتے ہوئے کہا کہ گزشتہ چھ سال سے ہماری معیشت میں 2/3 کمی واقع ہوئی ہے۔ زراعت میں 9/10 اور ہماری قومی آمدنی میں بھی بہت کمی ہوئی ہے۔ ہمارا پیداواری نظام تمام صنعتی ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں ناقص ہے۔ بیروزگاری میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ دیہات میں پچیس تیس فی صد تک اور بڑے شہروں میں آٹھ فی صد تک لوگ بیروزگار ہیں۔ گھر مہیا کرنے کی سکیموں پر کبھی عمل نہیں کیا جا سکا۔

اقتصادی میدان میں ناکامی کے باوجود اس چیز کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ روسیوں نے سامانِ حرب تیار کرنے میں بڑی ترقی کی ہے۔ انہوں نے قومی دفاع اور بھاری صنعتوں کو ہر چیز پر ترجیح دے رکھی ہے۔ بہترین دماغ صرف جنگی سامان بہتر سے بہتر بنانے پر وقف ہیں۔ روس کے ہوائی جہاز، ٹینک، میزائل بہت بہتر ہیں اور اسی وجہ سے صنعت کے دوسرے شعبوں میں روس نے خاطر خواہ ترقی نہیں کی۔

مزدور

دیکھنا یہ ہے کہ وہ مزدور جس کے نام پر یہ سارا ہنگامہ برپا کیا گیا اس کا کیا حال ہے؟ آپ وہاں کسی مزدور سے یہ سوال پوچھیے کہ تمہارا کیا حال ہے؟ وہ تمہیں ایک ہی جواب دے گا: یعنی آنے والے کل سے آج بہر حال بہتر ہے۔ ایک فیکٹری کے مزدور کی اوسط آمدنی پینسٹھ روبل ماہوار ہے، لیکن لاکھوں مزدور ایسے ہیں جن کی کل ماہوار آمدنی چالیس پینتالیس روبل ہے اور کسانوں کی ماہوار آمدنی جو مزدور طبقے کا ایک بہت بڑا حصہ ہیں، چالیس روبل سے بھی کم ہے۔ اب اگر آپ روبل کی قوت خرید کا اندازہ لگانا چاہیں تو ماسکو کی بہت بڑی فرم گم اینڈ زم کی قیمتوں پر ایک نظر ڈالیے۔ کپڑوں کے ایک جوڑے کی قیمت ۱۹۱ ڈالر، عورتوں کے جوتوں کا ایک جوڑا ۲۴ ڈالر، ایک چھوٹا ریڈیو ۲۴ ڈالر، ایک درمیانہ درجہ کا فریج ۴۰۰ روبل میں ملتا ہے۔ یعنی متوسط مزدور کی چار ماہ کی تنخواہ۔ ولگا کار

کی قیمت پانچ ہزار چھ سو روبل ہے۔ یہ رقم پہلے جمع کرانا پڑتی ہے اور سالہا سال کے انتظار کے بعد کہیں باری آتی ہے۔ مزدوروں میں پچاس فی صد عورتیں ہیں، کیونکہ خاندان کا مرد سربراہ اپنے خاندان کے تمام افراد کی کفالت نہیں کر سکتا۔ روس میں عورتوں کو مردوں کے مقابلہ میں مساویانہ حقوق دینے کا بہت پروپیگنڈا کیا جاتا ہے، لیکن یہ مساوات صرف اس امر میں ہے کہ عورتیں بھی مزدوری کرتی ہیں۔ بھاری بھرکم لکڑی کی گیلیاں اٹھانا، خندقیں کھودنا، گلیوں میں جھاڑو دینا اور فولاد کی ملوں کی بھٹیوں میں آگ جھونکنا، یہ وہ کام ہیں جو روس میں صرف عورتوں کے لیے مخصوص ہیں۔ انگلینڈ میں ۱۸۴۲ء میں عورتوں کو کوئلے کی کانوں میں کام کرنے سے روک دیا گیا تھا، لیکن روس میں آج بھی عورتیں یہ کٹھن کام کرتی ہیں اور روسی حکومت اس کو بڑے فخر سے پیش کرتی ہے۔ رہائش کی سہولتیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ لاکھوں مزدور اپنے کارخانوں کے قریب ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں میں گزر اوقات کرتے ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں رہائشی سہولتیں مہیا کرنے کا جو عظیم منصوبہ بنایا گیا اس کے مطابق ایک خاندان کے لیے ایک کمرہ اور تین خاندانوں کے لیے ایک باورچی خانہ اور وہ بھی بڑی خستہ حالت میں مہیا کیے جا سکے، لیکن یہ کمرہ بھی آسانی سے نہیں ملتا، بلکہ مزدوروں کو اس ایک کمرے کے لیے پانچ پانچ سال انتظار کرنا پڑتا ہے۔ رہائشی سہولتوں کے ناکافی ہونے کی وجہ سے باہمی تنازعات ہر روز کا معمول ہیں۔ بات بات پر پڑوسی پڑوسی سے الجھتا ہے۔ میاں بیوی کے درمیان کشیدگی بڑھتی ہے۔ طلاقیں کثرت سے وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ لطف یہ ہے کہ مطلقہ عورت دوسرا امکان نہ ملنے کی وجہ سے اپنے طلاق دینے والے خاوند کے کمرے میں عرصہ دراز تک رہنے پر مجبور ہوتی ہے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے نئے خاوند کو وہیں لے آتی ہے اور درمیان میں کپڑے کا ایک پردہ لٹکایا جاتا ہے۔ ضروریاتِ زندگی کی شدید قلت ہے۔ معمولی معمولی چیزوں کے لیے عرصہ دراز تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔ راشن کارڈ بنوانے کے لیے کئی کئی دن دفتروں کے چکر کاٹنے پڑتے ہیں۔ (واضح ہو کہ روس میں ضروریاتِ زندگی صرف راشن کارڈ کے ذریعے ہی دستیاب ہو سکتی ہیں)۔ تند

مزاج افسروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور لمبی لمبی قطاریں بنا کر پہروں کھڑا رہنا پڑتا ہے۔ کوئی شخص اجازت کے بغیر اپنا پیشہ تبدیل نہیں کر سکتا۔ اپنی رہائش نہیں بدل سکتا اور دوسرے شہر میں (۷۲) بہتر گھنٹے سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتا۔ مذہبی لوگ اپنی اولاد کو بڑی رازداری سے اللہ تعالیٰ کے متعلق کچھ بتاتے ہیں اور ہر وقت یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ ان کی مخبری نہ کر دی جائے۔ لوگ دروازے بند کر کے مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ سٹالن کی لڑکی سوتیلانہ جو اپنے باپ کے بنائے ہوئے ''فردوس بریں'' سے بھاگ آئی ہے، اس نے اپنے فرار کی وجہ یہ بتائی کہ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اسے حکومت کی ملکیت تصور کیا جائے اور اس کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جائے جو مالک اپنی مملوکہ چیز کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ اس ایک جملہ میں اس نے اپنے ہم وطن روسیوں کی تکالیف اور تذلیل کا قصہ بیان کر دیا ہے۔

اصلاحات

حالات کی سنگینی کے پیش نظر کریملن نے اب کھلے طور پر ان مشکلات کا حل تلاش کرنا شروع کر دیا ہے۔ اب وہاں نفع، سود، کرایہ، منڈی وغیرہ کے الفاظ عام استعمال ہونے لگے ہیں۔ اب وہاں آزادانہ کاروبار کے حق میں آوازیں سنائی دینے لگی ہیں تاکہ کھلے مقابلہ سے مصنوعات کی حالت بہتر بنائی جاسکے اور قیمتوں میں کمی کی جاسکے۔

روس میں طبقات

صرف حقائق سے بے خبر آدمی ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ روسی معاشرہ میں طبقات کا وجود نہیں۔ سٹالن نے ۱۹۳۰ء میں یہ جھوٹ بولا تھا جو آج بھی ایک معیاری جھوٹ کی طرح جوں کا توں قائم ہے کہ روسی معاشرہ میں طبقات کا کوئی وجود نہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت روسی معاشرہ بہت ہی امیر اور بہت ہی غریب، دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ کہیں مراعات ہی مراعات ہیں اور کہیں محرومیاں ہیں محرومیاں۔ اونچے درجے کے افسر اور کمپنیوں کے مینیجر بھاری بھر کم تنخواہیں وصول کرتے ہیں اور انہیں بہترین سہولتیں میسر ہیں۔ ان کے مکانات بھی بڑے خوبصورت اور دلکش ہوتے ہیں اور ان کے پہلو میں غریبوں کی

Marfat.com

وہی تاریک، تنگ اور غلیظ کوٹھڑیاں نظر آتی ہیں۔ اعلیٰ افسر اپنی چھٹیاں منانے کے لیے اعلیٰ درجے کی تفریح گاہوں میں جاتے ہیں، جہاں صرف چند ایسے مزدور جا سکتے ہیں، جنہوں نے کوئی اہم کارنامہ انجام دیا ہو۔ فیکٹریوں اور دوسرے اداروں میں کھانے کے کمرے بھی مختلف درجوں میں منقسم ہوتے ہیں۔ تیسرے درجے کے طعام خانے عام لوگوں اور مزدوروں کے لیے مخصوص ہیں۔ ریلوے گاڑیوں میں بھی تین درجے ہیں۔ بہترین ہسپتال بہترین لوگوں کے لیے وقف ہیں۔ طبقات سے پاک سوسائٹی تو وہ ہوتی ہے جو سیاسی، اقتصادی اور سماجی لحاظ سے مساوی ہو، لیکن وہاں یہ چیزیں مفقود ہیں۔

یوگوسلاویہ کا سابق وائس پریذیڈنٹ جسے بعد میں معزول کر کے نظر بند کر دیا گیا، لکھتا ہے:

"قانونی طور پر تو ساری جائیداد قومی ملکیت ہے، لیکن حقیقت میں اس کا فائدہ صرف ایک گروہ حاصل کرتا ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جنہیں وہ قوت اور اختیار حاصل ہے جس کی مثال، تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ امیروں کے لڑکوں کو بہترین تعلیمی سہولتیں میسر ہیں اور سیاسی اور معاشی مفاد ان کے لیے وقف ہیں"۔

اعلیٰ درجے اور کم تر درجے میں جو تفاوت ہے، وہ حکومت کا ایک راز ہے، جو افشا نہیں کیا جا سکتا، تا کہ لوگ شور نہ مچائیں۔ اعلیٰ درجے کے لوگوں کی خوشحالی، بہترین بنگلے، کاریں اور دیگر سہولتیں، جو انہیں نصیب ہیں، عام لوگ ان کا تصور تک نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہم یہ پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ وہ اشتراکی انسان کہاں ہے جس کی تخلیق کے لیے مظالم کا ایک طوفان برپا کیا گیا۔ عام آدمی تو ہمیں انتہائی پستی میں بلکتا ہوا یا کسی بیگار کیمپ یا کسی سنسان علاقہ میں جلاوطنی کی زندگی بسر کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ ان میں مساوات صرف اس امر میں ہے کہ سب غلام ہیں اور اعلیٰ افسروں کے قبضے میں ہیں اور بلاشبہ سارے غلام یکساں اور مساوی ہوا کرتے ہیں۔

ایک دھوکہ

عام طور پر جو لوگ روس میں سیر و سیاحت کے لیے جاتے ہیں وہ یہ تاثر لے کر آتے ہیں

Marfat.com

کہ وہاں ہر طرح کا امن وامان ہے اور کسی قسم کی بے چینی کے آثار وہاں نظر نہیں آتے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہاں جاسوسی کا اتنا ہمہ گیر نظام کارفرما ہے کہ ہر شخص ہر وقت ہراساں رہتا ہے کہ کہیں اس کی مخبری نہ کردی جائے۔ سیاحوں کو سیر کرانے کے لیے خاص قسم کے تربیت یافتہ رہبر ہوتے ہیں جو یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہاں کسی قسم کا اضطراب یا بے چینی نہیں ہے، حالانکہ بیگار کیمپوں میں بارہا شدید قسم کی خونریزیاں ہوئیں۔ طفلس میں ۱۹۵۶ء میں بہت بڑا ہنگامہ ہوا۔ ہزاروں کی تعداد میں نوجوان مارے گئے۔ حکومت نے ان کے خلاف ٹینک اور توپ خانہ استعمال کیا۔ اسی طرح بغاوت کی متعدد وارداتیں ہوتی رہتی ہیں جنہیں بڑی بے رحمی سے کچل دیا جاتا ہے اور اخبارات کو ہمت نہیں کہ اس قسم کی خبریں اشارۃً بھی شائع کرسکیں۔

دنیا کی سب سے بڑی استعماری حکومت

۱۹۱۷ء سے استعماری قوتوں نے اپنے نوآبادیات کو آزادی دینا شروع کردی ہے اور یکے بعد دیگرے کئی آزاد سلطنتیں معرضِ وجود میں آچکی ہیں، لیکن ماسکو، لینن کی ہدایات کے مطابق اپنے استعمار کو وسیع سے وسیع تر کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ بعض غیر روسی مفتوحہ علاقوں کو سوویت یونین کا جزبنا دیا گیا۔ (جیسے مشرقی پاکستان کی اسلامی ریاستیں) اور بعض ممالک کو علیحدہ رہنے دیا گیا ہے، لیکن حقیقی اقتدار روسی فرمانرواؤں کے اپنے ہاتھ میں ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مشرقی یورپ کے اشتراکی ممالک روسی استعمار اور جبر وتشدد کی وجہ سے اشتراکی بنے ہیں۔ جو لوگ وہاں برسر اقتدار ہیں انہوں نے کبھی آزادانہ انتخاب کرانے کی جرأت نہیں کی اور وہ فقط روسی قوت کے بل بوتے پر وہاں حکومت کررہے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۵۳ء میں مشرقی جرمنی میں جب وہاں کے لوگوں نے سر اٹھایا اور ۱۹۵۶ء میں ہنگری میں جب اس نظام کے خلاف بغاوت ہوئی تو روسی فوجیں لاکھوں کی تعداد میں جدید اسلحہ سے لیس ہوکر دندناتی ہوئی وہاں پہنچیں اور ان لوگوں کا قلع قمع کردیا گیا جنہوں نے اشتراکیت کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ یہی داستان چیکوسلواکیہ میں دہرائی گئی۔

Marfat.com

دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ پر روس نے بیشتر مفتوحہ ممالک کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور آج تک وہاں آزادی کی صبح طلوع نہیں ہوئی۔ روسی ان ممالک سے بعینہٖ وہی فائدہ اٹھا رہے ہیں جو سامرین اپنی نو آبادیات سے اٹھایا کرتے تھے۔ اربوں ڈالر کا سامان وہاں سے منتقل ہو کر روس میں جاتا ہے۔ ایبل جو مشرقی جرمنی کے منصوبہ بندی کمیشن کا چیئرمین تھا اس نے جب دیکھا کہ اس کے ملک کی دولت بڑی فراوانی سے روس میں منتقل کی جارہی ہے اور اس کے ملک کے عوام کا خون بے رحمی سے چوسا جارہا ہے تو اس نے بڑا شور مچایا، لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ یہ المیہ اپنی انتہا کو پہنچا جب پندرہ بلین (پندرہ ارب) ڈالر کا پانچ سالہ تجارتی معاہدہ روس اور مشرقی جرمنی کے درمیان طے ہوا، اس نے احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ یہ تجارتی معاہدہ نہیں بلکہ روس کی انتہا درجے کی زیادتی ہے۔ اس کی شدید مخالفت کے باوجود جب اس معاہدہ پر دستخط ہو گئے تو اس نے بطورِ احتجاج اپنے آپ کو گولی مار کر خودکشی کر لی۔

روس ہر لحظہ اپنے اقتدار اور اثر و نفوذ کو دیگر ممالک میں بڑھانے کے لیے مصروفِ تگ و دو ہے۔ جنوبی کوریا اور کیوبا وغیرہ اس کے استعماری عزائم کو بے نقاب کرنے کے لیے کافی ہیں۔

Marfat.com

علم کی ترقی
میں
مسلمانوں کا حصہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ عقل وخرد کی آنکھ اس وقت تک نہیں دیکھ سکتی، جب تک علم کی روشنی نہ ہو۔علم کی شمع گل ہو جائے تو انسانی سوچ کو اوہام وخرافات اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔اس کی توانائیاں تعمیر سے زیادہ تخریب کے لیے استعمال ہونے لگتی ہیں۔اس سے ایسے خسیس ورذیل اعمال صادر ہونے لگتے ہیں، جن سے شیطان کی پیشانی بھی فرطِ ندامت سے عرق آلود ہو جاتی ہے۔ وطنی، نسلی، قومی اور لسانی عصبیتیں اسے خونخوار درندہ بنا دیتی ہیں۔اس کی وہ خوبیاں، جن سے اس کے خالق نے اسے سرفراز فرمایا ہے، یوں ہی بیکار پڑی رہتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جو رب العالمین ہے، عالم انسانیت کی رہنمائی کے لیے اپنے محبوب بندے اور برگزیدہ رسول کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا۔جو صحیفۂ رشد وہدایت آپ پر نازل فرمایا، اس کی پانچ بابرکت آیتیں جو سب سے پہلے نازل ہوئیں، ان میں نہ عبادت الٰہی کا حکم دیا گیا، نہ اخلاق حسنہ کو اپنانے کی تاکید کی گئی ہے، نہ ان میں گناہوں اور برائیوں سے اجتناب کی تلقین ہے اور نہ ان اصول وضوابط کا بیان ہے جن پر اسلامی معاشرہ کا قصر رفیع تعمیر کرنا اسلام کے اولین پاکیزہ مقاصد میں سے ہے، بلکہ اِقۡرَاۡ کا حکم دے کر علم وعرفان کے انمول خزانوں کے قفل کھولنے کی کنجی اس کے ہاتھ میں دے دی۔ نیز انسان پر اپنے ان گنت احسانات میں سے یہاں صرف دو احسانوں کے ذکر پر اکتفا فرمایا ہے۔ایک ہے انسان کی تخلیق اور دوسرا ہے اپنی تخلیق کے شاہکار انسان کو زیورِ علم سے آراستہ کرنے کا بیان۔

قلم، جو علم کے فروغ کا مؤثر ترین وسیلہ ہے، اس کو بھی فراموش نہیں کیا گیا بلکہ اس کی اہمیت اور عظمت کو ظاہر کرنے کے لیے اس کا بھی ذکر کر دیا۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ ۚ﴿۱﴾ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ ۚ﴿۲﴾ اِقۡرَاۡ وَ

رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝ (العلق)

"آپ پڑھیے، اپنے رب کے نام کے ساتھ، جس نے (سب کو) پیدا فرمایا، پیدا کیا انسان کو جمے ہوئے خون سے، پڑھیے، آپ کا رب بڑا کریم ہے، جس نے علم سکھایا قلم کے واسطہ سے۔ اسی نے سکھایا انسان کو جو وہ نہیں جانتا تھا"۔

آپ خود سوچیے کہ جس کتابِ مقدس کا آغاز علم کی عظمت کے بیان سے کیا گیا ہو، اس کتاب پر سچے دل سے ایمان لانے والوں کے دلوں میں حصولِ علم کا کتنا شوق ہوگا اور اس شوق کی تسکین کے لیے انہوں نے کتنی جانفشانی سے کام لیا ہوگا۔

قرآن کریم نے علم کی عظمت اور برتری کا نقش اپنے ماننے والوں کے لوحِ قلب پر ثبت کرنے کے لیے تخلیق آدم علیہ السلام کے واقعہ کو پہلے پارہ میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ جب زمین و آسمان کے خالق و مالک نے حضرت آدم کو اپنی خلافت کے منصب پر فائز کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا تو فرشتوں نے عرض کیا: ہم شب و روز تیری تسبیح و تقدیس اور حمد و شکر میں مصروف رہتے ہیں۔ ہمیں یہ شرف مرحمت ہونا چاہیے۔ وہاں یہ وجہ بیان کی گئی کہ آدم اس منصب کے لیے کیوں پسند کیا گیا۔ اس لیے نہیں کہ وہ شیر سے زیادہ طاقتور ہے، ہاتھی سے زیادہ گرانڈیل ہے، ہرن سے زیادہ تیز رفتار ہے، شاہین سے زیادہ تیز نگاہ ہے یا فرشتوں سے زیادہ عبادت گزار ہے۔ ان خوبیوں میں سے کوئی خوبی بھی اس پیکر خاکی کے تختِ خلافت پر متمکن ہونے کے لیے ذکر نہیں کی گئی، بلکہ علم کو وجہ شرف انسانی قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (البقرہ)

اور اللہ تعالیٰ نے سکھا دیے آدم کو تمام اشیاء کے نام، پھر پیش کیا انہیں فرشتوں کے سامنے اور فرمایا: بتاؤ تو مجھے نام ان چیزوں کے، اگر (اپنے خیال میں) سچے ہو۔

Marfat.com

جب ملائکہ نے اپنے عجز کا اعتراف کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۙ وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾ (البقرۃ)

تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں خوب جانتا ہوں سب چھپی ہوئی چیزیں آسمانوں اور زمین کی، اور میں جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو"۔

ان آیات میں قرآن کریم نے وضاحت سے بیان فرمایا کہ تمام مخلوق پر نیز نورانی ملائکہ پر حضرت آدم کی فضیلت و برتری کی وجہ ان کا خداداد علم ہے۔ جو شخص بھی اپنے پدرِ بزرگوار کی اس بزرگی اور عظمت کا وارث بننا چاہتا ہے اس پر لازم ہے کہ وہ علم کے حصول کے لیے اپنی تمام توانائیاں صرف کر دے۔

اس علم سے مراد صرف چند مذہبی کتابوں کا علم ہی نہیں، بلکہ غور و فکر، تحقیق و تدقیق اور پیہم تجربات سے مستور حقائق سے پردہ اٹھانے کی بار بار تاکید کی گئی ہے اور کائنات کی ان چھوٹی بڑی تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ کی توحید کے لیے آیات بینات یعنی روشن دلائل قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کریم کا شاید ہی کوئی ایسا صفحہ ہو جہاں اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ، اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ، اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ کی تنبیہ موجود نہ ہو۔ سورج کا طلوع و غروب، چاند کے گھٹنے بڑھنے، گردشِ لیل و نہار، ہواؤں کے چلنے، بارش کے برسنے، پھولوں کے کھلنے، کلیوں کے مسکرانے، پہاڑوں کی بلندیوں اور سمندروں کی وسعتوں، سب میں بندۂ مومن کو غور و فکر کی بار بار شوق آفریں دعوت دی گئی ہے اور اس کا فائدہ یہ بتایا گیا ہے کہ اس سے تمہیں عرفانِ الٰہی نصیب ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ جمال و کمال کے جلوے کا مشاہدہ کر کے اس کی بے پایاں قدرت، بے نظیر حکمت اور وسیع علم پر ایمان مستحکم ہو جائے گا۔ ان بے شمار آیات میں سے صرف ایک کے ذکر پر اکتفا کرتا ہوں۔ ارشاد ہے:

سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَ فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ

Marfat.com

الْحَقُّ (حم السجدہ۔ ۵۳)

یعنی اگر وہ غور وفکر سے کام لیں گے تو ہم زمین و آسمان کے آفاق میں کائنات کے جو مینا بازار سجے ہوئے ہیں اور خود ان کی اپنی ذات میں اسرار و معارف کے جو خزانے مخفی ہیں، ان میں قدرت، حکمت اور علم کے ایسے روشن دلائل دکھائیں گے جن سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہی حق ہے۔

مسلمان جس کی نجات کا دار و مدار معرفت الٰہی پر ہے۔ اس کے حصول کا راستہ جو قرآن کریم نے متعین فرمایا ہے وہ یہی ہے کہ ہم کائنات کی ہر چیز کو اور ان میں رونما ہونے والے ہر تغیر کو دقت نگاہ سے دیکھیں اور اپنے نشتر تحقیق سے ہر چیز کا دل چیریں، تو قوت و توانائی کے اُمڈتے ہوئے سمندر سے آشکار ہو جائیں گے۔ اس وقت ہمیں پتہ چلے گا کہ جس قادرِ مطلق نے ان چیزوں کو ان تاثرات اور خاصیات سے بہرہ مند کر کے پیدا فرمایا ہے اس کی عظمت اور جلالت شان کا کیا حال ہے۔

ارشاداتِ ربانی کے علاوہ حضور سرور عالم ﷺ نے اپنے غلاموں کو حصولِ علم کی جس طرح ترغیب دی، اس نے مسلمانوں کے شوقِ علم کو اس قدر فزوں تر کر دیا کہ انہوں نے ایک قلیل عرصہ میں علوم و معارف کے دریا بہا دیے۔ چند ایک ارشاداتِ نبوی ﷺ آپ بھی سماعت فرمائیں:

عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰه تعالٰی علیه وسلم مَنْ خَرَجَ فِیْ طَلَبِ الْعِلْمِ فَهُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ حَتّٰی یَرْجِعَ۔ (1)

''جو شخص حصولِ علم کے لیے اپنے گھر سے نکلتا ہے وہ گویا اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کر رہا ہے یہاں تک کہ وہ لوٹ کر واپس آ جائے''۔

رحمت عالم نے حصول علم کے لیے جد و جہد کو جہاد فی سبیل اللہ کا ہم پایہ بنا دیا۔ ان پاکیزہ کلمات سے مسلمانوں میں حصولِ علم کا جو پایاں ناپذیر شوق پیدا ہوا ہوگا اس کا کیونکر

1۔ جامع ترمذی، باب فضل طلب العلم، جلد 2، صفحہ 89، آفتاب عالم پریس لاہور

Marfat.com

اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ایک اور جاں پرور ارشادِ نبوی ﷺ پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔

عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ، قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللّٰه تعالٰی علیه وسلم یَقُوْلُ، مَنْ سَلَکَ طَرِیْقًا یَّبْتَغِیْ فِیْهِ عِلْمًا سَلَکَ اللّٰهُ بِهٖ طَرِیْقًا اِلَی الْجَنَّةِ وَاِنَّ الْمَلٰٓئِکَةَ لَتَضَعُ اَجْنِحَتَهَا رِضًا لِطَالِبِ الْعِلْمِ۔ وَ اِنَّ الْعَالِمَ لَیَسْتَغْفِرُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ حَتّٰی الْحِیْتَانُ فِی الْمَآءِ۔ وَ فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَی الْعَابِدِ کَفَضْلِ الْقَمَرِ عَلٰی سَائِرِ الْکَوَاکِبِ۔ وَ الْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِیَاءِ۔ اِنَّ الْاَنْبِیَاءَ لَمْ یُوَرِّثُوْا دِیْنَارًا وَّلَا دِرْهَمًا اِنَّمَا وَرَّثُوْا الْعِلْمَ۔ فَمَنْ اَخَذَ بِهٖ فَقَدْ اَخَذَ بِحَظٍّ وَّافِرٍ۔ (1)

حضرت ابودرداء کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: جو کسی راستہ پر اس لیے چلتا ہے کہ علم حاصل کرے، اللہ تعالیٰ اسے جنت کے راستے پر چلا دیتا ہے اور فرشتے طالب علم کے لیے اپنے نورانی پر بچھاتے ہیں تاکہ اس کے حسن عمل پر اپنی رضا مندی کا اظہار کریں اور آسمانوں اور زمینوں میں جو چیز بھی ہے وہ عالم کی مغفرت کے لیے دست بدعا رہتی ہے یہاں تک کہ پانی کی مچھلیاں بھی۔ عالم کو عابد پر اتنی فضیلت حاصل ہے جتنی چاند کو ستاروں پر۔ علماء انبیاء کے وارث ہیں، کیونکہ انبیاء دینار و درہم کو اپنے ورثہ میں نہیں چھوڑتے۔ وہ علم کو اپنے ورثے میں چھوڑتے ہیں۔ جس نے علم حاصل کیا، اس نے انبیاء کے ورثہ سے حظ وافر پایا۔

یہ اور اسی انداز کے دیگر شوق انگیز کلمات نبوی تھے، جن کے اعجاز نے جہالت و وحشت کی گود میں پرورش پانے والے اہل عرب کو علم کا دیوانہ بنا دیا اور وہ شمع علم پر پروانوں کی طرح قربان ہونے لگے۔ جن لوگوں کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرت کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا ہے، وہ جانتے ہیں کہ ایک ایک حدیث کے حصول کے لیے وہ ہزاروں میل کی

1۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی فضل الفقہ علی العبادۃ، جلد 2، صفحہ 93

Marfat.com

مسافت طے کر کے جاتے تھے۔ علم کا یہی شوق انہوں نے اپنی آنے والی نسلوں کو بطورِ ورثہ دیا۔ ان سعادت مند آباء کے بیدار بخت اور بلند اقبال فرزندوں نے علم و معرفت کے میدان میں وہ بے مثال فتوحات حاصل کیں کہ آج دنیا کی کوئی قوم بھی ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ تالیف و تصنیف کا سلسلہ عہد صحابہ سے ہی شروع ہو گیا تھا، لیکن جیسے جیسے مسلمانوں کی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا، علوم و فنون میں بھی ان کے کارنامے آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خواہش پر ایک عیسائی عالم ابن آثال نے طب کی چند کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔ عبدالملک کے میر منشی سالم نے ارسطو کے بعض رسائل کو عربی کا جامہ پہنایا۔ عباسی خلفاء نے تو علم و حکمت کی روشنی پھیلانے کے لیے حد کر دی۔ انہوں نے اسلامی مملکت کے مختلف صوبوں میں بلکہ دیگر ممالک میں بھی اپنے خاص کارندے بھیجے، جن کے پاس اشرفیوں سے بھری ہوئی تھیلیاں ہوا کرتی تھیں، جو جگہ جگہ سے مخطوطات کے قیمتی نوادرات لے کر بغداد پہنچتے۔ جہاں کہیں کسی اہل علم و دانش کا پتہ چلتا، خلفاء اسے اپنے دربار کی زینت بنانے میں فخر محسوس کرتے۔ اس کو فکر معاش سے فارغ کر کے دیگر زبانوں کی علمی کتب کو عربی میں منتقل کرنے پر متعین کر دیتے۔

عہد عباسی میں یونان کا سارا فلسفہ، جو کسمپرسی کے عالم میں بند کمروں، متروک لائبریریوں کی الماریوں میں پڑا ہوا تھا، اسے عربی میں منتقل ہی نہیں کیا گیا بلکہ اس کی ایسی شروح لکھی گئیں، جن میں ان کتب کے مجمل مباحث کو تفصیل سے بیان کیا گیا۔ جہاں ابہام اور التباس تھا، اس کا ازالہ کیا گیا۔ جہاں ان کے راہوار فکر نے ٹھوکر کھائی تھی اس کی نشاندہی بھی کی گئی اور اس کی اصلاح بھی کی گئی۔ مسلمان علماء حکمائے سابقین کے اندھے مقلد نہ تھے بلکہ وہ ان کا مطالعہ کرتے اور ان میں غور و فکر کا حق ادا کرتے اور جہاں ضروری ہوتا وہاں تنقید کا فریضہ بھی بڑی جرأت اور دیانت داری سے انجام دیتے۔ بطلیموس، جو ایک مشہور اور ماہر علوم فلکیہ ہوا ہے، اس کے مشاہدات پر مسلم علماء نے بھر پور تنقید کی۔ انہوں نے نہایت عرق ریزی سے ستاروں کے مقامات کا تعین کیا۔ ان کی حرکت کی وضاحت کی۔

Marfat.com

سورج اور چاند گرہن کیونکر وقوع پذیر ہوتا ہے؟ اس کے اسباب پر روشنی ڈالی۔ اگر ان مسلم علماء نے حکمت یونان کے احیاء کے لیے شب و روز جگر سوزی سے کام نہ کیا ہوتا تو آج ارسطو اور افلاطون سے شاید کوئی آشنا ہی نہ ہوتا۔

اسلامی دنیا کے مغربی کونہ قرطبہ سے لے کر اس کے آخری مشرقی کنارہ تک ہزاروں ایسی درس گاہیں قائم تھیں جہاں ہر وقت طلبہ کی بھیڑ رہتی تھی۔

ول ڈیوران لکھتا ہے:

جغرافیہ دانوں، مؤرخوں، منجموں، فقیہوں، محدثوں، طبیبوں اور حکیموں کے ہجوم سے سڑکوں پر چلنا دشوار تھا۔ (ایج آف فیتھ ص ۲۳۷)(1)

جہاں بھی مسلمانوں کی چھوٹی سے چھوٹی آبادی ہوتی وہاں ایک مسجد کا ہونا ناگزیر ہوتا۔ مسجد صرف عبادت گاہ ہی نہ تھی، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ درس گاہ بھی تھی۔ دنیائے اسلام میں لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں چھوٹی بڑی جتنی مسجدیں تھیں، وہ مدارس کے طور پر بھی استعمال ہوتی تھیں۔ جہاں محلے اور بستی کے بچے اور بچیاں تحصیل علم کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ مساجد کے علاوہ ہر بڑے شہر میں بڑے بڑے دار العلوم اور جامعات تھے۔ بغداد میں شہرۂ آفاق جامعہ نظامیہ کے علاوہ تیس دیگر بڑے بڑے کالج تھے جن میں ہزار ہا طلبہ بیک وقت تعلیم پاتے تھے۔ مرزا حیرت دہلوی حالات سعدی صفحہ نمبر ۶۷ میں لکھتے ہیں:

دار العلوم نظامیہ پورا ایک شہر تھا۔ لاتعداد کمرے اور ایک وسیع ہال جس میں دس ہزار انسان سما سکتے تھے۔ یہاں قرآن و حدیث، فقہ، فلسفہ، ریاضی، ہیئت اور دیگر علوم کی تدریس کا پورا انتظام تھا۔ ایک شعبہ اجنبی زبانوں کا تھا جہاں یونانی، عبرانی، لاطینی، سنسکرت اور فارسی پڑھائی جاتی تھی۔ ان علوم کے علاوہ تیر اندازی، تیغ بازی، گھڑ سواری کی بھی مشق کرائی جاتی تھی۔(2)

1۔ بحوالہ یورپ پر اسلام کے احسان، ڈاکٹر غلام جیلانی برق، صفحہ 138، مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس لاہور

2۔ بحوالہ یورپ پر اسلام کے احسان، ڈاکٹر غلام جیلانی برق، صفحہ 142، مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس لاہور

Marfat.com

خلیفہ عبدالرحمٰن سوم (۹۱۲ء تا ۹۶۱ء) نے اندلس کے پایۂ تحت قرطبہ میں ایک عظیم الشان یونیورسٹی کی بنیاد رکھی۔ اس میں صرف اندلس کے طلبہ ہی زیورِ علم سے آراستہ نہیں ہوتے تھے، بلکہ یورپ کے دیگر ممالک نیز افریقہ اور ایشیا کے تشنگانِ علم بھی علم وحکمت کے اس سرچشمۂ شیریں سے سیراب ہونے کے لیے ہزاروں کی تعداد میں موجود رہتے تھے۔ اس یونیورسٹی کی لائبریری بھی بڑی وسیع تھی۔ مختلف علوم وفنون پر چھ لاکھ کتابیں موجود تھیں۔ ان کتابوں کی ایک مکمل فہرست تھی جو چوالیس جلدوں میں مرتب کی گئی تھی۔ (1) اس کی مدد سے مطالعہ کرنے والوں کو جس کتاب کی ضرورت ہوتی وہ آسانی سے دستیاب ہو جاتی۔

کلونی (فرانس) کا پیٹر ایبٹ ۱۲۸۰ء لکھتا ہے:

میں نے قیام ہسپانیہ کے دوران میں دیکھا کہ فرانس، جرمنی اور برطانیہ کے طلبہ جوق در جوق عربوں کے علمی مراکز میں جمع ہو رہے ہیں۔ (2)

(تشکیل انسانیت ص ۲۸۵ از رابرٹ بری فالٹ)

یہ علمی مراکز صرف قرطبہ تک محدود نہ تھے، بلکہ اسپین کے تمام بڑے بڑے شہروں میں یونیورسٹیاں قائم تھیں۔ طلیطلہ کے مقام پر مسلمانوں نے ایک یونیورسٹی قائم کی تھی جہاں یورپ کے ہر ملک کے طلبہ آتے اور تعلیم حاصل کرتے تھے۔ تین فاضل جن پر انگلستان کو ناز ہے، طلیطلہ یونیورسٹی کے ہی فارغ التحصیل تھے۔

۱۔ رابرٹ (۱۱۴۰): اس نے قرآن کریم اور خوارزمی ۸۴۴ کے الجبرا کو لاطینی میں منتقل کیا۔

۲۔ مائیکل سکاٹ: یہ سکاٹ لینڈ کا رہنے والا تھا۔ اس نے سات سال طلیطلہ کے جامعہ میں طالب علم کی حیثیت سے گزارے۔ اس نے ارسطو، ابن رشد، نیز ہیئت اور اخلاق کی بعض عربی کتابوں کو لاطینی میں منتقل کیا۔

1۔ بحوالہ یورپ پر اسلام کے احسان، ڈاکٹر غلام جیلانی برق، صفحہ 143، مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس لاہور

2۔ بحوالہ یورپ پر اسلام کے احسان، صفحہ 144

Marfat.com

۳۔ ایڈل ہارڈ: یہ بارہویں صدی کا برطانوی عالم ہے، جس نے عربی میں کمال حاصل کرنے کے لیے شام کا سفر کیا۔(1)

سپین کے علاوہ عربوں نے فرانس کے ایک مشہور شہر ماؤنٹ پلیئر اور اٹلی کے کئی شہروں میں درس گاہیں قائم کی تھیں، جن میں پڈو اور پیسا دونوں شہر بڑی اہمیت کے مالک ہیں۔ یہاں بوعلی سینا اور ابوالقاسم بن عباس اندلسی کی کتابیں نصاب میں داخل تھیں۔ انہیں مدارس سے اٹلی کے دو مشہور سرجن فیلوپیس (۱۵۶۲ء) اور ویسالیوس، سرجری میں مہارت حاصل کر کے شہرت کے آسمان پر چمکے۔ شہرۂ آفاق منجم گلیلیو (۱۶۴۲ء) انہیں مسلم درس گاہوں کا فیض یافتہ تھا۔(2)

بے شک قرآن کریم کی تعلیمات اور سرورِ عالم ﷺ کے ارشادات نے مسلمانوں کے دلوں میں علم وحکمت کی بلند سے بلند چوٹیوں کو مسخر کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا تھا اور وہ اپنی زندگی کو اسی مقصد کے لیے وقف کیے ہوئے تھے، لیکن اس کی اس بے نظیر ترقی میں یقیناً ان سلاطین وامراء کا بہت بڑا حصہ ہے، جنہوں نے علماء، فضلاء، حکماء اور فلاسفہ کی خدمت کے لیے اپنے خزانوں کے دروازے کھول دیے تھے۔ وہ اپنی داد و دہش سے اہل علم وفضل کو یوں غنی اور بے نیاز کر دیتے کہ فکر معاش ان کی راہ میں کبھی حائل نہ ہوتی۔ ہارون الرشید کا طبیب خاص، جبرئیل بن بخت یشوع جو بہت بڑا مصنف بھی تھا اور ہارون الرشید کا طبیب خاص بھی، اس کی سالانہ آمدنی کا اندازہ لگائیے:

سرکاری مشاہرہ	ایک لاکھ بیس ہزار درہم سالانہ
جائیداد سے آمدنی	پندرہ لاکھ درہم سالانہ
عطیات	ایک لاکھ درہم سالانہ
یحییٰ بن خالد وزیر کی طرف سے	چھ لاکھ درہم سالانہ
جعفر بن یحییٰ کی طرف سے	بارہ لاکھ درہم سالانہ

1۔ بحوالہ یورپ پر اسلام کے احسان، صفحہ 144 (ملخصاً)
2۔ ایضاً

Marfat.com

فضل بن یحییٰ کی طرف سے	چھ لاکھ درہم سالانہ
اور دیگر امراء کی طرف سے	دو لاکھ درہم سالانہ
میزان	تینتالیس لاکھ بیس ہزار درہم سالانہ (1)

روم میں ''لیو'' نامی ایک مشہور فلسفی تھا۔ مامون الرشید نے قیصر روم کو لکھا کہ اگر وہ (لیو) کو دربارِ خلافت میں بھیج دے تو وہ اس کے عوض چالیس من سونا قیصر روم کو ادا کرے گا۔ نیز دائمی صلح کا وعدہ بھی کیا۔ مامون نے تالیف وتصنیف اور ترجمہ کے لیے جو دارالحکمت قائم کیا تھا، مقررہ تنخواہ کے علاوہ جو عالم کوئی تصنیف پیش کرتا، اس کو سونے میں تولا جاتا اور سونا مصنف کو دیا جاتا۔

مامون کے سامنے ایک شاعر محمد بن وہیب نے ایک قصیدہ پڑھا۔ مامون نے ہر شعر کے عوض اسے ایک ہزار دینار انعام دیا۔

علماء فضلاء پر انعام واکرام اور داد و دہش کی داستان بڑی طویل ہے اور بسا اوقات اسراف کا گماں بھی ہونے لگتا ہے، لیکن جود وکرم کی اس بارش نے علم وحکمت کے ان سدا بہار گلستانوں کو رنگ ونکہت سے بھر دیا اور آج تک ان کی مہک سے مشامِ جاں معطر ہو رہے ہیں۔

مسلمانوں کو علم حاصل کرنے اور اس کی ترویج واشاعت سے جو بے پناہ شغف تھا، اس کا اندازہ ان کتب خانوں کے حالات پڑھ کر بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے، جو انہوں نے مختلف مقامات پر قائم کیے تھے اور یہ اس زمانہ کی بات ہے جبکہ کاغذ کے کارخانے، لاکھوں ٹن کاغذ بنانے کے لیے مصروفِ عمل نہ تھے، بلکہ کاغذ بہت نایاب تھا۔ نیز پریس بھی ابھی ایجاد نہیں ہوا تھا کہ وہ برقی قوت سے گھنٹوں میں ہزاروں صفحات کو طبع کر دے۔ ساری کتابیں ہاتھوں سے لکھی جاتی تھیں۔ اس زمانہ میں اتنے بڑے بڑے کتب خانوں کا معرضِ وجود میں آجانا ایک معجزہ تھا اور یہ معجزہ اس عشق سے رونما ہوا جو مسلمانوں کو علم وحکمت سے تھا۔ پہلے عرض کیا

1۔ بحوالہ یورپ پر اسلام کے احسان صفحہ 40-139

Marfat.com

جا چکا ہے کہ قرطبہ یونیورسٹی کا کتب خانہ چھ لاکھ علمی نوادرات پر مشتمل تھا، جس کی فہرست چوالیس جلدوں میں تیار ہوئی تھی، اس کے علاوہ ستر اور لائبریریاں بھی اس ایک شہر میں موجود تھیں۔ ہر مسجد اور مکتب کے لیے اس کی حیثیت کے مطابق ایک لائبریری کا ہونا ضروری تھا۔ سلاطین، خلفاء، وزراء اور امراء اپنی لائبریریوں کو وسیع، خوب صورت اور منظم بنانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ جرمنی کی ایک مشہور مستشرقہ ڈاکٹر زیغرد ھونکا (Sigrid Hunke) نے ایک کتاب لکھی ہے، جس کا عربی ترجمہ بیروت میں "شمس العرب تسطع علی الغرب" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس میں اس نے یہ تاریخ بڑی شرح وبسط کے ساتھ لکھی ہے کہ عربی تہذیب نے یورپ کو کس حد تک متاثر کیا، اس میں عربوں کے قائم کیے ہوئے کتب خانوں کے بارے میں وہ رقمطراز ہے:

"۸۹۱ء میں بغداد میں ایک سو سے زیادہ بڑے بڑے کتب خانے تھے اور ہر شہر میں ایک لائبریری قائم کی جاتی تھی جس میں سے ہر شخص کو اجازت تھی کہ وہ کتابیں مطالعہ کے لیے لے جاسکتا۔ لائبریری کی عمارت سے ملحق کئی ہال ہوتے تھے، جہاں لوگ بیٹھ کر کتابوں کا مطالعہ کرتے۔ ساتھ ہی مصنفین اور مترجمین کے لیے الگ الگ کمرے ہوتے جن میں بیٹھ کر وہ بڑے سکون کے ساتھ تالیف وتصنیف کا شوق پورا کرتے اور اہم موضوعات پر ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال بھی کرتے۔ موصوفہ لکھتی ہے کہ ہر ہسپتال کے ساتھ بھی ایک لائبریری ہوتی جہاں طب کے موضوعات پر اہم کتابیں بڑے قرینے سے رکھی ہوتیں جن سے علم طب کے طلبہ اور ان کے اساتذہ یکساں طور پر مستفیض ہوتے۔"

نصیر الدین طوسی نے مراغہ میں جو رصدگاہ بنائی تھی اس میں اس نے چار لاکھ مخطوطات جمع کیے تھے۔(1) بخارا کا سلطان محمد المنصور بیمار ہوا۔ ابن سینا، جس کی عمر ابھی اٹھارہ سال تھی، اس نے سلطان کا علاج کیا، وہ صحت یاب ہوا۔ اس نے ابن سینا کو اس خدمت کا

1۔ بحوالہ یورپ پر اسلام کے احسان، صفحہ 148 (ملخصا)

Marfat.com

معاوضہ دینے کی یہ صورت نکالی کہ اسے اپنے ذاتی کتب خانے سے استفادہ کی اجازت دے دی۔ اس کے محل کا اکثر حصہ کتابوں سے بھرا ہوا تھا جہاں ہر موضوع کی کتابیں الگ الگ رکھی ہوئی تھیں۔ ابن سینا نے کئی برس اس کتب خانہ میں بسر کیے۔ اس کی رائے یہ ہے:

هُنَاکَ رَأَیْتُ کُتُبًا لَمْ یَسْمَعْ اَغْلَبُ النَّاسِ حَتّٰی بِاَسْمَائِهَا۔

میں نے وہاں ایسی ایسی کتابیں دیکھیں، جن کے نام بھی اکثر لوگوں نے شاید نہ سنے ہوں۔

قاہرہ میں خلیفہ عزیز باللہ نے جو کتب خانہ قائم کیا تھا، اس میں کتابوں کی تعداد سولہ لاکھ تھی، جس میں فن ریاضی کی چھ ہزار پانچ سو، فلسفہ کی اٹھارہ ہزار کتب تھیں۔ اس کا بیٹا جب مسند حکومت پر متمکن ہوا تو اس نے ایک اور عظیم الشان کتب خانہ تعمیر کرایا، جس میں مطالعہ کرنے والوں کے لیے اٹھارہ ہال تھے، جہاں لوگ اطمینان اور سکون سے بیٹھ کر اپنی پسندیدہ کتابوں کا مطالعہ کرتے۔ شاید انہی مکاتیب کو دیکھ کر ''واں اور یاک'' نے جو ۹۹۹ء میں سیلفسٹر وس ثانی، کے نام سے روما کا پوپ مقرر ہوا، بڑے حسرت بھرے انداز میں کہا تھا:

''یہ ایک حقیقت ہے کہ سارے روم میں کوئی شخص اتنی صلاحیت کا مالک بھی نہیں کہ وہ اس عظیم لائبریری کے دروازہ پر دربان کے فرائض انجام دے سکے۔''

اسی جرمن مستشرقہ کا بیان ہے:

''وزیر مہلبی جو ۹۲۳ء میں فوت ہوا، اس کی لائبریری میں ایک لاکھ ستر ہزار کتب تھیں اور اس کے نوجوان دوست ابن عباد نے اپنے کتب خانہ میں دو لاکھ چھ ہزار کتابیں فراہم کی تھیں''۔

ابن ندیم متوفی ۹۹۵ء ایک کتب فروش تھا، لیکن اس نے اپنے زمانہ تک عربی میں جو کتب لکھی گئی تھیں، ان کی فہرست مرتب کی جو دس جلدوں میں مکمل ہوئی۔

مسلمانوں کی علمی ترقی کے یہ حیرت افزا احوال اس زمانہ کی بات ہے جبکہ یورپ کو عیسائیت قبول کیے ہوئے ایک ہزار سال گزر چکا تھا اور ابھی تک وہ اوہام وخرافات کے

Marfat.com

اندھیروں میں بھٹک رہا تھا۔ جس زمانہ میں مسلمانوں کے کتب خانے لاکھوں کتب سے مزین و آراستہ تھے اور فن میں انہوں نے تحقیق و تدقیق کے علم گاڑ دیے تھے اور ہمیشہ زندہ رہنے والی کتابوں سے انسانیت کے دامن کو مالا مال کر دیا تھا، اس عرصہ میں یورپ میں تالیف وتصنیف کی رفتار کو دیکھ کر آپ یقیناً چونک جائیں گے اور انہوں نے اس ایک ہزار سالہ دور میں علم کی منزل کی طرف جو پیش رفت کی تھی اس سے آپ کو آگاہی حاصل ہو گی۔

ڈاکٹر غلام جیلانی برق لکھتے ہیں:

بارہویں صدی عیسوی تک عیسائی یورپ میں کتابیں لکھنے کی رفتار یہ تھی۔(1)

ملک	زمانہ	تعداد مصنفین	تعداد کتب
روما (شرقی غربی)	۳۳۰ء تا ۱۵۵۵ء	تقریباً بیس	زیادہ سے زیادہ پچاس
جرمنی	ایضاً تا ۱۳۵۰ء	تقریباً پچاس	زیادہ سے زیادہ ایک سو
فرانس	ایضاً تا ۱۰۵۰ء	تقریباً دس	زیادہ سے زیادہ پندرہ
برطانیہ	ایضاً تا ۱۱۶۰ء	پندرہ	زیادہ سے زیادہ پچیس
میزان		پچانوے	ایک سو نوے

گویا سارے یورپ کے اہل قلم نے اندازاً ہزار برس میں دو سو کتابیں لکھیں۔ خود ہی اندازہ لگائیے کہ جب عالم اسلام کے در و دیوار علم و حکمت کی روشنی میں جگمگا رہے تھے، تو یورپ جہالت و وحشت کی پستیوں میں گرا پڑا تھا۔ صرف یہی نہیں کہ انہیں علم سے کوئی رغبت نہ تھی، بلکہ علم سے انہیں جو عداوت تھی اس کی کارستانیاں پڑھ کر کلیجہ شق ہونے لگتا ہے۔ جہاں بھی انہیں علم و حکمت کی کوئی شمع روشن نظر آئی، انہوں نے اسے بجھا کر دم لیا اور جس نے اس شمع کو فروزاں کیا تھا، اس کو عبرت ناک سزائیں دیں۔

عیسائیت قبول کرنے کے بعد عرصۂ دراز تک یورپ، روم کے پوپ کے زیر اثر رہا اور

1۔ بحوالہ یورپ پر اسلام کے احسان، صفحہ 101-100

Marfat.com

پاپائی نظام میں صرف دینی کتب کے مطالعہ کو ہی علم کی آخری سرحد یقین کیا جاتا رہا۔ اس المناک حقیقت کی طرف سامعین کی توجہ مبذول کرانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ انہوں نے اپنی آسمانی کتابوں میں تحریف وتبدل کی جومہم صدیوں جاری رکھی، اس نے ان کا سراپا مسخ کر کے رکھ دیا اور وہ انہی مسخ شدہ کتب کو علم ودانش کی آخری سرحد یقین کرتے تھے۔ ان سے ہٹ کر اگر کوئی پیہم غور وتدبر سے اور تحقیق وتجربہ سے کسی اور حقیقت کو آشکارا کرتا تو نہ صرف یہ کہ اس کو برا بھلا کہا جاتا، بلکہ اس کو المناک سزا دی جاتی۔ ''ڈریپر'' نے اپنی مشہور کتاب ''معرکۂ مذہب وسائنس'' میں چند ایسے روح فرسا واقعات نقل کیے ہیں جنہیں سن کر آپ یورپ کی ذہنی پسماندگی کا ماتم کرنے سے باز نہیں رہیں گے۔ چند واقعات آپ بھی سماعت فرمائیں:

ا۔ یونان کی ایک لڑکی جس کا نام ''ہائے پیشہ'' (م ۴۱۴ء) تھا۔ تحصیل علم کے لیے اسکندریہ آئی۔ سالہا سال تک وہ حصولِ علم میں مشغول رہی یہاں تک کہ وہ فلسفہ میں استاد مانی جانے لگی۔ اسے افلاطون اور ارسطو کے فلسفہ ریاضی وہندسہ کے فنون میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ اسکندریہ کے بشپ سائرل نے اس لڑکی پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ ایک روز جب وہ فرائض تدریس انجام دینے کے لیے اپنی درس گاہ کی طرف جا رہی تھی، سائرل کے بھیجے ہوئے چند سنگدل راہبوں نے اسے پکڑ لیا۔ پہلے ننگا کر کے اسے بازار میں گھسیٹا، پھر اسے گرجے میں لے گئے۔ وہاں تیز سیپوں سے اس کی کھال کھرچی۔ پتھر سے اس کا سر توڑا۔ لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کیے اور اسے آگ میں پھینک دیا۔

۲۔ گلیلیو (۱۶۴۲ء) فلارنس، اٹلی کا وہ مشہور ہیئت دان ہے، جس نے دوربین ایجاد کی تھی، جب اس نے کار پرنیکی کے نظام شمسی کے نظریہ کی تائید کی تو پوپ نے اسے گرفتار کر کے مذہبی عدالت کے سامنے پیش کیا۔ عدالت نے اسے جیل میں پھینک دیا، جہاں وہ دس سال تک انتہائی دکھ اٹھانے کے بعد ۱۶۴۲ء میں فوت ہوگیا۔ (1)

1۔ بحوالہ یورپ پر اسلام کے احسان، صفحہ 02-101 (ملخصا)

Marfat.com

۳۔اٹلی کے مشہور فلسفی برونو کو مذہبی عدالت نے ۱۶۰۰ء میں زندہ جلا دیا۔

میں اس داستان الم کو طول دے کر آپ کے قلوب و اذہان کو مزید چرکے نہیں دینا چاہتا، لیکن ایک بات اگرچہ وہ اس سے بھی زیادہ المناک ہے، عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا۔

یورپ نے اپنے علماء کے ساتھ جو بہیمانہ برتاؤ کیا، وہ بھی انسانیت پر بہت بڑا ظلم تھا، لیکن علم و حکمت کے جو نوادرات مسلمان علماء فضلاء نے اپنی عمر بھر کی شب بیداریوں اور خونِ جگر کی آمیزش سے مرتب کیے تھے، جہاں بھی ان لوگوں کا بس چلا انہوں نے ان کو بھی جلا کر خاکستر کر دیا۔ سپین میں مسلمانوں کے چار بڑے بڑے ثقافتی مراکز تھے۔ قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ اور طلیطلہ۔ ہر مرکز میں جیسا کہ تفصیل پہلے گزر چکی ہے، عظیم الشان کتب خانے قائم تھے۔ جب ''فرڈی نن'' نے مسلم حکومت کا وہاں خاتمہ کر دیا تو ان علم و حکمت کے گراں بہا مجموعوں کو پادریوں نے نذرِ آتش کر دیا۔ صرف طلیطلہ میں مسلمانوں کی اسی ہزار کتب سپردِ آتش کر دی گئیں۔ (تشکیل انسانیت ص ۲۵۰)(1)

طرابلس میں اس دور کی عظیم ترین لائبریری تھی جس میں کتابوں کی تعداد تیس لاکھ بتائی جاتی ہے۔ صلیبی جنگوں کے دوران میں ایک مرتبہ صلیب کے علمبرداروں کا لشکر اس شہر میں گھسنے میں کامیاب ہو گیا، تو انہوں نے کتب خانہ کو آگ لگا دی۔ تمام کتب جلا ڈالیں اور مسلمانوں کی چھ سو سالہ محنت کو تباہ کر دیا۔(2)

مسلمانوں کے یہ علمی نوادرات، یورپ کے متعصب بادشاہوں، تنگدل پادریوں اور سنگدل راہبوں نے جلا کر راکھ کر دیے۔ اگر کوئی کسر باقی رہ گئی تو وہ تیرھویں صدی میں تاتاریوں نے پوری کر دی۔ انہوں نے بغداد، کوفہ، بصرہ، حلب، دمشق، نیشاپور، خراسان، خوارزم اور شیراز کی سینکڑوں لائبریریاں، جن میں مجموعی کتب کی تعداد تین کروڑ سے زیادہ تھی، بھسم کر ڈالیں۔ بے شمار علماء کو تہ تیغ کر دیا گیا۔(3)

1۔ بحوالہ یورپ پر اسلام کے احسان، صفحہ 96 (ملخصاً) 2۔ ایضاً، صفحہ 97-96 3۔ ایضاً، صفحہ 98

Marfat.com

وہ امت، جس کا پہلا سبق اِقْرَاْ تھا۔ اس نے علم کے حصول اور اس کے فروغ اور اشاعت کے سلسلہ میں جو فیاضانہ اور مربیانہ طریقہ کار صدیوں اپنائے رکھا اور ہر جگہ علم و حکمت کے انوار سے اجالا کر دیا۔ ہزاروں یونیورسٹیاں، لاکھوں دارالعلوم اور ان گنت مدرسے اپنی سلطنت کے تمام گوشوں میں قائم کیے اور علماء اور حکماء کی ہمت افزائی کے لیے اپنے خزانوں کے منہ کھول دیے، یہ نتیجہ تھا اس ربانی سبق کا جو کائنات کے ہادی مرشد ﷺ کو کائنات کے خالق و پروردگار نے سب سے پہلے پڑھایا تھا۔

ہم جن اسلاف کرام کے وارث ہیں، ان کے کارنامے آپ نے ملاحظہ فرمائے۔ ہمارا بھی یہ فرض ہے کہ ہم موجودہ جمود کو توڑیں اور حکمت و دانش کی دنیا میں جو غلط نظریات کے اندھیرے دن بدن پھیلتے جا رہے ہیں، ان کا قلع قمع کر کے صحیح علم کی شمعیں فروزاں کریں اور عالم انسانیت کی اس شب دیجور کو اپنی مسلسل محنت اور پیہم جدوجہد سے سحر آشنا بنا دیں۔

Marfat.com

احناف کے نزدیک
نمازِ جنازہ کا طریقہ

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

آپ کا مکتوب ملا۔ غیر مقلدوں کے سارے اعتراضات علمی لحاظ سے بالکل مہمل اور تحقیقی لحاظ سے بالکل کھوکھلے ہیں۔ صرف غوغہ آرائی ہے جو ان کی انانیت اور ہٹ دھرمی کی آئینہ دار ہے۔ ان کے اعتراضات کے جوابات دینے سے پہلے ضروری ہے کہ آپ کو پوری وضاحت سے یہ عرض کیا جائے کہ احناف کے نزدیک نمازِ جنازہ کیونکر پڑھی جاتی ہے؟ ان میں کون کون سی چیزیں فرض ہیں اور کیا کیا مسنون اور مستحب ہیں؟ اپنے مسلک کو صحیح طور پر سمجھ لینے سے بفضلہٖ تعالیٰ بیشتر خدشات خود بخود دور ہو جائیں گے۔

طریقہ نمازِ جنازہ عندالاحناف

ہمارے نزدیک نمازِ جنازہ کے دو فرائض ہیں: تکبیرات اور قیام۔ پہلی تکبیر کے بعد ثناء سُبۡحَانَکَ اللّٰھُمَّ ...... الخ، دوسری تکبیر کے بعد درود شریف اور تیسری تکبیر کے بعد میت کے لیے دعائے مغفرت پڑھی جاتی ہے۔ درحقیقت نمازِ جنازہ میت کے لیے دعائے مغفرت ہے اور دعا مانگنے کے یہی آداب ہیں کہ پہلے اللہ تعالیٰ کی ثناء کی جائے، اس کے بعد اس کے محبوب مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود شریف پڑھا جائے، اس کے بعد دعا مانگی جائے۔ دعا کے یہ آداب احادیث صحیحہ میں موجود ہیں۔

احادیث میں ثناء کے لیے متعدد کلمات درج ہیں، ان میں سے کوئی ثناء پڑھ لی جائے تو وہ جائز ہے۔ درود شریف پڑھنے کے لیے بھی احادیث پاک میں متعدد صیغے مذکور ہیں، ان میں سے کوئی ایک درود پڑھا جا سکتا ہے۔ میت کی دعائے مغفرت کے لیے بھی احادیث مبارکہ میں مختلف دعائیں مذکور ہیں، ان میں سے کوئی دعا بھی اگر پڑھ لی جائے تو نمازِ جنازہ درست ہو جائے گی۔

نمازِ جنازہ کی یہ وہ تفصیل ہے جو فقہ حنفی کی تمام کتابوں میں ذکر کی گئی ہے۔ یہ چیزیں ذہن نشین کر لینے کے بعد اب آپ دریافت کر سکتے ہیں کہ جب اتنی رخصت ہے تو پھر ہمیں

Marfat.com

کیوں مجبور کیا جاتا ہے کہ ہم پہلی تکبیر کے بعد سُبحَانکَ اللّٰھُمَّ.......... الخ پڑھیں، دوسری تکبیر کے بعد التحیات والا مخصوص درود پڑھیں اور تیسری تکبیر کے بعد یہ مخصوص دعا اَللّٰھُمَّ اغفِر لِحَیِّنَا.......... الخ مانگیں۔

اس کے لیے گزارش ہے کہ اس کی کئی حکمتیں ہیں۔ایک حکمت تو یہ ہے کہ سب لوگ اتنی قابلیت اور استعداد کے مالک نہیں ہوتے کہ ثناء کی ساری عبارتیں، درود شریف کے مختلف صیغے اور احادیث طیبہ میں میت کے لیے جو مختلف دعائیں مذکور ہیں، وہ سب ان کو ازبر ہوں اور حسب موقع وہ ان کو پڑھ لیا کریں۔ اس لیے علمائے احناف نے لوگوں کی آسانی کے لیے ایک جامع ثناء، ایک جامع درود پاک اور ایک جامع دعا احادیث سے منتخب کر کے مقرر کر دی، تاکہ ہر شخص آسانی سے یاد کر لے اور نمازِ جنازہ میں ان کی قرأت کر سکے۔ اگر کوئی شخص اس ثناء، اس درود اور اس دعا کے بجائے جو ہم پڑھتے ہیں، کوئی اور ماثور ثناء، درود اور دعا پڑھتا ہے، تو احناف کے نزدیک اس کی نمازِ جنازہ درست ہوگی۔

اس تعین کی دوسری حکمت یہ ہے کہ عوام الناس مسائل کی ان باریکیوں سے واقف نہیں ہوتے۔ اگر الگ الگ دعائیں وہ پڑھیں گے، تو ناواقفی کی وجہ سے ان میں اختلاف و نزاع پیدا ہوگا اور باہمی سر پھٹول کی نوبت آئے گی جس کا مشاہدہ ہم آئے روز کرتے رہتے ہیں اور وہ ملا، جن کا دین فی سبیل اللہ فساد برپا کرنا ہے، وہ امت میں انتشار کی تخم ریزی کرنے سے باز نہیں آئیں گے۔

آپ کو شاید یہ علم ہوگا کہ عہد رسالت پناہ ﷺ میں قرآنِ کریم سات مشہور لغات کے مطابق پڑھا جاتا تھا۔ صحابہ کرام تمام عرب تھے، عربی ان کی مادری زبان تھی۔ اس لیے ان مختلف قرأتوں کی تلاوت سے انہیں کوئی دقت محسوس نہ ہوتی تھی، لیکن اسلام جب جزیرۂ عرب سے نکل کر دیارِ عجم میں پہنچا اور ایسے لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے جن کی مادری زبان عربی نہیں تھی، اس وقت قرأتوں کے اس اختلاف نے بڑی سنگین صورت اختیار کر لی اور آپس میں جنگ و جدل، بلکہ تکفیر کی نوبت آ پہنچی۔ اس کے بعد اس کے سدباب کے لیے

Marfat.com

عہد عثمانی میں قریش کی لغت کو اختیار کیا گیا اور باقی لغات کے مطابق قرآنِ کریم کی کتابت اور قرأت ممنوع قرار دے دی گئی۔ اس طرح امت محمدیہ ﷺ نے قرآنِ کریم کے بارے میں اختلاف کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔

اسی طرح نمازِ جنازہ کی تکبیروں کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معمول مختلف تھا۔ کوئی چار تکبیریں پڑھتے اور کوئی اس سے زائد۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے جب یہ اختلاف دیکھا تو صحابہ کرام کو جمع کیا اور فرمایا کہ تم حضور نبی کریم ﷺ کے صحابہ ہو، اگر تم آپس میں اختلاف کرو گے تو آئندہ آنے والی نسلیں ایسے انتشار کا شکار ہوں گی کہ اس خلیج کو پاٹنا پھر ممکن نہیں رہے گا، اس لیے ایسا کرو کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو آخری نماز پڑھی اس پر سب متفق ہو جاؤ اور اسی کی پابندی کرو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کی اس رائے کو بہت پسند کیا اور تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ سب سے آخر میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک عورت کی نمازِ جنازہ پڑھائی تھی اور اس میں چار تکبیریں کہی تھیں۔(1) اگرچہ اس سے پہلے حضور ﷺ سے چار سے زائد تکبیریں بھی مروی ہیں۔ جیسا کہ احادیث میں موجود ہے، لیکن سب سے آخری سنت کو معمول بنالیا گیا تا کہ امت میں انتشار وافتراق کا دروازہ نہ کھلنے پائے۔ اور یہ معترضین بھی چار تکبیریں کہتے ہیں۔ اگرچہ احادیث میں زائد تکبیرات کا ذکر بھی موجود ہے۔

اسی اسوۂ فاروقی رضی اللہ عنہ کا اتباع کرتے ہوئے ہمارے علماء نے ایک خاص ثناء ایک خاص درود اور ایک خاص دعا مقرر کر دی، جو جامع ہونے کے ساتھ ساتھ آسان بھی ہے اور معمولی کوشش سے ہر آدمی اس کو یاد کر سکتا ہے۔ ہم ان معترضین سے پوچھتے ہیں کہ کیا ان کے فرقہ کے لوگ ان تمام ثناؤں اور تمام دعاؤں کو نمازِ جنازہ میں پڑھتے ہیں، اگر انہوں نے بھی کسی ایک درود اور دعا کا تعین کر لیا ہے تو پھر احناف پر ان کا یہ اعتراض کس قدر مہمل اور بے سروپا ہے؟ فافهم و تدبر۔

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 1، صفحہ 319، مکتبہ حقانیہ ملتان

Marfat.com

آپ کی مزید تسلی کے لیے اب یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جو ثنا اور جو درود ہم پڑھتے ہیں اس کا ماخذ کیا ہے؟

ا۔ ثناء

ہمارے نزدیک پہلی تکبیر کے بعد سُبحَانَکَ اللّٰھُمَّ کی ثناء بالعموم پڑھی جاتی ہے جس طرح میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اس کے بجائے اگر کوئی اور ماثورہ ثناء پڑھی جائے تب بھی نماز درست ہوگی، لیکن ہمارے نزدیک نمازِ جنازہ میں قرآنِ کریم کی کسی سورت کی قرأت فرض نہیں۔ ہاں، اگر کوئی شخص ثناء کی نیت سے سورۂ فاتحہ پڑھ لے تو اس میں بھی کوئی کراہت نہیں، البتہ امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ نمازِ جنازہ میں سورۂ فاتحہ کی قرأت فرض ہے اور اگر سورۂ فاتحہ نہ پڑھی جائے تو نمازِ جنازہ درست نہ ہوگی اور غیر مقلد صاحبان اگرچہ دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ تقلید حرام ہے لیکن اس مسئلہ میں وہ بھی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید کرتے ہیں اور قرأت فاتحہ کو فرض قرار دیتے ہیں اور اس کی فرضیت کے لیے ان کے پاس وہی دلائل ہیں جو شوافع نے اپنے مسلک کی تائید کے لیے پیش کیے ہیں۔

آیئے! آپ بھی ان دلائل کو دیکھیے اور پرکھیے اور خود ہی فیصلہ فرمایئے کہ ان دلائل کی کیا حیثیت ہے؟

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث پیش کرتے ہیں:

عَنِ ابنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیهِ وَسَلَّمَ قَرَأَ عَلَی الجَنَازَةِ بِفَاتِحَةِ الكِتَابِ۔ (1)

یعنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے جنازہ پر سورۂ فاتحہ پڑھی۔

یہ حدیث امام ترمذی نے کتاب الجنائز کے انتالیسویں باب میں ذکر کی ہے، لیکن امام ترمذی اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد خود ہی فرماتے ہیں:

1۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی القرآن علی الجنازۃ بفاتحۃ الکتاب، جلد 1، صفحہ 122، وزارت تعلیم اسلام آباد

Marfat.com

حَدِيْثُ اِبْنِ عَبَّاسٍ حَدِيْثٌ لَيْسَ اِسْنَادُهٗ بِذٰلِكَ الْقَوِیْ اِبْرَاهِيْمُ بْنُ عُثْمَانَ هُوَ اَبُوْ شَيْبَةِ الْوَاسِطِيْ مُنْكَرُ الْحَدِيْثِ۔ (1)

یعنی حضرت ابن عباس سے اس حدیث کی سند قوی نہیں۔ اس کا ایک راوی ابراہیم بن عثمان ہے، جو ابو شیبہ الواسطی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ شخص منکر الحدیث ہے۔ دوسری حدیث جو اس ضمن میں پیش کی جاتی ہے، وہ یہ ہے:

قَالَ الشَّافِعِیُّ اَخْبَرَنَا اِبْرَاهِيْمُ بْنُ مُحَمَّدٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَقِيْلٍ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وسلم كَبَّرَ عَلَى الْمَيِّتِ اَرْبَعًا وَ قَرَأَ بِاُمِّ الْقُرْاٰنِ بَعْدَ التَّكْبِيْرَةِ الْاُوْلٰى۔ (2)

یعنی حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے میت پر چار تکبیریں کہیں اور پہلی تکبیر کے بعد سورۂ فاتحہ پڑھی۔

علامہ بدرالدین عینی اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

قَالَ شَيْخُنَا (زَيْنُ الدِّيْنِ) وَ اِسْنَادُهٗ ضَعِيْفٌ۔ (3)

یعنی میرے استاد نے فرمایا کہ اس کی سند بھی ضعیف ہے۔

جب فقیر نے اس کے راویوں کے حالات معلوم کرنے کے لیے اسماء الرجال کی کتب کی طرف رجوع کیا تو حقیقت حال واضح ہوگئی۔ اگرچہ علامہ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں ابراہیم مذکور کے بارے میں علماء جرح وتعدیل کے بہت سے اقوال نقل کیے ہیں لیکن میں صرف چند اقوال کے ذکر پر اکتفا کرتا ہوں۔

قَالَ يَحْیٰ بْنُ سَعِيْدِ الْقَطَّانُ سَاَلْتُ مَالِكًا عَنْهُ، اَكَانَ ثِقَةً؟ قَالَ لَا، وَلَا ثِقَةَ فِیْ دِيْنِهٖ۔

''یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک سے اس کے متعلق پوچھا، کیا یہ ثقہ تھا؟

1۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی القرآن علی الجنازۃ بفاتحۃ الکتاب، جلد 1، صفحہ 122، وزارت تعلیم اسلام آباد

2۔ عمدۃ القاری، جلد 7، صفحہ 52 3۔ ایضاً

Marfat.com

آپ نے فرمایا نہیں اور اپنے دین میں بھی ثقہ نہیں ہے۔

حضرت امام احمد کے فرزند عبداللہ سے امام مذکور نقل کرتے ہیں:

كَانَ قَدَرِ يًّا مُعْتَزِلِيًّا جَهْمِيًّا كُلِّ بِلاءٍ فِيهِ۔

یہ بدعقیدہ تھا۔ قدری، معتزلی جہمی۔ نظریاتِ فاسدہ کا حامل تھا۔ اس میں ہر طرح کا عیب موجود تھا۔

وَ قَالَ الْبُخَارِیُّ جَهْمِیٌّ، تَرَكَهُ ابْنُ الْمُبَارَكِ وَالنَّاسُ۔

امام بخاری فرماتے ہیں یہ جہمی عقیدے کا تھا۔ عبداللہ بن مبارک اور لوگوں نے اس سے روایت ترک کردی۔ (1)

علامہ ابن حجر جو خود شافعی ہیں، لکھتے ہیں کہ لوگ اس بات پر حیران تھے کہ امام شافعی ایسے شخص کی روایت کو نقل کرتے ہیں۔ اس کی وجہ علامہ ابن حجر بتاتے ہیں کہ ابتدائی دور میں امامِ شافعی ابراہیم کے پاس بیٹھا کرتے، جب آپ مصر تشریف لے گئے اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا تو آپ کی کتابیں آپ کے ہمراہ نہ تھیں، اس لیے مجبوراً اپنی یادداشت کا سہارا لیا اور بسا اوقات ابراہیم کے نام کی جگہ اس کی کنیت ذکر کردی۔ (2)

یہ وہ دو مرفوع حدیثیں ہیں، جن میں یہ مذکور ہے کہ حضور ﷺ نے نمازِ جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھی۔ ان کی سند کا حال آپ نے ملاحظہ فرمالیا۔ ان کے علاوہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک اور روایت ہے جو سند کے اعتبار سے صحیح ہے، لیکن اس میں یہ مذکور نہیں کہ حضور ﷺ نے سورۂ فاتحہ پڑھی، بلکہ ان کا اپنا تعامل بیان کیا گیا ہے، لیکن ان کے مقابلے میں حضرت عبداللہ بن عمر اور عبدالرحمٰن بن عوف کا ارشاد ہے:

لَيْسَ فِيهَا قِرَاءَةُ شَيْءٍ مِّنَ الْقُرْآنِ۔ (3)

نمازِ جنازہ میں قرأت قرآن فرض نہیں ہے۔

1۔ تہذیب التہذیب، جلد 1، صفحہ 158 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 60-159

3۔ المبسوط، جلد 2، صفحہ 102، دار الکتب العلمیہ بیروت

اور جن روایات میں قرأتِ فاتحہ کا ذکر ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے فاتحہ بطور ثناء پڑھی اور یہ ہمارے نزدیک بھی جائز ہے۔ نیز بڑی واضح بات یہ ہے کہ بہت سے جلیل القدر صحابہ کرام سے مروی ہے کہ وہ نمازِ جنازہ میں سورۂ فاتحہ نہیں پڑھا کرتے تھے۔

علامہ بدرالدین عینی عمدۃ القاری میں لکھتے ہیں:

وَ قَالَ ابْنُ بَطَّالٍ وَمَنْ كَانَ لَا يَقْرَأُ فِي الصَّلٰوةِ عَلَى الْجَنَازَةِ وَ يُنْكِرُ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ وَ عَلِيُّ ابْنُ اَبِي طَالِبٍ وَ ابْنُ عُمَرَ وَ اَبُوْهُرَيْرَةَ۔ (1)

یعنی صحابہ کرام میں سے جو لوگ نمازِ جنازہ میں سورۂ فاتحہ نہیں پڑھتے تھے اور پڑھنے والوں کو منع کرتے تھے، ان میں حضرت عمر فاروق، حضرت علی المرتضیٰ، عبداللہ بن عمر اور حضرت ابو ہریرہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں۔

اور تابعین میں سے جو اس مسلک پر کاربند تھے: عطاء، طاؤس، سعید بن مسیب، ابن سیرین، سعید بن جبیر، شعبی اور حاکم کے اسماء ذکر کیے جاتے ہیں۔

(عمدۃ القاری جلد ۷ صفحہ ۵۱ کتاب الجنائز باب قرأۃ الفاتحہ)

آپ غور فرمائیے کہ کیا آپ کا ذہن اس بات کو قبول کرتا ہے کہ سورۂ فاتحہ نمازِ جنازہ میں پڑھنا فرض ہو اور حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہما جیسی جلیل القدر ہستیوں کو اس کا علم نہ ہو؟ کیا ان حضرات نے جن لوگوں کی نمازِ جنازہ بغیر فاتحہ کے پڑھائی وہ نمازِ جنازہ ترکِ فرض کے باعث صحیح تصور ہو سکتی ہے؟ اس لیے ان حضرات کا اس بات پر اصرار بداہت عقل کے خلاف ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور دلیل پیش کی جاتی ہے کہ حدیث پاک میں ہے:

لَا صَلٰوةَ اِلَّا بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ۔(2)

(سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہے)

بے شک یہ حدیث صحیح ہے، اس حدیث میں صلوٰۃ سے جو نماز مراد ہے، وہ حقیقی نماز ہے۔

1۔ عمدۃ القاری، جلد 7، صفحہ 51   2۔ بحوالہ الہدایہ مع حاشیہ باب صفۃ الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 106

Marfat.com

آپ خود ہی فرمائیے کہ جس نماز میں نہ رکوع ہے نہ سجدہ اسے حقیقتاً نماز کہنا کہاں تک درست ہے۔ کیا اس لیے کہ نمازِ جنازہ کے لیے وضو اور روبقبلہ ہونا شرط ہے؟ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے تو پھر سجدۂ تلاوت کو بھی نماز کہنا چاہیے کیونکہ طہارت اور قبلہ رو ہونا اس میں بھی شرط ہے۔

اس تفصیل سے روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ نمازِ جنازہ میں سورۂ فاتحہ کی قرأت فرض نہیں اور اگر بطورِ حمد و ثناء کوئی پڑھے تو ہمارے نزدیک بھی مکروہ نہیں ہے۔

اب مجھے عرض کرنا ہے کہ جو ثناء ہم پڑھتے ہیں وہ کہاں سے ماخوذ ہے؟ اس کے متعلق گزارش ہے کہ فقہ حنبلی کی مشہور کتاب المغنی جلد اول صفحہ ۴۷۴ پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ ثناء مذکور ہے۔ البتہ اس میں جَلَّ ثَنَاءُکَ کے الفاظ نہیں ہیں، اس کے علاوہ دوسری ثنائیں بھی وہاں مذکور ہیں۔

صاحب ہدایہ لکھتے ہیں کہ اس ثناء میں جَلَّ ثَنَاؤُکَ کے الفاظ احادیث مشہورہ میں مذکور نہیں ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جل ثناؤک کے الفاظ کسی حدیث میں بھی مذکور نہیں۔ علامہ ابن ہمام فتح القدیر شرح ہدایہ میں لکھتے ہیں:

وَاِنْ کَانَ رُوِیَ فِی الْجُمْلَةِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِیْ حَدِیْثٍ طَوِیْلٍ مِنْ قَوْلِهٖ ذَکَرَ ابْنُ اَبِیْ شَیْبَةَ وَ ابْنُ مَرْدَوَیْهِ فِیْ کِتَابِ الدُّعَاءِ لَهٗ وَرَوَاهُ الْحَافِظُ اَبُوْ شُجَاعٍ فِیْ کِتَابِ الْفِرْدَوْسِ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ مِنْ اَحَبِّ الْکَلَامِ اِلَی اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ اَنْ یَّقُوْلَ الْعَبْدُ سُبْحَانَکَ اللّٰهُمَّ وَ بِحَمْدِکَ وَ تَبَارَکَ اسْمُکَ وَ تَعَالٰی جَدُّکَ وَجَلَّ ثَنَاؤُکَ وَلَا اِلٰهَ غَیْرُکَ۔ وَاَبْغَضُ الْکَلَامِ اِلَی اللّٰهِ تَعَالٰی اَنْ یَّقُوْلَ الرَّجُلُ لِلرَّجُلِ۔ "اتَّقِ اللّٰهَ فَیَقُوْلُ عَلَیْکَ نَفْسَکَ۔

یعنی حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ترین کلام یہ ہے کہ بندہ کہے: سُبْحَانَکَ اللّٰهُمَّ ...... الخ اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے ناپسندیدہ بات یہ ہے کہ کوئی شخص کسی سے کہے، خدا سے ڈرو، تو وہ جواب دے عَلَیْکَ نَفْسَکَ تو اپنا خیال کر۔ (فتح القدیر جلد اول ص ۲۰۳)

Marfat.com

اس روایت میں جَلَّ ثَنَاؤُکَ کے الفاظ موجود ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ترین کلام ہے، ہم نمازِ جنازہ کا استفتاح اللہ تعالیٰ کی ایسی حمد و تعریف سے کرتے ہیں جو اس جناب میں بڑی پسندیدہ ہے۔ نامعلوم، یہ کون سا ناقابل عفو جرم ہے جس کے خلاف یہ غوغہ آرائی کی جاتی ہے؟

۲۔ درود شریف

سنت یہ ہے کہ دوسری تکبیر کے بعد شفیع المذنبین رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود پاک پڑھا جائے اور جو درود شریف التحیات میں پڑھا جاتا ہے، اس کا پڑھنا اولیٰ یعنی بہتر ہے۔ چنانچہ صاحب فتح القدیر لکھتے ہیں:

وَيُصَلِّیْ بَعْدَ التَّكْبِيْرَةِ الثَّانِيَةِ كَمَا يُصَلِّیْ فِی التَّشَهُّدِ وَهُوَ اَوْلٰی۔

(فتح القدیر جلد اول ص ۴۵۹)

یعنی دوسری تکبیر کے بعد درود شریف پڑھیں جیسے تشہد میں پڑھتے ہیں۔ یہ تشہد والا درود شریف اولیٰ اور بہتر ہے۔

علامہ ابن قدامہ جو حنبلی فقہ کے مایہ ناز عالم ہیں، اپنی کتاب المغنی میں لکھتے ہیں:

وَ يُكَبِّرُ الثَّانِيَةَ وَ يُصَلِّیْ عَلَی النَّبِیِّ كَمَا يُصَلِّیْ عَلَيْهِ فِی التَّشَهُّدِ وَاِنْ اَتٰی بِهَا عَلٰی غَيْرِ مَا ذُكِرَ فِی التَّشَهُّدِ فَلَا بَاْسَ لِاَنَّ الْقَصْدَ مُطْلَقُ الصَّلٰوةِ۔ (1)

(المغنی جلد دوم ص ۴۸۷)

یعنی دوسری تکبیر کہے اور تشہد والا درود شریف پڑھے، اگر اس نے اس کے علاوہ کوئی اور درود شریف پڑھا، پھر بھی کوئی حرج نہیں، کیونکہ مطلق درود شریف پڑھنا مقصود ہے۔

اس کے علاوہ علامہ موصوف نے لکھا ہے کہ یہ درود شریف بھی پڑھا جا سکتا ہے:

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مَلَائِكَتِكَ الْمُقَرَّبِيْنَ وَاَنْبِيَائِكَ الْمُرْسَلِيْنَ وَ اَهْلِ طَاعَتِكَ اَجْمَعِيْنَ مِنْ اَهْلِ السَّمٰوٰتِ وَ اَهْلِ الْاَرْضِيْنَ۔ اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ۔ (2)

1۔ المغنی لابن قدامہ، جلد 2، صفحہ 487، دار المنار القاہرہ

2۔ ایضاً

Marfat.com

اے اللہ! درود بھیج اپنے فرشتوں پر، اپنے بھیجے ہوئے انبیاء پر اور زمین و آسمان کے ساکنین میں سے جملہ اہل طاعت پر، بے شک تو ہر شئے پر قادر ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ نمازِ جنازہ میں دوسری تکبیر کے بعد کوئی سا بھی درود شریف پڑھا جائے، نماز درست ہوگی، البتہ اولیٰ یہ ہے کہ التحیات والا درود شریف پڑھا جائے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ التحیات والا درود کون سا ہے؟ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے مطالعہ کی توفیق عطا فرمائی ہے، وہ جانتے ہیں کہ اس درود شریف کے الفاظ بھی ایک جیسے نہیں۔ ایک حدیث میں تو وہ الفاظ ہیں جو عام طور پر ہم التحیات میں پڑھتے ہیں۔ اس کے علاوہ امام بخاری کی اس حدیث کو ملاحظہ فرمائیے:

اَخْبَرَنِیْ اَبُوْ حَمِیْدِ السَّاعِدِیُّ قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! کَیْفَ نُصَلِّیْ عَلَیْکَ؟ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم قُوْلُوْا: اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ اَزْوَاجِہٖ وَ ذُرِّیَّتِہٖ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی آلِ اِبْرَاھِیْمَ وَ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاَزْوَاجِہٖ وَ ذُرِّیَّتِہٖ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی آلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ (1)

حضرت ابوحمید الساعدی نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! ہم حضور پر کس طرح درود شریف پڑھیں تو ارشاد فرمایا کہ یوں پڑھو: اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاَزْوَاجِہٖ وَ ذُرِّیَّتِہٖ الخ ......

اس درودِ پاک کے الفاظ میں اور عام درود شریف کے الفاظ میں جو فرق ہے وہ بالکل واضح ہے۔ سب الفاظ حضور کریم ﷺ کے ارشادات ہیں، سب بجا ہیں، سب حق ہیں، سب نور ہیں۔ ان میں سے جس پر بھی عمل کیا جائے درست ہے۔ کسی ایک پر عمل کرنا اور دوسروں کو ناجائز یا نامکمل کہنا کسی جاہل کا شیوہ تو ہوسکتا ہے، لیکن ایک عالم اور محقق کو یہ بات کسی طرح زیب نہیں دیتی۔

اس کے علاوہ احادیث صحیحہ میں درودِ پاک کے اور بھی صیغے ہیں۔ ابن ماجہ کی ایک

1۔ صحیح بخاری، باب ھل یصلی علی غیر النبی ﷺ، جلد 2، صفحہ 941

حدیث بھی سماعت فرمائیے:

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ اِذَا صَلَّیْتُمْ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللّٰه علیه وآله وسلم فَاَحْسِنُوا الصَّلَاةَ عَلَیْهِ۔ فَاِنَّكُمْ لَا تَدْرُوْنَ لَعَلَّ ذٰلِكَ یُعْرَضُ عَلَیْهِ۔ قَالَ فَقَالُوْا لَهٗ فَعَلِّمْنَا۔ فَقَالَ: قُوْلُوْا: اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ صَلٰوتَكَ وَ رَحْمَتَكَ وَ بَرَكَاتِكَ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَ اِمَامِ الْمُتَّقِیْنَ وَ خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَ رَسُوْلِكَ وَ اِمَامِ الْخَیْرِ وَ قَائِدِ الْخَیْرِ وَ رَسُوْلِ الرَّحْمَةِ۔ اَللّٰهُمَّ ابْعَثْهُ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا یَّغْبِطُهٗ بِهِ الْاَوَّلُوْنَ وَالْاٰخِرُوْنَ۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاهِیْمَ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاهِیْمَ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ (1) (ابن ماجہ شریف ص ٦٥)

یعنی حضرت ابن مسعود نے لوگوں کو کہا کہ جب نورِ مجسم ﷺ پر درود پڑھو، بڑے خوبصورت انداز سے پڑھا کرو۔ تم اس حقیقت کو نہیں جانتے، تمہارا درود بارگاہِ رسالت میں پیش کیا جاتا ہے۔ حاضرین نے عرض کی کہ آپ ہمیں ایسا درود شریف سکھائیے۔ حضرت ابن مسعود نے کہا کہ یوں درود شریف پڑھا کرو............ الخ۔

ان پیارے پیارے الفاظ کے آبگینوں میں محبت، ادب اور والہیت کی جو شرابِ طہور چھلک رہی ہے، اس سے اہل ذوق ہی پوری طرح لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

یہ امر قابل غور ہے کہ حضرت ابن مسعود کے اس درود پر کسی صحابی نے اعتراض نہ کیا کہ یہ من گھڑت درود آپ نے کہاں سے نکالا۔ آج تک کسی عالم ربانی نے حضرت ابن مسعود سے استنکار کیا؟ رہے علمائے سو تو ان سے ہمارا کوئی سروکار نہیں، ان کا فیصلہ روزِ محشر داورِ محشر خود فرمائے گا۔ ایک اور ایمان افروز واقعہ بھی سن لیجئے۔ اس واقعہ کے ناقل علامہ ابن

1۔ سنن ابن ماجہ، باب الصلوٰۃ علی النبی ﷺ، صفحہ 65، وزارت تعلیم اسلام آباد

Marfat.com

قیم ہیں، جو اس طائفہ کے امام اور مقتدا ہیں۔ اسے پڑھ کر آپ کا ایمان تازہ ہو جائے گا اور معترضین کی فضول گوئی آپ پر عیاں ہو جائے گی۔

قَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ الْحَكَمِ رَاَيْتُ الشَّافِعِيَّ فِي النَّوْمِ فَقُلْتُ مَا فَعَلَ اللّٰهُ بِكَ؟ قَالَ رَحِمَنِيْ وَ غَفَرَلِيْ وَ زَفَّنِيْ اِلَى الْجَنَّةِ كَمَا تُزَفُّ الْعَرُوْسُ وَ نَثَرَ عَلَيَّ كَمَا يُنْثَرُ عَلَى الْعَرُوْسِ. فَقُلْتُ بِمَا بَلَغْتَ هٰذِهِ الْحَالَ. قَالَ لِيْ قَائِلٌ يَقُوْلُ لَكَ بِمَا فِيْ كِتَابِ الرِّسَالَةِ مِنَ الصَّلٰوةِ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ قُلْتُ فَكَيْفَ ذٰلِكَ قَالَ وَ صَلَّى اللّٰهُ عَلٰى مُحَمَّدٍ عَدَدَ مَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ وَ عَدَدَ مَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ۔ (1)

یعنی عبد اللہ بن حکم کہتے ہیں کہ میں نے امام شافعی کو خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیسا سلوک کیا؟ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر رحم فرمایا، مجھے بخش دیا اور مجھے جنت میں اس طرح لے جایا گیا، جس طرح دلہن کو لے جایا کرتے ہیں۔ مجھ پر (رحمت کے پھول) اس طرح نچھاور کیے گئے، جس طرح دلہن پر نچھاور کیے جاتے ہیں۔ میں نے پوچھا: یہ عزت افزائی کس بات کا صلہ ہے؟ تو کہنے والے نے مجھے کہا کہ اپنی کتاب الرسالۃ میں تو نے نبی کریم ﷺ پر جو درود پڑھا ہے، یہ اس کا صلہ ہے۔ عبد اللہ کہتے ہیں، میں نے پوچھا: اے امام! وہ درود شریف کس طرح ہے؟ امام شافعی نے فرمایا وہ درود شریف اس طرح ہے:

وَ صَلَّى اللّٰهُ عَلٰى مُحَمَّدٍ عَدَدَ مَا ذَكَرَهُ الذَّاكِرُوْنَ وَ عَدَدَ مَا غَفَلَ عَنْ ذِكْرِهِ الْغَافِلُوْنَ۔ (جلاالافہام ص ۲۸۴)

اس سے واضح ہوا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب الرسالۃ کے خطبہ میں محبت بھرے الفاظ میں جب اللہ تعالیٰ کے حبیب پر درود لکھا، جس کا ذکر صحاح کی کسی کتاب میں نہیں، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ عزت افزائی فرمائی۔ معلوم ہوا کہ دل محبت

1۔ جلاء الافہام، صفحہ 284، مطبعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ دمشق

Marfat.com

سے لبریز ہو، روح عشق مصطفوی ﷺ سے سرشار ہو، الفاظ میں خلوص، نیاز اور ادبِ مصطفوی ﷺ کا نور چمک رہا ہو، تو اللہ تعالیٰ ایسے درود کو قبول فرماتا ہے اور وہ اجر مرحمت کرتا ہے جس کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ خدا ان لوگوں پر رحم کرے کہ خشک مزاجی نے محبت کی لطافتیں ان سے سلب کر لیں اور ہر چیز پر قدغن لگانا ان کا وطیرہ بن گیا ہے۔

ضمناً درود پاک کے بارے میں یہ چند چیزیں ذکر کر دی گئیں۔ اصل مقصد تو عرض کرنا ہے کہ ہم نمازِ جنازہ میں جو درود شریف پڑھتے ہیں، اس میں سَلَّمْتَ اور تَرَحَّمْتَ کے الفاظ کیوں ذکر کیے جاتے ہیں؟ اس کا واضح جواب تو یہ ہے کہ حضرت ابن مسعود کی ہدایت کے مطابق یہ کلمات بڑھا کر ہم اس درودِ پاک کے حسن و کمال میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں، لیکن اگر کوئی شخص حسن و کمال کا قائل ہی نہ ہو تو اس کے اطمینان کے لیے گزارش ہے کہ نماز میں جو درود پڑھا جاتا ہے، اس میں سلمت کا لفظ نہیں ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے نمازی اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَکَاتُهٗ کے الفاظ سے اپنے محبوب کریم ﷺ کی بارگاہِ جمال میں ہدیۂ تسلیم پیش کر چکا ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے بعد صرف صلوٰۃ پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔ نمازِ جنازہ میں کیونکہ سلام کے وہ الفاظ ذکر نہیں کیے جاتے اس لیے یہاں سَلَّمْتَ کا لفظ بڑھا کر ہم ارشادِ الٰہی صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا کی تعمیل کرتے ہیں۔ یعنی میرے رسول پر صلوٰۃ و سلام دونوں بھیجو! علماء نے لکھا ہے کہ صرف صلوٰۃ بھیجنا اور سلام نہ بھیجنا مکروہ ہے۔ باقی رہا تَرَحَّمْتَ کا لفظ، تو اس کے لیے یہ حدیث شریف بطورِ سند پیش خدمت ہے۔ اس حدیث میں اس درود شریف کا ذکر ہے جو التحیات میں پڑھا جاتا ہے:

عَنْ اِبْنِ مَسْعُوْدٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ اِذَا تَشَهَّدَ اَحَدُکُمْ فِی الصَّلٰوةِ فَلْیَقُلْ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ وَ بَارَکْتَ وَ تَرَحَّمْتَ عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ وَ عَلٰی آلِ اِبْرَاهِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ (1)

1۔ المستدرک، باب صیغ الصلوٰۃ بعد التشہد، جلد 1، صفحہ 269، مطبوعہ ریاض

Marfat.com

اس درودِ پاک میں، جس کو تشہد میں پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے، تَرَحَّمْتَ کے الفاظ موجود ہیں۔ اب حیرت ہے ان لوگوں کی کج ادائی پر کہ جو ایسے رقیق اعتراض کرتے ہیں۔

الدعاء

اگر آپ کتب حدیث کا مطالعہ فرمائیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ حضور ﷺ نے مختلف اوقات میں میت کے لیے دعائے مغفرت مختلف الفاظ میں فرمائی ہے۔ کوئی سی بھی دعا اگر تیسری تکبیر کے بعد پڑھ لی جائے تو نمازِ جنازہ درست ہو جائے گی۔ ان دعاؤں میں سے ایک دعا یہ ہے جو ہم پڑھتے ہیں: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَ مَيِّتِنَا .... الخ (2)

اب کسی کا یہ ضد کرنا کہ فلاں دعا پڑھنا بدعت ہے۔ ایسے حضرات کے ساتھ ہمارا رویہ اس طرح ہونا چاہیے جو رب تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے:

وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾ (الفرقان)

ہم انہیں سلامت رہو کا جواب دیتے ہوئے کسی اور اہم اور نفع بخش کام میں مصروف ہو جائیں گے۔

1۔ المستدرک، باب ادعیہ صلوٰۃ الجنازۃ، جلد 1، صفحہ 358

Marfat.com

حضرت سیدنا

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ

Marfat.com

نَحۡمَدُهٗ وَ نَسۡتَعِیۡنُهٗ وَ نَسۡتَغۡفِرُهٗ وَ نُؤۡمِنُ بِهٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡهِ وَ نُصَلِّیۡ وَ نُسَلِّمُ وَ نُبَارِکُ عَلٰی صَفۡوَةِ الۡاَنۡبِیَاءِ اِمَامِ الرُّسُلِ سَیِّدِنَا وَ مَوۡلَانَا مُحَمَّدِنِ الۡمَبۡعُوۡثِ رَحۡمَةً لِّلۡعَالَمِیۡنَ وَ عَلٰی آلِهٖ وَ اَصۡحَابِهٖ لَا سِیَّمَا اَفۡضَلِ الۡبَشَرِ بَعۡدَ الۡاَنۡبِیَاءِ بِالتَّحۡقِیۡقِ سَیِّدِنَا اَبِیۡ بَکۡرِنِ الصِّدِّیۡقِ، الۡعَتِیۡقِ مِنَ النَّارِ وَالرَّفِیۡقِ فِی الۡغَارِ وَ عَلٰی کُلِّ مَنِ اقۡتَفٰی آثَارَهٗ اِلٰی یَوۡمِ الدِّیۡنِ۔

ضیائے حرم کا یہ شمارہ

صدیق اکبر نمبر ہے رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ عنا۔

کون صدیق اکبر؟

وہی جب ظلمت کدۂ عالم میں رسالت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چراغ فروزاں ہوا تھا، تو مردوں میں سب سے پہلے جو پروانہ وار اس پر سو جان سے قربان ہونے کے لیے آگے بڑھا تھا، جس نے بارگاہِ جمال میں نذرانۂ دل پیش کرنے سے پہلے کوئی معجزہ، کوئی دلیل طلب نہیں کی تھی۔

جس نے نگاہِ ناز کا اشارہ پاتے ہی بلا تامل نقد جان حاضر کر دی تھی۔

عرب کے خودسر معاشرہ میں جس کی شخصیت اپنی ذاتی خوبیوں کے باعث بڑی محترم اور انتہائی قابل اعتماد تھی۔

آپ کے مشرف باسلام ہونے سے مکہ کے چیدہ چیدہ لوگ خود بخود مسلمان ہو گئے تھے۔ ان میں حضرت زبیر، حضور کے پھوپھی زاد، حضرت عثمان، بنی امیہ کے رئیس اعظم، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت طلحہ جیسی عالی مرتبت ہستیاں شامل تھیں (1) رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ وہی رحم دل اور کریم النفس، جو اپنے غریب مسلمان بھائی بہنوں کو ان کے ظالم آقاؤں کی جور و ستم کی چکی میں پستے دیکھ کر بے تاب ہو جاتا، اپنی جیب سے قیمت ادا کر کے ان کو خریدتا، پھر انہیں رضائے الٰہی کے لیے آزاد کر دیتا۔ (حضرت بلال، عامر بن فہیرہ

1۔ الاصابہ لابن حجر العسقلانی، جلد 2، صفحہ 334، مکتبۃ التجاریہ الکبریٰ مصر

نیز کئی کنیزیں زنیرہ، نہدیہ، اس کی بچی اور ام عمیس، ان کو آپ نے ہی ان کے ظالم آقاؤں سے خرید کر آزاد کر دیا تھا۔(1)

وہ ابوبکر، جس نے اپنے حبیب سے پیمانِ وفا باندھا اور تادم واپسیں اسے مردانہ وار نبھایا۔

جس نے ہر ضرورت کے وقت اپنے آقا کی دعوت پر اپنے گھر کا سارا اثاثہ لا کر قدموں میں ڈال دیا۔ عزیمت و مردانگی کی راہ پر جس کا ہر نقش قدم کاروانِ ملت کے لیے خضر راہ ہے۔ جرأت و یقین کی جو قندیلیں، راہِ عشق و وفا میں آج سے چودہ صدیاں پہلے اس مردِ حق آگاہ نے روشن کی تھیں، ابتلاء و آزمائش کی کٹھن اور پر خار وادیاں آج بھی ان کی روشنی سے جگمگا رہی ہیں۔ جو سپہرِ اسلام پر آفتاب بن کر طلوع ہوا اور تا ابد ضوفشانی کرتا رہے گا۔ نگاہِ قدرت نے جس کو روزِ ازل سے اپنے محبوب کریم ﷺ کی رفاقت کے لیے چن لیا تھا۔ اسلام لانے سے پہلے بھی جس کا دامن شرک سے کبھی آلودہ نہیں ہوا۔ جس نے شراب کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔

جس کے خلوص و ایثار کو بارگاہِ نبوت سے یوں داد ملی:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا لِاَ حَدٍ عِنْدَنَا یَدٌ اِلَّا وَقَدْ کَافَاْنَاهُ مَا خَلَا اَبَابَکْرٍ فَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا یَدًا یُکَافِئُهُ اللّٰهُ بِهَا یَوْمَ الْقِیَامَةِ. وَ مَا نَفَعَنِیْ مَالُ اَحَدٍ قَطُّ مَانَفَعَنِیْ مَالُ اَبِیْ بَکْرٍ. لَوْ کُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِیْلًا لَاتَّخَذْتُ اَبَابَکْرٍ خَلِیْلًا اَلَا وَاِنَّ صَاحِبَکُمْ خَلِیْلُ اللّٰهِ. (2)

ترجمہ: نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ابوہریرہ روایت کرتے ہیں:

''کسی نے ہم پر احسان نہیں کیا مگر ہم نے اس کا بدلہ اسے دے دیا سوائے ابوبکر کے، اس کے احسانات کا بدلہ قیامت کے دن اسے اللہ تعالیٰ دے گا۔ مجھے کسی کے مال نے اتنا

1۔ اسد الغابہ لابن اثیر، جلد 3، صفحہ 218، مکتبہ اسلامیہ طہران

2۔ جامع ترمذی، باب مناقب ابی بکر الصدیق، جلد 2، صفحہ 207

Marfat.com

نفع نہیں دیا جتنا نفع مجھے ابو بکر کے مال نے دیا ہے۔ اگر میں نے کسی کو خلیل بنانا ہوتا تو ابو بکر کو خلیل بناتا۔ خبردار! تمہارا نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کا خلیل ہے"۔

جس کو زبانِ رسالت نے یہ مژدہ سنایا ہو:

يَا اَبَابَكْرٍ اَنْتَ صَاحِبِىْ عَلَى الْحَوْضِ وَ صَاحِبِىْ فِى الْغَارِ۔ (1)

"اے ابو بکر! تو حوضِ کوثر پر بھی میرے ساتھ ہوگا اور غار میں بھی تو میرے ساتھ تھا"۔

رحمت عالم ﷺ نے ایک روز ارشاد فرمایا: نمازیوں کو جنت میں ایک خاص دروازے سے بلایا جائے گا۔ مجاہد کو باب جہاد سے اذن باریابی بخشا جائے گا۔ روزہ دار کو باب ریان سے اندر آنے کی اجازت دی جائے گی۔ لیکن اے ابو بکر! تجھے جنت کے تمام دروازوں سے پکارا جائے گا۔(2)

جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے محبوب نے فرمایا:

اَرْحَمُ اُمَّتِىْ بِاُمَّتِىْ اَبُوْبَكْرٍ (3)

"میری امت میں سب سے زیادہ میری امت کے ساتھ رحمدلی کرنے والا ابو بکر ہے"۔

جس کو حضور نے اپنے آخری سفر جہاد (غزوۂ تبوک) میں اسلام کے لشکر کا پرچم عطا فرمایا تھا۔ جسے نبی کریم رؤف رحیم ﷺ نے اپنی آخری علالت کے دنوں میں حکم دیا تھا کہ ابو بکر امامت کے فرائض انجام دے:

مُرُوْا اَبَابَكْرٍ فَلْيُصَلِّ بِالنَّاسِ۔ (4)

"ابو بکر کو حکم دو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائے"۔

وہ ابو بکر جس کے بارے میں سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے یہ ایمان افروز ارشاد فرمایا تھا:

1۔ جامع ترمذی، باب مناقب ابی بکر الصدیق، جلد 2، صفحہ 208

2۔ صحیح بخاری، باب قول النبی ﷺ لو کنت متخذ اخلیلا، جلد 1، صفحہ 517

3۔ المستدرک، باب افرض الناس زید بن ثابت، جلد 3، صفحہ 422

4۔ جامع ترمذی، باب مناقب ابی بکر الصدیق، جلد 2، صفحہ 208

Marfat.com

عَنِ الْحَسَنِ عَنْ عَلِيٍّ لَقَدْ اَمَرَ النَّبِیُّ صلی اللّٰہ تعالٰی علیه وسلم اَبَابَکْرٍ اَنْ یُّصَلِّیَ بِالنَّاسِ۔ وَ اِنِّیْ لَشَاهِدٌ وَّ مَا اَنَا بِغَائِبٍ وَمَا بِیْ مَرَضٌ۔ وَّ رَضِیْنَا لِدُنْیَانَا مَا رَضِیَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لِدِیْنِنَا۔ (1)

''حضرت امام حسن، سیدنا علی سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ابوبکر کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائے۔ جب یہ حکم ہوا تو میں بھی اس جگہ موجود تھا۔ غیر حاضر بھی نہیں تھا اور بیمار بھی نہیں تھا۔ پس جس ہستی کو نبی کریم ﷺ نے ہمارے دین کی امامت کے لیے پسند فرمایا، اسی کو ہم اپنی دنیا کی امامت کے لیے پسند کرتے ہیں''۔

وہی ابوبکر، جس کو اسد اللہ الغالب نے اشجع الناس یعنی سب لوگوں سے زیادہ شجاع اور بہادر کہا تھا۔(2) جس کی اولوالعزمی نے حضور سرورِ کائنات ﷺ کے وصال کے بعد سفینۂ ملت کو طوفانی موجوں اور خطرناک گردابوں سے نکال کر ساحل مراد تک پہنچایا۔

جس کی ضربت قاہرانہ نے نبوت کے جھوٹے مدعیوں کو پاش پاش کر دیا تھا۔

جس کی ایک نگاہِ عتاب آلود نے شیطان کے بھڑکائے ہوئے شعلوں کو ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلا دیا تھا۔ اسی صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بارگاہِ رفعت پناہ میں ''ضیائے حرم'' اپنے اہل قلم معاونین کی معیت میں ہدیۂ عقیدت و محبت پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے آج سے پانچ سال پہلے ضیائے حرم مئی جون ۱۹۷۴ء کا شمارہ فاروقِ اعظم نمبر تھا۔ اس وقت ملک پر ایک عجیب بحرانی کیفیت طاری تھی۔ الحادی قوتیں بڑی بے دردی سے دین کے اس گلستان کو اجاڑنے پر کمربستہ تھیں۔ سوشلزم کا طوفان امڈا چلا آ رہا تھا۔ دل کو ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں اس طوفان کی تند و تیز موجیں اسلام کی رہی سہی قدروں کو بھی روند نہ ڈالیں۔ پاکستان کی فضاؤں میں ''ایشیا سرخ ہے'' کے بینر ہر

1۔ اسد الغابہ، جلد 3، صفحہ 221 2۔ تاریخ الخلفاء للسیوطی، صفحہ 35، نور محمد اصح المطابع کراچی

Marfat.com

سولہرانے لگے تھے۔ یہ ملک جس کو حاصل کرنے والوں نے اسلام کا قلعہ بنانے کے لیے حاصل کیا تھا، اس کی شاہراہوں پر ''سوشلزم ہماری معیشت ہے'' کے نعرے گونج رہے تھے۔ بدقسمتی سے ملک کی زمام حکومت ان لوگوں کے ہاتھوں میں آ گئی تھی جو دین اسلام کو دیگر مذاہب کی طرح فرسودہ اور ازکار رفتہ خیال کرتے تھے۔ انہیں ہر اس چیز سے چڑ تھی جو کسی جہت سے اسلام سے متعلق تھی۔ رہ رہ کے یہ ڈراؤنا خیال آتا تھا اور دل ڈوب جاتا تھا کہ کیا پاکستان سے اسلام کو جلاوطن کر دیا جائے گا؟ کیا یہاں قرآن کریم کے بجائے اینجلز اور کارل مارکس کا فلسفۂ حیات نافذ ہوگا؟ کیا یہاں رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شریعت طیبہ کے بجائے لینن اور سٹالن کے افکار کو بالادستی حاصل ہوگی؟

ان ہوش ربا اور مایوس کن حالات میں حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا ذکر پاک ہی ان جملہ امراض کے لیے اکسیر کا کام دے سکتا تھا۔ آپ کی سیرت کی سادگی اور کردار کا جلال ہی ان فتنوں کو موت کی نیند سلا سکتا تھا۔ انہیں مقاصد کے لیے ان ناگفتہ بہ حالات میں ضیائے حرم نے فاروقِ اعظم نمبر اپنی ملت کے نوجوانوں کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی تھی، جسے تمام علمی حلقوں میں بے پناہ پذیرائی اور مقبولیت نصیب ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ملک کی زمامِ اقتدار آج جس شخص کے ہاتھ میں ہے وہ اسلام کا سچا اور مخلص خادم ہے۔ ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ وہ اسلام کا نام سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال نہیں کر رہا۔ اس کا دلی ارادہ ہے کہ اسلام پورے جاہ و جلال کے ساتھ یہاں نافذ کیا جائے، لیکن یہ راستہ اتنا ہموار اور آسان نہیں جتنا بادی النظر میں وہ دکھائی دیتا ہے۔ اس میں مہیب چٹانیں اور خوفناک گہرے کھڈ موجود ہیں۔ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ دوصد سالہ دورِ غلامی نے ہمارے ایمان و یقین کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ دین اسلام کے نفاذ کے لیے ضروری ہے کہ اسے نافذ کرنے والا بھی یقین سے سرشار ہو۔ دین حنیف کی برتری اور افادیت کے بارے میں اس کے دل کے کسی گوشے میں شک و شبہ کا نشان تک نہ ہو اور جس ملک میں اس نظام کو نافذ کیا جا رہا ہے، اس کے بسنے والے بھی

Marfat.com

اس نظامِ حیات کی برتری اور افادیت پر کامل یقین رکھتے ہوں۔ بیشک اسلام عمل صالح کی دعوت دیتا ہے اور اسی عمل صالح کو فلاحِ دارین کا ضامن قرار دیتا ہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اسلام کی نگاہ میں عمل سے کہیں زیادہ ایمان کو اہمیت حاصل ہے۔ یہی وہ قوت ہے جو عمل میں خلوص اور توانائی پیدا کرتی ہے اور اس کے رخِ زیبا کو خودغرضی اور ریاکاری کے داغوں سے محفوظ رکھتی ہے۔

پاکستان میں بسنے والے فرزندانِ توحید کیلئے اولین اہمیت کا یہ کام ہے کہ جس دین برحق کا وہ اپنے آپ کو پیرو کہتے ہیں، جس نبی رحمت ﷺ کی غلامی پر وہ فخر کرتے ہیں، اس کی ہر بات، اس کا ہر ارشاد ان کے نزدیک اٹل اور واجب الاتباع ہو۔ کسی ذاتی مفاد کو، کسی گروہی اور قومی مصلحت کو اس پر ترجیح نہ دی جائے۔ اس بات پر یقین محکم ہو کہ اللہ تعالیٰ اور اسکے پیارے حبیب ﷺ نے جو فرمادیا ہے، اس میں ہماری دارین کی نجات اور فلاح کا راز مضمر ہے۔

اس جذبے کو زندہ کرنے اور پائندہ رکھنے کے لیے اسوۂ صدیقی سے بڑھ کر کوئی دوسری چیز ہمارے لیے زیادہ اثر انگیز نہیں ہوسکتی۔ ایمان ویقین کی پختگی کے جو روح پرور مناظر ہمیں صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی کے لیل ونہار میں نظر آتے ہیں، وہ اپنی شان و شوکت میں منفرد حیثیت کے مالک تھے۔

آپ کی قوتِ ایمانی کا اندازہ لگانے کے لیے ذرا اس وقت کا تصور کیجیے جبکہ جان عالم، روحِ کائنات علیہ اطیب التحیات والتسلیمات داغِ مفارقت دے گئے۔ دل مضمحل، روح شکستہ، ماحول پر افسردگی چھا گئی۔ اردگرد سے ارتداد اور بغاوت کی روح فرسا خبریں موصول ہونے لگیں۔ حضرت صدیق اکبر، حضرت اسامہ کو اس مہم پر روانہ کرتے ہیں، جس کے لیے سرورِ عالم ﷺ نے ان کو نامزد کیا تھا۔ مخلصین صحابہ، اپنے خلیفہ کے اس اقدام کو قرین دانشمندی نہیں سمجھتے۔ عرض کرتے ہیں کہ لشکر اسامہ کی روانگی ملتوی کر دی جائے۔ سارے جنگ آزما بہادر اس لشکر میں شامل ہیں۔ اگر یہ سب ایک دور دراز مہم پر روانہ ہو گئے تو دشمنانِ اسلام، ایسا نہ ہو کہ مدینہ پر دھاوا بول دیں۔ صحابہ کا یہ مشورہ بلاشبہ خلوص پر مبنی تھا۔

Marfat.com

حالات بے شک ایسے ہی تھے۔ خطرات کی بجلیاں کوند رہی تھیں، لیکن عشق و ایثار پیشہ کا فیصلہ، عقل مصلحت اندیش کے فیصلہ کے سراسر خلاف تھا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان مشیروں کو جن کے خلوص اور دانشمندی میں ادنیٰ شک نہیں تھا، جواب دیا:

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَوْ ظَنَنْتُ اَنَّ السِّبَاعَ تَخْتَطِفُنِیْ لَا نُفَذْتُ جَیْشَ اُسَامَۃَ کَمَا اَمَرَ النَّبِیُّ صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وسلم۔ (1)

"اس ذاتِ پاک کی قسم! جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! اگر جنگل کے درندے بھی مدینہ میں گھس کر مجھے اچک لیں تو پھر بھی میں لشکر کو روانہ کرنے سے باز نہیں آؤں گا، جس لشکر کو حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روانہ ہونے کا حکم دیا"۔

لشکر میں شامل بعض لوگوں نے حضرت عمر کو صدیق اکبر کی خدمت میں بھیجا تا کہ ہم سب کی طرف سے عرض کریں کہ اگر وہ لشکر کو بھیجنے پر مصر ہیں تو کم از کم اتنا کریں کہ اسامہ، نوخیز، نا تجربہ کار نوجوان ہے، اس کے بجائے کسی بزرگ تجربہ کار جرنیل کو لشکر کا قائد مقرر کریں۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی تو آپ غصے سے کانپنے لگے۔ پہلے بیٹھے تھے پھر اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سختی سے فرمایا:

ثَکِلَتْکَ اُمُّکَ یَا ابْنَ الْخَطَّابِ اسْتَعْمَلَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم وَ تَاْمُرُنِیْ اَنْ اَعْزِ لَہٗ۔ (2)

"اے خطاب کے فرزند! تیری ماں تجھے روئے! خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسامہ کو سالارِ لشکر مقرر فرمایا ہے۔ تم مجھے کہتے ہو کہ میں اس کے بجائے کسی اور کو مقرر کروں؟ ناممکن"۔

یہ ہے وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب رسول کے ساتھ صدیق اکبر کے عشق و دل بستگی کا عالم۔ جو فیصلہ محبوب نے کر دیا، جس کو اس کی نگاہِ حقیقت بین نے منتخب کر لیا، کسی مصلحت کے پیش نظر صدیق اس میں ردو بدل کرنے کا روادار نہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس لشکر کو الوداع کہنے کے لیے لشکر گاہ میں پہنچے۔

1۔ الکامل فی التاریخ لابن اثیر، جلد 2، صفحہ 334، دار صادر بیروت 2۔ ایضاً

Marfat.com

حضرت اسامہ گھوڑے پر سوار تھے اور خلیفۂ رسول اللہ پا پیادہ چل رہا تھا۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے گزارش کی:

يَا خَلِيفَةَ رَسُولِ اللّٰهِ لَتَرْكَبَنَّ اَوْلَا نَزِلَنَّ۔

''اے جانشین رسول! یا تو آپ بھی سوار ہو جائیں یا پھر میں گھوڑے سے اترتا ہوں''۔

آپ نے فرمایا: بخدا! نہ تم اترو گے نہ میں سوار ہوں گا۔ میرے لیے اس سے بڑی سعادت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں میرے قدم بھی غبار آلود ہوں۔

اتباع رسالت کا نتیجہ یہ نکلا کہ دشمنوں کے دلوں پر مسلمانوں کی قوت کی دھاک بیٹھ گئی، ان کے حوصلے پست ہو گئے، انہوں نے سوچا جب یہ لوگ ان پر خطر حالات میں اتنے طویل سفر پر اتنا بڑا لشکر بھیج رہے ہیں تو ان کی طاقت کے بارے میں ہمارے سارے اندازے غلط ہیں۔ چنانچہ ان کی سازشوں میں وہ گرمجوشی نہ رہی جو ابتدا میں تھی۔

ایمانِ صدیقی کی ایک اور روشن مثال سماعت فرمائیے:

چند قبائل نے کہا: ہم نماز پڑھیں گے، روزے رکھیں گے، حج ادا کریں گے لیکن زکوٰۃ نہیں دیں گے۔ یہ وبا اتنی تیزی سے پھیلی کہ مدینہ طیبہ کے ارد گرد بسنے والے تقریباً سب قبائل اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ ادھر جھوٹے مدعیانِ نبوت نے اسلامی مملکت کے دور دراز گوشوں میں بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا تھا۔ ان حالات میں پھر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا گیا کہ آپ سر دست ان لوگوں کے ساتھ نرمی برتیں۔ وہ کم از کم کلمہ پڑھتے ہیں، نماز ادا کرتے ہیں، روزے اور حج کے بھی قائل ہیں۔ اگر ایک رکن زکوٰۃ میں وہ پس و پیش کرتے ہیں تو ان سے جنگ نہیں کرنی چاہیے، بلکہ انہیں ساتھ ملا کر نبوت کے جھوٹے مدعیوں کا قلع قمع کرنا چاہیے۔ عقل مصلحت میں اس رائے کی تائید کر رہی تھی۔ حالات اس کو قبول کرنے کی سفارش کر رہے تھے لیکن صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ایمان اور عشق اس مداہنت فی الدین کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ انہوں نے اپنی صدیقیت کے نور سے دیکھ لیا کہ اگر آج زکوٰۃ کے بارے میں نرمی دکھائی گئی تو یہ سلسلہ یہاں رک نہیں جائے گا۔

Marfat.com

اسلام کے دوسرے اصول بھی اس کی دست برد سے بچ نہیں سکیں گے۔ نیز اسلام کا یہ رکن وہ ہے جس پر اس کے معاشی نظام کا دارومدار ہے۔ اس کو نظر انداز کرنا گویا اسلام کے ایک اہم ترین گوشے کو مفلوج کر دینے کے مترادف ہے۔ دنیا اس عادلانہ اور رحیمانہ نظامِ معیشت سے محروم ہو جائے گی جو اللہ تعالیٰ کے محبوب نے ان کے لیے پیش کیا اور یہ خسارہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ چنانچہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے تمام مصلحتوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے عزمِ محکم کے ساتھ یہ اعلان کر دیا کہ جس نے نماز اور زکوٰۃ میں فرق کیا میں اس سے بھی جنگ کروں گا۔ جس نے اونٹ کی رسی کے برابر بھی زکوٰۃ دینے سے انکار کیا میں اس کے ساتھ بھی جنگ کروں گا۔

یقین محکم اور ایمانِ کامل ہی حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وہ سہارا تھا جس کے بل بوتے پر آپ نے ان طوفان خیز حالات میں محیر العقول کامیابیاں حاصل کیں۔ ان کے بارے میں سن کر آج بھی اہل دانش تصویر حیرت بن کر رہ جاتے ہیں۔ پھر آپ نے جس سرعت کے ساتھ دو سال اور چار ماہ کے مختصر دورِ خلافت میں ان تمام فتنوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا، وہ آپ کے ایمان اور یقین کا ہی اعجاز تھا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود نے اس حقیقت کو بڑے دلنشیں انداز میں بیان فرمایا ہے:

لَقَدْ قُمْنَا بَعْدَ رَسُوْلِ اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم مَقَامًا کِدْنَا نَهْلِکُ فِیْهِ لَوْلَا اَنَّ اللّٰہ مَنَّ عَلَیْنَا بِاَبِیْ بَکْرٍ۔ (1)

"رسول کریم ﷺ کے وصال کے بعد ہم ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو بکر صدیق جیسا خلیفہ عطا فرما کر ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو ہم برباد ہو گئے ہوتے"۔

یہ ہمت، یہ اولوالعزمی، ناسازگار حالات میں یہ استقامت، پھر ہر میدان میں کامیابی و سرخروئی، یہ ایمان صدیقی کے معجزات ہیں۔ جہاں بھی ایمان و یقین کا آفتاب طلوع ہو جاتا

1۔ الکامل فی التاریخ، جلد 2، صفحہ 342

Marfat.com

ہے وہاں اس قسم کے معجزات رو پذیر ہوتے ہی رہتے ہیں۔

حضرت اقبال نے بھی بارگاہِ صدیقی میں اپنے مخصوص انداز میں ہدیۂ عقیدت و نیاز پیش کیا ہے۔ وہ بھی سماعت فرمائیے:

آں امن الناس بر مولائے ما آں کلیم اول سینائے ما

حضرت ابوبکر ہمارے آقا و مولا پر سب لوگوں سے زیادہ احسان کرنے والے ہیں اور ہمارے کوہِ طور کے سب سے پہلے کلیم ہیں۔

ہمت او کشت ملت را چو ابر ثانی اسلام و غار و بدر و قبر (1)

اس کی ہمت مردانہ نے ملت اسلامیہ کے کھیت کو بادل کی طرح سیراب کر دیا۔ وہ اسلام میں، غار میں، بدر میں اور قبر میں اپنے محبوب ﷺ کے ثانی اثنین ہیں۔

صدر محترم جنرل محمد ضیاء الحق کو جو معرکہ درپیش ہے اس میں کامیابی و سرخروئی کا ایک ہی راستہ ہے کہ وہ اسوۂ صدیقی کو اپنا خضر راہ بنائیں۔ نیز پاکستان میں بسنے والے غلامانِ مصطفیٰ علیہ اجمل التحیۃ واطیب الثناء کو بھی حالات کی ناساعدت سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارے حالات بے شک تشویشناک ہیں، لیکن اتنے نہیں جتنے عہد صدیقی میں تھے۔ اگر یقین کامل اور عزم راسخ کے ساتھ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے ان پر فتح حاصل کر لی تھی تو آج ہم جوان کو اپنا ہادی و رہبر یقین کرتے ہیں، ہم بھی عزیمت و استقامت کی راہ پر چل کر منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔

میں ان الفاظ کے ساتھ محبت و عقیدت کا یہ ارمغان نونہالانِ امت کی خدمت میں پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰی رَسُوْلِکَ الْمُجْتَبٰی وَ حَبِیْبِکَ الْمُصْطَفٰی وَ عَلٰی اٰلِہٖ بُدُوْرِ الدجٰی وَ اَصْحَابِہٖ نُجُوْمِ الْھُدٰی اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ۔

1۔ اسرار و رموز، صفحہ 156 (کلیات اقبال فارسی، صفحہ 156)

Marfat.com

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ

اور باغ فدک

Marfat.com

ہمارے بعض دوست بڑے طمطراق سے یہ کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے باغِ فدک چھین لیا، ان پر ظلم کیا، ان کی دل آزاری کی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اس کام میں آپ کے ہمنوا اور مؤید تھے وغیرہ وغیرہ۔ اس موقع پر جس طرح شائستگی اور شرافت کی تمام حدود کو وہ پھاند جاتے ہیں ان کے ذکر سے میں دانستہ احتراز کرتا ہوں۔

میرے پیش نظر مسئلہ کو الجھانا نہیں، سلجھانا ہے۔ میں شکوک وشبہات کو ہوا دے کر ماحول کو غبار آلود نہیں کرنا چاہتا۔ حق و باطل میں امتیاز کرنا آپ کا کام ہے۔ سب سے پہلے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ فدک کیا ہے؟ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس کے بعد قدم بہ قدم سوئے منزل بڑھتے جائیں گے۔

اہل اسلام کو جو اموال واملاک کفار سے حاصل ہوتی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں:

ا۔ غنیمت

۲۔ فے

مالِ غنیمت اس کو کہتے ہیں جو لڑائی اور لشکر کشی کے بعد حاصل ہو اور مال فے اس کو کہتے ہیں جو لشکر کشی کے بغیر حاصل ہو۔ مالِ غنیمت اور مالِ فے کی یہ تعریف متفقہ ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔ دونوں قسم کے اموال کا شرعی حکم قرآن کریم میں وضاحت سے مذکور ہے، اس کے لیے ہمیں پریشان ہونے اور ورق گردانی کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

دسویں پارے کی پہلی آیت میں اموالِ غنیمت کے احکام صراحۃً ذکر کر دیے گئے ہیں۔ ارشادِ خداوندی ہے:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا (سورہ الانفال: ۴۱)

Marfat.com

''اور جان لو! کہ جو کوئی چیز تم غنیمت میں حاصل کرو اس کا پانچواں حصہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے لیے، رشتہ داروں اور یتیموں مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ تعالیٰ پر اور اس پر جسے ہم نے اتارا اپنے محبوب بندہ پر''۔

اس آیت میں غور کرنے سے واضح ہو گیا کہ مالِ غنیمت کے پانچ حصے کیے جائیں گے۔ چار حصے حسب الحکم مجاہدوں اور غازیوں میں تقسیم کیے جائیں گے اور پانچویں حصہ کے مصارف اس آیت میں کھول کر ذکر کر دیے گئے ہیں۔

مالِ فے کے احکام سورۂ حشر کی آیت میں ذکر کیے گئے ہیں۔ ارشادِ خداوندی ہے۔

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى وَالْیَتٰمٰى وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ۙ كَیْ لَا یَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْكُمْ (الحشر:7)

''جو مال پلٹا دیا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی طرف ان گاؤں کے رہنے والوں سے تو وہ اللہ کا ہے، اس کے رسول کا ہے اور رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔ تا کہ وہ مال گردش نہ کرتا رہے تمہارے دولت مندوں کے درمیان''۔

اس سے واضح ہو گیا کہ جو اموال فے ہوں ان میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا حصہ ہے۔ حضور ﷺ کے رشتہ داروں کا، امت کے یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کا۔ اموالِ فے میں ان تمام لوگوں کو حصہ دار بنانے کی حکمت ساتھ ہی بیان فرما دی تا کہ مال چند اغنیاء میں ہی گردش نہ کرتا رہے اور سمٹ کر چند افراد کے ہاتھوں میں جمع نہ ہو جائے، بلکہ اس کی گردش کا دائرہ زیادہ سے زیادہ وسیع ہو، تا کہ دولت کی تقسیم سے ملت کے زیادہ سے زیادہ افراد مستفید ہوتے رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کَیْ لَا یَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ کے مختصر جملہ میں اسلامی نظام معیشت کی روح اور اس کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے۔ سرمایہ دارانہ معیشت میں دولت سمٹ کر چند افراد کے پاس جمع ہو جاتی ہے۔ ملک کے مٹھی بھر لوگ

Marfat.com

از حد متمول ہو جاتے ہیں اور قوم کے باقی افراد عسرت و تنگدستی کا شکار بن جاتے ہیں۔ اسلام نے سرمایہ داری کی پہلے ہی بیخ کنی کر دی اور اسلامی معاشرہ کا مزاج اس طرح کیا کہ وہاں سرمایہ داری پنپ ہی نہ سکے۔ دولت کو چند ہاتھوں میں مجتمع ہونے سے روکنے کے لیے قبل از وقت احتیاطی تدابیر اختیار کیں اور حفاظتی بند باندھ دیے اس طرح نہ دولت سمٹے گی اور نہ قوم از حد امیر اور از حد غریب طبقوں میں بٹے گی۔ نہ ان میں حسد و تباغض کی آگ سلگے گی اور نہ وہ وقت آئے گا کہ غربت کے ماروں کا پیمانۂ صبر چھلکنے لگے اور وہ بے اختیار و بے قابو ہو کر آمادۂ بغاوت ہو جائیں اور اپنے ہاتھوں اپنی قوم کے خون کے دریا بہا دیں۔

غنیمت اور فے کا مفہوم اور ان کے قرآنی احکام ذہن نشین کرنے کے بعد آگے چلیے۔

اہل سنت و جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ کیونکہ اموالِ فے کے حق دار بہت سی اقسام کے لوگ ہیں، ان کو متعین کرنا ممکن نہیں۔ آج ایک لڑکا یتیم ہے۔ کل وہ بالغ ہو کر خوشحال ہو جاتا ہے۔ آج ایک شخص مسکین ہے، وہ دولت مند بن جاتا ہے۔ جب تک پہلا یتیم تھا اور دوسرا مسکین تھا وہ ان اموال میں حصہ دار تھے۔ آج ان کی جگہ دوسرے لوگ جو یتیمی اور غربت سے متصف ہیں وہ حصہ دار بن جائیں گے۔ یہی حال ذوی القربیٰ کا ہے، یہی حکم ابن السبیل کا ہے۔ جب صورتِ احوال ایسی ہو تو وہ اموال، وقف کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور ان اموال و املاک کا نظم و نسق خود حاکم وقت یا اس کی طرف سے مقرر کردہ شخص کیا کرتا ہے۔

یہ مسلمہ امر ہے کہ فدک جنگ اور لشکر کشی سے نہیں، بلکہ صلح سے مسلمانوں کے تصرف میں آیا تھا اور آیت میں بیان کردہ حکم کے مطابق یہ کسی ایک شخص یا خاندان کی نجی ملکیت نہیں، بلکہ اس میں مذکورہ بالا سارے اصناف حصہ دار ہیں، ورنہ دولت سمٹ کر چند ہاتھوں میں آ جائے گی۔ قرآن نے کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ (الحشر۔ ۷) سے ارتکاز زر سے بچنے کے لیے جو احکام نافذ کیے ہیں ان کی خلاف ورزی لازم آئے گی۔ رحمت دو عالم ﷺ جب تک اس جہانِ فانی میں رونق افروز رہے، حضور ﷺ اپنی نگرانی میں اس علاقہ کی آمدنی کو حقداروں میں تقسیم فرماتے رہے اور حضور ﷺ کی رحلت کے بعد جب

Marfat.com

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو ان باغات اور مزروعہ اراضی کی نگہداشت اور اس کی آمدنی کی تقسیم آپ کے سپرد ہوئی۔ آپ اپنے عہد خلافت میں حسب ارشادِ خداوندی اور حسب سنت نبوی ﷺ اس فریضہ کو سرانجام دیتے رہے اور یہ سلسلہ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ اور بعد میں آنے والے خلفائے راشدین کے زمانوں میں بھی اس طرح جاری رہا اور اس طرح اسلامی نظامِ معیشت کی برکتوں اور سعادتوں سے اسلامی معاشرہ سیراب اور بہرہ مند ہوتا رہا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا یہ عمل حقیقت میں ارشادِ خداوندی کی تعمیل تھی اور سنت نبوی ﷺ کی صحیح معنوں میں اطاعت تھی اور ان حضرات پر کسی قسم کا الزام واتہام وارد نہ ہوسکتا تھا، بلکہ وہ لائق صد تبریک وتحسین تھے کہ انہوں نے ہر قسم کے دباؤ کا مقابلہ کیا، لیکن فرمانِ الٰہی اور سنت محمدی ﷺ سے سرمو انحراف نہ کیا۔ ہاں، اگر وہ ایسا نہ کرتے تو وہ قابل سرزنش ہوتے، بلکہ اس وقت کا زندہ اور بیدار معاشرہ احکامِ الٰہی اور سنت نبوی ﷺ کی اس خلاف ورزی کو ہرگز برداشت نہ کرتا، لیکن ہمارے ہاں تو گنگا الٹی بہہ رہی ہے۔ تنقید کے تیروں سے ان مردانِ پاک سرشت کو گھائل کیا جارہا ہے، جنہوں نے عہد وفا کو نبھایا۔ راہِ حق پر استقامت وثبات کے انمٹ اور درخشاں نقوش ثبت کیے۔

یہ تو ہوا اہل سنت کا موقف، نظری بھی اور عملی بھی۔

اب رہے معترضین تو ان کا عقیدہ شریفہ یہ ہے کہ فدک جو فے ہے، یہ حضور ﷺ کی ذاتی ملکیت تھی۔ حضور ﷺ کی رحلت کے بعد اس کی وارث صرف حضرت سیدہ تھیں اور شیخین نے ان کو فدک کی اراضی سے محروم کر کے حضور ﷺ کی نورِ نظر اور لختِ جگر پر بڑا ظلم کیا اور ان کی حق تلفی کی۔ اب خود انصاف فرمائیے! اگر ایسا ہوتا تو آیت یوں ہوتی:

مَا اَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَهُوَ لِرَسُوْلِهٖ.

کہ ان گاؤں والوں سے جو مالِ فے حاصل ہو اس کا مالک اس کا رسول ہے۔ بات ختم ہو جاتی اور کسی کو چون وچرا کی مجال تک نہ رہتی، لیکن قرآن کی آیت تو اس طرح وہاں

Marfat.com

نہیں۔ وہاں تو،

وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ (الحشر۔ ۷) کی لمبی چوڑی عبارت بھی موجود ہے۔

یہ لوگ اپنے دل سے پوچھیں کہ یہ کلمات کیا قرآن کی آیت کا حصہ نہیں؟ اور کیا ان کلمات کا واضح مدعا نہیں جس میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں یا یہ الفاظ صرف سنانے کے لیے اور لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیے ہیں۔ عمل سے ان کا کوئی سروکار نہیں؟

جب تک ہم قرآن کو اپنے خداوند کریم کا کلام مانتے ہیں، ہم اس آیت کا انکار نہیں کر سکتے اور اگر انکار نہیں کر سکتے تو پھر اس داستان سرائی کے لیے وجہ جواز کیا ہے؟

یہ ایک سیدھی اور صاف بات ہے، اس میں کوئی کجی نہیں، کوئی زیغ نہیں، کوئی پیچ نہیں۔ یہ ایک روشن حقیقت ہے جو شک وشبہ سے بالاتر ہے، پھر ہم آفتاب سے تابندہ تر حقیقت کا کیوں انکار کریں اور بے سروپا تاویلات اور من گھڑت مزعومات کی دلدل میں پھنس کر کیوں خود بھی قیامت کے روز شرمسار ہوں اور قرآن واسلام کی تعلیمات کو زک پہنچا کر باطل کو بلاوجہ غرانے کا موقعہ دیں؟

لیکن جہاں بات کا بتنگڑ بنانا اور بال کی کھال اتارنا محبوب مشغلہ ہو وہاں حق کی سادگی اور پرکاری کو کون خاطر میں لاتا ہے؟ سچی بات کو سننا کون گوارا کرتا ہے؟ وہاں تو ایسی ایسی اینچ اور دور از کار تاویلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو ختم ہونے میں نہیں آتا۔ اپنی غلطی کا اعتراف تو بڑے دل گردے کا کام ہے۔ جن کے پیش نظر اپنی لیڈری کو چمکانا ہو، جس لغزش کے پیچھے دیرینہ جذبۂ انتقام کی آگ سلگ رہی ہو، وہاں عقل عیار ایسی ایسی اختراعیں کرتی ہے۔ حقائق اور حقوق کو پس پشت ڈال کر محض جذبات کو ابھارتی ہے اور اس کے لیے دروغ بافی میں کمال کا مظاہرہ کرتی ہے کہ اچھے بھلے، سراب کو چشمۂ آبِ حیواں سمجھنے لگتے ہیں۔

اگر ایک لمحہ کے لیے یہ مان بھی لیا جائے (اگرچہ ایسا ماننا حکم خداوندی کی صریح نافرمانی ہے) کہ فدک حضور ﷺ کی ملکیت تھا اور وصال کے بعد ان املاک کی حیثیت ایسی تھی جو

Marfat.com

وارثوں میں بانٹ دی جاتی ہے، تو پھر وراثت کا حق صرف حضرت سیدہ بتول سلام اللہ علی ابیہا وعلیہا کو کیسے پہنچتا ہے؟ اس میں تو سارے وارث حصہ دار ہوں گے۔ حضرت عباس، امہات المومنین اور دیگر ورثاء بھی شریک ہوں گے۔ صرف حضرت سیدہ کو وارث تسلیم کرنا اور باقی ورثاء کو محروم کر دینا، متعدد آیاتِ قرآنی کی صریح خلاف ورزی ہے اور ہم سیدہ بتول کے بارے میں اس کا تصور تک نہیں کر سکتے۔

جب ان لوگوں کے یہاں بھی قدم نہیں جمتے اور مقصود بر آتا دکھائی نہیں دیتا تو پھر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی حیاتِ طیبہ میں ہی فدک کی وسیع و عریض املاک اپنی بیٹی کو ہبہ کر دی تھیں اور انہوں نے اسے قبول کر لیا تھا۔ اس لیے فدک وغیرہ کی واحد حقدار حضرت سیدہ ہی تھیں۔ آپ غور فرمائیں! کہ بارگاہِ رسالت ﷺ میں یہ کتنی بڑی گستاخی ہے؟ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ معاذ اللہ! حضور نے باقی تمام ورثاء کو محروم کرنے کے لیے فدک اپنی حیاتِ طیبہ میں ہی حضرت سیدہ کو دے دیا اور دوسرے ورثاء کو محروم کر دیا۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی اگر کوئی شخص ایسی بات کرتا ہے کہ اپنے ایک وارث کے نام ساری جائیداد کا انتقال کرا دیتا ہے اور باقی وارثوں کو محروم کر دیتا ہے تو اس کے اس عمل کو انتہائی مذموم اور صریح ظلم قرار دیا جاتا ہے اور اس کی اس بات سے سارے خاندان کا امن وسکون برباد ہو جاتا ہے۔ ان میں خونریزیوں اور مقدمہ بازیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ذرا سوچئے! وہ نبی برحق جو آیا ہی ظلم وزیادتی کو مٹانے کے لیے تھا، جو آیا ہی عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے تھا، اس کی آمد کی برکت سے ٹوٹے ہوئے دل جڑ گئے۔ دریدہ قباؤں کے چاک رفو ہو گئے۔ خاندانی عداوتوں کے آتش کدے گلزار بن گئے۔ ایسے یمن وسعادت کے پیامبر کے بارے میں ایسا تصور تک کرنا بھی انتہائی رذالت اور کمینگی ہے۔ اہل بیت کی عقیدت کا بہروپ دھار کر ناموس نبوت پر حملہ آور ہونا کہاں کی ایمانداری ہے؟ اگر نبی نے خود نعوذ باللہ اپنے خاندان کے افراد میں ظلم وعدوان کا آغاز کیا تو ظلم وستم کی ستائی ہوئی مخلوق اپنے درد کا درماں کرنے اور

Marfat.com

اپنے زخموں پر مرہم لگوانے کہاں جائے؟

کئی دوسری باتیں بھی ہبہ کے دعویٰ کی تردید کرتی ہیں:

فدک کا علاقہ جو بطورِ فے حضور کے تصرف میں آیا، کوئی معمولی سا علاقہ نہ تھا۔ یہ ایک وسیع و عریض خطہ ہے جس میں زرخیز میدان، شاداب باغات کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ بقول ملا باقر مجلسی، اس کی سالانہ آمدنی چوبیس ہزار دینار تھی۔ اس وقت کے حساب کے مطابق دو لاکھ چالیس ہزار روپیہ۔ اگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ خطہ حضرت سیدہ کو ہبہ کر دیا تھا تو پھر آپ مدینہ طیبہ کی متمول اور دولت مند خواتین میں سرفہرست ہوں گی، حالانکہ عہد رسالت میں آپ کی عسرت اور تنگی گزران کے قصے زبان زد خاص و عام ہیں۔ آٹا خود اپنے دست مبارک سے پیستیں، گھر میں جھاڑو خود دیتیں، کھانا پکاتیں، حتی کہ بسا اوقات پانی کا بھرا ہوا مشکیزہ اپنے کندھوں پر اٹھا کر لایا کرتیں۔ جس کی سالانہ آمدنی ڈھائی لاکھ روپیہ ہو، وہ تو دس بیس غلام اور کنیزیں خرید کر رکھ سکتا ہے۔ نیز یہ روایت بھی عند الفریقین مسلم ہے کہ ایک دفعہ چند کنیزیں اور غلام بارگاہِ رسالت میں لائے گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایماء پر حضرت سیدہ لونڈی مانگنے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں گئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے فاطمہ! اے میری لخت جگر! جب تک اہل صفہ کی ضرورتیں پوری نہ ہو جائیں میں تمہیں لونڈی کیسے دے سکتا ہوں؟ البتہ تمہیں لونڈی سے بھی بہترین تحفہ پیش کرتا ہوں، جب سونے لگو تو ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر کا ورد کر لیا کرو۔ (1)

اس کے علاوہ کئی بار ایسے مواقع آئے کہ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ کو خدمت دین کے لیے مال پیش کرنے کی دعوت دی اور ہر صحابی نے اپنی استطاعت سے بڑھ کر بطیب خاطر مالی قربانی پیش کی لیکن کسی روایت میں یہ موجود نہیں کہ حضرت سیدہ رضی اللہ

1۔ صحیح بخاری، باب الدلیل علی ان الخمس لنوائب رسول اللہ والمساکین، جلد 1 صفحہ 439، ناسخ التواریخ، جلد 3، جزدوم، صفحہ 421، کتاب فروشی اسلامیہ تہران

Marfat.com

عنہا نے (ان کے قول کے مطابق) جن کی سالانہ آمدنی اڑھائی لاکھ روپے تھی، انہوں نے بھی کبھی اس میں حصہ لیا ہو۔ غزوۂ تبوک کا واقعہ توبالاتفاق خیبر و فدک کی فتح کے بعد کا ہے۔ اس وقت تو یقیناً آپ اتنی بڑی جاگیر کی مالک تھیں۔ مسلمانوں کی مالی حالت مخدوش تھی۔ تبوک کی مہم اخراجات کا تقاضا کر رہی تھی۔ سید عالم ﷺ نے جہاد کی تیاری کے لیے مالی قربانی پیش کرنے کا جب اعلان کیا تو حضرت عثمان ہزاروں دینار لے آئے اور حضور ﷺ کے قدموں میں آکر ڈھیر کر دیے۔ حضور ﷺ انہیں اپنی جھول میں ڈال کر مسجد کے صحن میں پھرتے تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو دعاؤں سے نوازتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنا نصف مال لے کر حاضر ہوئے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تو شان ہی نرالی تھی، اپنا سارا ورثہ اٹھایا اور اپنے آقا کی خدمت میں پیش کر دیا۔ حتیٰ کہ اپنا لباس بھی اتارا اور بوریا کا لباس پہنا۔ (1) ان حضرات کے علاوہ دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی ایثار و خلوص کے خوب خوب مظاہرے کیے، لیکن کیا کوئی ایسی روایت آپ ہمیں دکھا سکتے ہیں؟ جس میں درج ہو کہ حضرت خاتونِ جنت رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بھی اس میں کوئی حصہ ڈالا ہو۔ ایسا بھی نہیں کہ صحابہ کرام کے چندوں کے بعد ضرورت نہ رہی ہو، بلکہ قرآن تو صاف بتاتا ہے کہ بعض مجاہد میدانِ جنگ میں شرکت کے لیے حاضر ہوئے، لیکن سواری کا انتظام نہ ہو سکا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ (التوبہ:92) میرے پاس تمہاری سواری کے لیے کوئی جانور نہیں، ناچار انہیں واپس ہونا پڑا۔ اس وقت ان کے رنج و الم کی یہ حالت تھی کہ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا بہہ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

تَوَلَّوْا وَّ اَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا (التوبہ۔ ۹۲)

کہ وہ لوٹے اس حالت میں کہ ان کی آنکھوں سے سیل اشک رواں تھا۔

اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو حضرت سیدہ اتنی جاگیر کی مالک ہونے کے باوجود اللہ

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5، صفحہ 628، لجنۃ احیاء التراث مصر

Marfat.com

تعالیٰ کی راہ میں ایک پیسہ خرچ کرنے کی روادار نہ تھیں۔ اس بات کو کوئی ایماندار تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ جس گھرانے سے دنیا نے جود و کرم اور بخشش و عطا کا سبق سیکھا ہو، وہاں بخل اور کنجوسی کا کیا گزر؟ دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا محبوب، اس کے اہل بیت اور اولاد کو دنیا کی لذتوں سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ وہاں تو آخر دم تک کئی کئی دن فاقہ سے گزرتے تھے۔ کئی کئی ماہ چولہے میں آگ نہیں جلتی تھی۔ ان روشن حقائق کے سامنے کیا اس کذب وافترا کا پردہ چاک نہیں ہو جاتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی صاحبزادی کو تمام دوسرے حق داروں کو محروم کرتے ہوئے اتنی بڑی جاگیر ہبہ کر کے مالک بنا دیا؟ محبت کے بلند بانگ دعاوی کے شور وغل میں ناموس مصطفیٰ علیہ اطیب التحیۃ والثناء اور عظمت اہل بیت رضوان اللہ علیہم پر اس بیدردی اور بے خوفی سے شبخون ہمارے ان دوستوں کو ہی زیب دیتا ہے۔

اب آیئے ان روایات کی طرف جن کا سہارا لے کر گلشن اسلام کے ان سدا بہار اشجار ثمر بار پر یورش کی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ حضور کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس گئیں اور میراث کا مطالبہ کیا اور یہاں تک کہا:

"یَا ابْنَ اَبِیْ قُحَافَہَ اَتَرِثُ اَبَاکَ وَلَا اَرِثُ اَبِیْ؟"

اے ابو قحافہ کے بیٹے! آپ تو اپنے باپ کے وارث بنیں اور میں اپنے باپ کے ورثہ سے محروم رہوں؟ یہ بات قرین قیاس نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جدائی کا زخم ابھی تازہ ہو اور آپ نے حصولِ میراث کے لیے تگ و دو شروع کر دی ہو۔ نیز آپ کی شان سے بعید ہے کہ آپ خود بنفس نفیس عدالت صدیقی میں تشریف لے گئی ہوں اور دعویٰ دائر کیا ہو، جس طرح عام طور پر بعض کم علم خیال کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے کسی آدمی کے ذریعے اپنے اس مطالبہ کو خلیفۂ برحق کے گوش گزار کیا۔ امام بخاری کی روایت میں اس کی تصریح موجود ہے:

عَنْ عَائِشَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھَا اَنَّ فَاطِمَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھَا اَرْسَلَتْ اِلٰی اَبِیْ بَکْرٍ تَسْأَلُہٗ مِیْرَاثَھَا مِنَ النَّبِیِّ صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وسلم مِمَّا اَفَاءَ

Marfat.com

اللّٰہُ عَلَیۡہِ۔ (1)

''یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آدمی بھیجا اور حضور ﷺ کی میراث کا مطالبہ کیا''۔

اس تصریح کے بعد بعض دوسرے مقامات پر جہاں مطالبہ کرنے کی نسبت خود حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کی طرف کی گئی ہے وہ مجاز ہوگا۔

جب حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کا پیغام حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو پہنچا تو آپ نے جو جواب دیا وہ بھی امام بخاری کے الفاظ میں سن لیجئے:

فَقَالَ اَبُوْبَکْرٍ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہ صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وسلم قَالَ: لَا نُوْرَثُ، مَا تَرَکْنَا فَھُوَ صَدَقَۃٌ۔ اِنَّمَا یَاکُلُ آلُ مُحَمَّدٍ مِنْ ھٰذَا الْمَالِ ...... وَ اِنِّیْ، وَاللّٰہِ! لَا اُغَیِّرُ شَیْئًا مِنْ صَدَقَاتِ النَّبِیِّ صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وسلم الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْھَا فِیْ عَھْدِ النَّبِیِّ صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وسلم۔ وَلَاَ عْمَلَنَّ فِیْھَا بِمَا عَمِلَ فِیْھَا رَسُوْلُ اللّٰہ صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وسلم، فَتَشَھَّدَ عَلِیٌّ ثُمَّ قَالَ اِنَّا قَدْ عَرَفْنَا یَا اَبَابَکْرٍ! فَضِیْلَتَکَ وَ ذَکَرَ قَرَابَتَھُمْ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہ صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وسلم وَحَقَّھُمْ۔ وَ تَکَلَّمَ اَبُوْبَکْرٍ فَقَالَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَقَرَابَۃُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وسلم اَحَبُّ اِلَیَّ اَنْ اَصِلَ مِنْ قَرَابَتِیْ۔ (2)

''حضرت سیدہ کے جواب میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہماری مالی وراثت نہیں ہوتی، جو مال ہم چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے اور آل محمد ﷺ اس مال میں سے کھا سکتی ہے۔ (ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا) بخدا! میں حضور ﷺ کے صدقات میں کوئی تبدیلی نہیں کروں گا۔ جس طرح وہ عہد نبوت میں تھے ویسے ہی رہیں گے اور میں ان میں ایسا ہی کروں گا جس طرح ان میں رسول

1۔ صحیح بخاری، باب مناقب قرابۃ رسول اللہ ﷺ، جلد 2، صفحہ 609، باب غزوۂ خیبر، جلد 1، صفحہ 526

2۔ صحیح بخاری، باب مناقب قرابۃ رسول اللہ ﷺ، جلد 1، صفحہ 526

Marfat.com

اللہ ﷺ کیا کرتے تھے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس بات کی تصدیق کی اور فرمایا: اے ابوبکر! ہم آپ کی فضیلت و بزرگی کو جانتے ہیں، پھر آپ نے اس رشتہ داری کا ذکر کیا جو انہیں حضور ﷺ کے ساتھ تھی اور ان کے حق کا ذکر کیا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر فرمایا کہ اس ذاتِ پاک کی قسم! جس کے دست قدرت میں میری جان ہے کہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی سے کہیں یہ زیادہ محبوب ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کروں"۔

آپ خود سوچیے کہ اس جواب میں کوئی قابل اعتراض بات ہے؟ بے ادبی کا ادنیٰ شائبہ بھی اس میں پایا جاتا ہے؟ کیا اس سے اہل بیت کی حق تلفی کی نیت کا گمان ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! بلکہ آپ نے حضرت بتولِ جنت کی خدمت میں یہ عرض کی کہ اللہ تعالیٰ کے پیارے رسول، آپ کے ابا جان اور میرے آقا و مولیٰ کا ارشاد گرامی یہ ہے اور مجھ میں یہ تاب نہیں کہ میں ارشاداتِ نبوی ﷺ سے سرمو انحراف کر سکوں۔ آپ خود ہی انصاف فرمائیے کہ اس جواب میں کون سا جملہ یا لفظ قابل اعتراض ہے؟

بعض لوگ فرطِ جوش اور شدتِ غضب میں یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ حدیث حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خود ساختہ ہے۔ انہوں نے فقط حضرت سیدہ کا حق غصب کرنے کے لیے یہ حدیث گھڑی ہے۔ حیرت ہے کہ ایسے بے سروپا کلمات زبان سے نکالتے ہوئے انہیں غضب خدا کا خوف یا جگ ہنسائی کی فکر نہیں ہوتی۔ یہ حدیث صرف حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے ہی مروی نہیں، صرف کتب اہل سنت میں ہی مرقوم نہیں، بلکہ صحابہ کی کثیر تعداد سے مروی ہے اور معترضین حضرات کی معتبر کتب حدیث میں بھی ائمہ اہل بیت سے مرقوم ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

اصول کافی صفحہ ۲۷۔ اس پر حضرت امام جعفر صادق حضور نبی کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی روایت کرتے ہیں:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وسلم اِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَۃُ الْاَنْبِیَآءِ۔

اِنَّ الْاَنْبِیَاءَ لَمْ یُوَرِّثُوْا دِیْنَارًا وَّلَا دِرْهَمًا وَّلٰكِنْ وَرَّثُوْا الْعِلْمَ فَمَنْ اَخَذَ مِنْهُ اَخَذَ بِحَظٍّ وَّافِرٍ۔ (1)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ بے شک انبیاء، دینار و درہم کا وارث نہیں بناتے، بلکہ وہ علم ورثہ میں دیتے ہیں۔ جس نے ان کے علم سے حصہ لیا اسے بڑا وافر حصہ ملا۔

دوسری روایت ملاحظہ فرمائیے:

حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ شیر خدا اپنے فرزند ارجمند حضرت محمد بن حنفیہ کو ازراہِ وصیت فرماتے ہیں:

وَ تفقّهُ فِی الدِّیْنِ فَاِنَّ الْفُقَهَاءَ وَرَثَةُ الْاَنْبِیَاءِ. اِنَّ الْاَنْبِیَاءَ لَمْ یُوَرِّثُوْا دِیْنَارًا وَّلَا دِرْهَمًا وَّ لٰكِنَّهُمْ وَرَّثُوا الْعِلْمَ وَ مَنْ اَخَذَ مِنْهُ اَخَذَ بِحَظٍّ وَّافِرٍ۔

(من لا یحضرہ الفقیہ جلد دوم ص ۳۴۶)

اے میرے فرزند! دین میں فہم حاصل کرو، کیونکہ فقہاء ہی انبیاء کے وارث ہیں۔ بے شک انبیاء دینار و درہم کا وارث نہیں بناتے، بلکہ وہ علم ورثہ میں دیتے ہیں اور جس نے علم نبوت سے کچھ حاصل کیا اسی کو حظ وافر نصیب ہوا۔

تیسری روایت ملاحظہ ہو:

یہ حضرت امام جعفر صادق کا اپنا ارشاد ہے۔ اس سے حدیث نبوی ﷺ کی تصدیق اور وصیت مرتضوی کی تصویب ہوتی ہے۔

حضرت امام نے فرمایا:

اِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْاَنْبِیَاءِ وَ ذَاکَ اَنَّ الْاَنْبِیَاءَ لَمْ یُوَرِّثُوْا دِرْهَمًا وَّلَا دِیْنَارًا وَّ اِنَّمَا اَوْرَثُوْا اَحَادِیْثَ مِنْ اَحَادِیْثِهِمْ. فَمَنْ اَخَذَ بِشَیْءٍ مِنْهَا فَقَدْ اَخَذَ حَظًّا وَّافِرًا۔(2)

1۔ اصول کافی، جلد 1، صفحہ 27، مکتبہ اسلامیہ تہران 2۔ اصول کافی، جلد 1، صفحہ 25-24

Marfat.com

بے شک علماء ہی انبیاء کے وارث ہیں، کیونکہ انبیاء درہم و دینار ورثہ میں نہیں چھوڑتے، بلکہ وہ احادیث (احکامِ شریعت اور اسرار کتاب) ہی اپنی وراثت میں چھوڑ جاتے ہیں، پس جس شخص نے بحرِ علم سے کچھ حاصل کیا اس کو حظ وافر نصیب ہوا۔

اہل سنت کی کتب میں یہ ارشادِ نبوی ﷺ کثیر التعداد صحابہ سے مروی ہے۔ بعض کے اسمائے گرامی ذہن نشین کر لیجئے۔ حضرت حذیفہ بن یمان، زبیر بن عوام، عباس، علی، عمر، عثمان، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، ابو درداء اور ازواج مطہرات رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ جب یہ بات نہیں بنتی تو کہتے ہیں کہ یہ حدیث آیاتِ قرآنی کے خلاف ہے کیونکہ قرآن میں یُوۡصِیۡکُمُ اللّٰہُ فِیۡۤ اَوۡلَادِکُمۡ۔ (النساء: 11) تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تعالیٰ تمہیں وصیت کرتا ہے اور کم میں نبی اور امتی دونوں داخل ہیں اور حدیث صرف وہ معتبر ہوتی ہے جو قرآن کے مطابق ہو۔ بجا فرمایا آپ نے۔

مخالف قرآن حدیث معتبر نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا رسول قرآن کی تصدیق کے لیے تشریف لاتا ہے، اس کی تردید اور تکذیب کے لیے نہیں۔ اس لیے جو حدیث قرآن کی کسی آیت کے معارض ہوگی وہ اللہ تعالیٰ کے نبی کا ارشاد نہیں ہوسکتی۔

لیکن میرے محترم! کبھی آپ نے قرآن کی تفسیر اور قرآن کی تردید میں جو فرق ہے، اس پر بھی غور کیا۔ اگر بیٹا باپ کو قتل کر دے تو اگر چہ وہ اس کا بیٹا ہے، لیکن کیا اس آیت کی رو سے آپ اس کو وارث بنائیں گے؟ اسی طرح خدانخواستہ اگر کسی مسلمان کا بیٹا مرتد ہو جائے تو اس کا بیٹا ہونے میں تو شک نہیں، لیکن کیا وہ مرتد بیٹا اپنے مسلمان باپ کا وارث ہوگا؟ ہر گز نہیں۔ کیا وہ احادیث جن میں قاتل اور مرتد کے وارث نہ ہونے کا حکم مذکور ہے، آپ اس لیے انہیں مسترد کر دیں گے وہ قرآن کی اس آیت کے منافی ہیں؟ ہر گز نہیں! بلکہ ان احادیث نے اس بات کی تفسیر کر دی کہ کون سا بیٹا اپنے باپ کا وارث ہوسکتا ہے اور کون سا نہیں۔ یہ احادیث آیت قرآنی کی مفسر ہیں۔ مغیر یا ناسخ نہیں۔ اسی طرح ایک اور آیت میں غور کریں۔ ارشادِ الٰہی ہے اَحَلَّ اللّٰہُ الۡبَیۡعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا (البقرہ: 275) کہ اللہ تعالیٰ

نے بیع (خرید وفروخت) کو حلال کر دیا، لیکن سود کو حرام۔ اگر اس آیت کو سند بناتے ہوئے کوئی شخص شراب، سور اور مردار کی خرید وفروخت اور کاروبار شروع کر دیتا ہے۔ کیا آپ اس کے استدلال کو صحیح مانیں گے اور وہ احادیث جن میں ان حرام چیزوں کے کاروبار سے روکا گیا ہے انہیں قرآن کی ناسخ اور مخالف گردان کر مسترد کر دیں گے؟ ہرگز نہیں! بلکہ آپ یہ فرمائیں گے کہ بیع حلال ہے، لیکن ان احادیث میں جو معترضین حضرات کی کتب میں بھی بروایت ائمہ معصومین منقول ہیں، اس آیت کی مفسر ہیں نہ کہ ناسخ۔

نیز جہاں خطاب ہو وہاں ہر جگہ حضور ﷺ اور امت دونوں مراد نہیں ہوا کرتے، بلکہ بعض مقامات پر صرف امت کو خطاب ہوتا ہے، مثلاً اسی آیت سے چند سطر پہلے ارشاد ہے:

وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِی الۡیَتٰمٰی فَانۡکِحُوۡا مَا طَابَ لَکُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ مَثۡنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ (النساء: ۳)

اس آیت میں مخاطبین کو چار تک شادیاں کرنے کی اجازت ہے، لیکن ان میں حضور ﷺ داخل نہیں، کیونکہ حضور ﷺ کو نو تک شادیاں کرنے کی اجازت ہے۔

یہاں معترضین حضرات فرماتے ہیں کہ انبیاء کے اموال میں اگر احکام وراثت جاری نہیں ہوتے تو پھر وَ وَرِثَ سُلَیۡمٰنُ دَاوٗدَ (النمل: 16) کا کیا مطلب ہوگا کہ سلیمان علیہ السلام، داؤد علیہ السلام کے وارث بنے؟ نیز حضرت زکریا علیہ السلام کیوں یہ دعائیں مانگتے رہے:

فَهَبۡ لِیۡ مِنۡ لَّدُنۡکَ وَلِیًّا ۙ﴿۵﴾ یَّرِثُنِیۡ وَ یَرِثُ مِنۡ اٰلِ یَعۡقُوۡبَ (مریم)

''الٰہی! مجھے ایک فرزند عطا فرما جو میرا بھی وارث ہو، اور آلِ یعقوب کا بھی''۔

اس کے متعلق گزارش ہے کہ پہلی آیت میں جس وراثت کا ذکر ہے وہ داؤد علیہ السلام کے اموال کی وراثت نہیں، بلکہ کتاب وشریعت کی وراثت ہے، کیونکہ اگر مال کی وراثت کا ذکر ہوتا تو آپ کے دوسرے اٹھارہ بھائی بھی آپ کے ساتھ برابر کے حصہ دار ہوتے۔ صرف ایک بیٹے کو اپنی جائیداد دے دینا اور باقی کے بھائیوں کو سرے سے محروم کر دینا شانِ نبوت کے سراسر خلاف ہے۔ اسی طرح حضرت زکریا علیہ السلام ایسے بیٹے کے لیے دامن

Marfat.com

طلب پھیلا کر دعا مانگا کرتے تھے جوان کی نبوت کی ذمہ داریوں اور علوم وحکمت کا وارث ہو۔ ورنہ ان کے پاس ایسے خزانے کہاں تھے؟ جن کے لیے وہ اتنے بے چین رہتے ہوں اور یعقوب علیہ السلام کو گزرے تو صدیاں بیت چکی تھیں اور ان کے بارہ فرزند تھے۔ ہر ایک فرزند کی کثیر اولاد تھی اور ان صدیوں میں ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی ہو گی۔ اگر کوئی بہت بڑا خزانہ حضرت یعقوب نے چھوڑا ہوگا تو وہ تقسیم در تقسیم سے ناپید ہو چکا ہوگا۔ تو آلِ یعقوب کی وراثت جس کے لیے آپ التجا کر رہے ہیں وہی نبوت کے فرائض ہیں اور علوم و حکمت کے جواہر آبدار ہیں جن کے ضائع ہونے کا آپ کو اندیشہ رہا کرتا تھا اور جو ان کے نزدیک دنیا کے تمام خزانوں سے زیادہ بیش بہا تھے۔

آخر میں یہ فقیر بخاری شریف کی ایک حدیث کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ اسے بکثرت اچھالا جاتا ہے اور سادہ لوح لوگوں کو یہ بات ذہن نشین کرائی جاتی ہے کہ حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر ناراض ہوگئیں اور عمر بھر کے لیے ان سے قطع تعلق کر لیا۔

بخاری شریف میں پانچ مرتبہ فدک کا تذکرہ ہے۔ بخاری صفحہ ۵۲۶ جلد اول کی حدیث کے الفاظ بھی آپ پڑھ چکے ہیں۔ ورق الٹ کر ایک بار پھر یاد تازہ کر لیجئے۔ اس میں حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کی ناراضگی کا کوئی ذکر نہیں۔ بلکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے موقف کی تصدیق کرتے ہیں۔ ان کی فضیلت کا اعتراف کرتے ہیں اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ آخر یہ کہتے ہیں کہ مجھے اس ذاتِ پاک کی قسم جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! حضور کے رشتہ دار مجھے اپنے رشتہ داروں سے کہیں زیادہ عزیز ہیں۔ اسی طرح صفحہ ۵۷۵ جلد دوم پر حدیث مذکور ہے۔ جس میں صراحت سے ذکر ہے کہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے ان املاک کو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے تصرف میں اس شرط پر دیا تھا کہ وہ ان سے حاصل ہونے والی آمدن کو اسی طرح خرچ کریں جس طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خرچ کیا کرتے تھے۔ بعد میں ساری املاک

Marfat.com

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے قبضے میں آئیں، پھر آپ کی شہادت کے بعد حضرت امام حسن، آپ کے بعد حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے قبضہ میں رہیں اور یہ حضرات اپنے اپنے اوقات میں اس آمدنی کو سنت نبوی کے مطابق صرف کرتے رہے۔ حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد آپ کے صاحبزادے حضرت علی بن زین العابدین اور حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حسن، دونوں ان کا باری باری انتظام کرتے رہے۔ پھر زید بن حسن کو یہ خدمت تفویض کی گئی۔ بخاری شریف کے الفاظ ہیں:

فَكَانَتُ هٰذِهِ الصَّدَقَةُ بِيَدِ عَلِيٍّ مَنَعَهَا عَلِيٌّ عَبَّاسًا فَغَلَبَهُ عَلَيْهَا ثُمَّ كَانَ بِيَدِ حَسَنِ بُنِ عَلِيٍّ ثُمَّ بِيَدِ حُسَيْنِ بُنِ عَلِيٍّ ثُمَّ بِيَدِ عَلِيِّ بُنِ حُسَيْنٍ وَ حَسَنِ ابُنِ حَسَنٍ كِلَيُهِمَا كَانَا يَتَدَاوَ لَانِهَا ثُمَّ بِيَدِ زَيْدِ بُنِ حَسَنٍ۔ (1)

اس حدیث میں بھی کہیں حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کی ناراضگی کا ذکر نہیں، بلکہ یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت سیدنا عمر نے ان علاقوں کا انتظام حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا تھا اور یہ سلسلہ چلتا رہا اور مذکورہ بالا حضرات اس کی آمدن کو سنت نبوی ﷺ کے مطابق صرف کرتے رہے۔ انہوں نے بھی اس کی حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اگر یہ ورثہ ہوتی تو حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کے سارے وارثوں میں ان کے حصص کے مطابق تقسیم ہو جاتی، حالانکہ ایسا نہیں ہوا۔ ان حضرات کے مسلسل عمل نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اس فیصلہ پر مہر تصدیق ثبت کر دی اور دل میں اگر خوف خدا موجود ہے تو انہیں قطعاً ان حضرات پر زبانِ طعن دراز کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔

ایک لطیفہ سماعت فرمایئے:

خلیفہ عباسی سفاح، جب پہلا خطبہ دینے کے لیے کھڑا ہوا تو ایک آدمی جس نے اپنے گلے میں قرآن مجید حمائل کر رکھا تھا، کہنے لگا۔ اُنَا شُدُکَ اللّٰهَ اَنُ حَکَّمُتَ بَیُنِیُ وَ بَیُنَ خَصُمِیُ بِهٰذَا الُمُصُحَفِ۔

1۔ صحیح بخاری، باب حدیث بنی نضیر، جلد 2، صفحہ 76-575

Marfat.com

اے خلیفہ! میں تمہیں اللہ تعالیٰ کا واسطہ دے کر التجا کرتا ہوں کہ میرے درمیان اور میرے دشمن کے درمیان اس قرآن کی رو سے فیصلہ کرو۔

خلیفہ نے پوچھا: تمہارا دشمن کون ہے؟ کہنے لگا "اَبُوْبَکْرٍ فِیْ مَنْعِهٖ فِدَکَ" ابوبکر میرا دشمن ہے جس نے فدک اہل بیت کو نہیں دیا۔ سفاح نے پوچھا: اَظَلَمَکَ؟ کیا ابوبکر نے تجھ پر ظلم کیا ہے؟ اس نے کہا: ہاں۔ اس طرح پھر عثمان کے بارے میں گفتگو ہوئی اور اس نے کہا عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی مجھ پر ظلم کیا۔ خلیفہ نے پوچھا کہ کیا علی نے بھی تم پر ظلم کیا؟ اب اس پر سکتہ طاری ہو گیا اور اس سے کوئی جواب نہ بن پایا (1)۔ عملی طور پر حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور ائمہ اہل بیت نے بھی وہی کچھ کیا جو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔ نہ اس زمین کی حیثیت میں تبدیلی کی، نہ اس زمین سے حاصل ہونے والی آمدنی میں کسی قسم کا ردوبدل کیا، نہ کسی کے لیے از راہ وراثت مالکانہ حقوق تسلیم کیے، تو پھر بے انصافی کی حد ہے کہ آپ ان حضرات کو تو کچھ نہ کہیں اور اپنا سارا غصہ حضور کے پیارے محبوب اور وفا شعار ساتھیوں پر نکالیں جن کا جرم یہ ہے کہ انہوں نے سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے انحراف نہ کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کا یہ جرم نہیں ورنہ اس جرم میں تو کئی اور حضرات بھی شریک ہیں اور ان سے یہ لوگ اپنی محبت و عقیدت کا دم بھرتے ہیں۔ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کا اصلی قصور یہ ہے جسے وہ کسی قیمت پر معاف نہیں کر سکے کہ انہوں نے مشرق و مغرب میں اسلام کا نام بلند کر دیا، آتش کدے سرد کر دیے، صلیبوں کو سرنگوں کر دیا۔ شام کے لالہ زاروں اور ایران کے مرغزاروں سے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی دل نواز صدائیں بلند ہونے لگیں۔

اسی طرح بخاری شریف کے دوسرے مقامات پر بھی جو احادیث ہیں، ان میں کہیں حضرت سیدہ کے غصے اور ناراضگی کا ذکر تک نہیں کیا۔ البتہ ایک حدیث جو صفحہ ۵۳۴ پر مذکور ہے وہ غور طلب ہے۔

عروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے انہیں بتایا کہ حضرت

1۔ شرح صحیح مسلم للنوی، جلد 2، صفحہ 90، وزارت تعلیم اسلام آباد

Marfat.com

فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے میراث کا مطالبہ کیا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حدیث پیش کی: لَا نُوْرَثُ۔ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ۔ الخ اور پھر معذرت خواہی کرتے ہوئے گزارش کی:

لَسْتُ تَارِكًا شَيْئًا كَانَ رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم يَعْمَلُ بِهٖ اِلَّا اَنِّیْ عَمِلْتُ بِهٖ فَاِنِّیْ اَخْشٰی اَنْ تَرَكْتُ شَيْئًا مِنْ اَمْرِهٖ اَنْ اَزِيْغَ۔ (1)

''یعنی میں کسی ایسی چیز کو ترک نہیں کر سکتا، جس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل تھا مگر میں اس پر عمل کروں گا، کیونکہ مجھے یہ خوف ہے کہ اگر میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کسی کام کو چھوڑا تو مجھ میں کجی پیدا ہو جائے گی''۔

کتنی صاف بات ہے اور کس حسین انداز سے اپنی معذوری کا اظہار کیا ہے۔ آپ کی ساری زندگی اتباع سنت کا زندہ ثبوت ہے۔

اس حدیث میں یہ الفاظ ہیں:

فَغَضِبَتْ بِنْتُ رَسُوْلِ الله صلى الله عليه وسلم فَهَجَرَتْ اَبَابَكْرٍ فَلَمْ تَزَلْ مُهَاجِرَتَهٗ حَتّٰی تُوُفِّيَتْ۔ (2)

''کہ حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا، ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اس بات پر ناراض ہو گئیں اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے قطع تعلق کر لیا''۔

ان الفاظ میں غور طلب چند امور ہیں۔ کیا یہ حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے کہ میں ابو بکر رضی اللہ عنہ پر ناراض ہوں؟ ہرگز نہیں! اور نہ ہی یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے، بلکہ ان کے بعد کے راویوں میں سے کسی راوی نے اپنے خیال کے مطابق یہ قیاس آرائی کی، لیکن یہ قیاس آرائی شانِ بتول کے سراسر خلاف ہے، کیونکہ یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ آپ کے سامنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول پیش کیا جائے اور آپ اسے بخوشی قبول نہ کریں، بلکہ الٹا ناراضگی کا اظہار کریں۔ آپ ذرا قرآن کریم کی اس آیت پر غور

1۔ صحیح بخاری، باب فرض الخمس، جلد 1، صفحہ 435 2۔ ایضاً

کریں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۶۵﴾ (النساء)

''اے میرے محبوب! تیرے رب کی قسم! وہ لوگ مسلمان ہو ہی نہیں سکتے یہاں تک وہ کہ ہوا پنے متنازعہ امور میں آپ کو حکم تسلیم کریں اور جو آپ فیصلہ فرمادیں اس کے بارے میں ان کے دل میں ناگواری کا کوئی اثر نہ ہواور وہ آپ کے فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کردیں''۔

جب ایک عام انسان پر لازم ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلہ کے سامنے بلا چون و چرا سپر انداز ہو جائے اور اس کے بارے میں کسی قسم کا ملال دل میں نہ لائے تو حضرت خاتونِ جنت کے متعلق یہ کہنا کہ آپ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سن کر ایسی خشمناک ہوگئیں کہ قطع تعلق کرلیا، ہرگز قابل تسلیم نہیں۔ راوی کا یہ بیان ہے اور نیک سے نیک آدمی بھی غلط فہمی کا شکار ہوسکتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب طور سے واپس آئے اور اپنی قوم کو بچھڑے کی پرستش کرتے ہوئے دیکھا تو غصہ سے بے قابو ہوگئے اور یہ خیال کیا کہ شاید اس میں حضرت ہارون کی غفلت کا دخل ہے، حالانکہ ایسا ہرگز نہیں تھا تو اس طرح کی غلط فہمیاں جب اکابر کو ہو جاتی ہیں تو راویٔ حدیث، بے شک عادل اور ثقہ کیوں نہ ہو، اس قسم کی غلط فہمی کا شکار ہو جائے تو قطعاً بعید از فہم نہیں، لیکن اگر ان الفاظ کو حقیقت پر محمول کیا جائے تب بھی ایسی روایات بکثرت موجود ہیں جن سے حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کی خوشنودی کا ثبوت ملتا ہے۔ صرف ایک حوالہ پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔

علامہ کمال الدین میثم البحرانی نہج البلاغۃ کی شرح جلد خامس میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کی گفتگو سن کر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کہا:

''يَا خَيْرَةَ النِّسَاءِ وَابْنَةَ خَيْرِ الْآبَاءِ وَاللّٰهِ! مَا عَدَوْتُ رَأْیَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم وَلَا عَمِلْتُ اِلَّا بِاَمْرِہٖ''۔

Marfat.com

''اے خواتین عالم کی سردار! اے تمام باپوں کے تاجدار کی لخت جگر! خدا کی قسم! میں نے حضور کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رائے سے ذرا تجاوز نہیں کیا۔ میں نے وہی کچھ کیا جس کا حضور ﷺ نے حکم دیا۔ اس کے بعد آپ نے عرض کیا''۔

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰه صلى الله تعالى عليه وسلم يَاْخُذُ مِنْ فِدَكَ قُوْتَكُمْ وَ يُقَسِّمُ الْبَاقِيَ وَ يَحْمِلُ مِنْهُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَكِ عَلَى اللّٰهِ اَنْ اَصْنَعَ بِهَا. كَمَا كَانَ يَصْنَعُ فَرَضِيَتْ بِذٰلِكَ وَ اَخَذَتِ الْعَهْدَ عَلَيْهِ بِهِ.

''حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فدک سے ضروریاتِ زندگی (خوراک) لیا کرتے تھے اور باقی کو مستحقین میں تقسیم کر دیا کرتے تھے اور مجاہدین کو سواریاں اسی سے مہیا فرماتے اور میں اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر اس بات کا وعدہ کرتا ہوں کہ میں بھی وہی کچھ کروں گا جس طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کیا کرتے تھے۔ یہ سن کر آپ راضی ہو گئیں اور اس بات پر عمل پیرا رہنے کا پختہ وعدہ کر لیا''۔

اس کے بعد علامہ کمال الدین لکھتے ہیں جس سے امام بخاری کی بھی تصدیق ہوتی ہے:

وَ كَانَ يَاْخُذُ غَلَّتَهَا فَيَدْفَعُ اِلَيْهِمْ مِّنْهَا مَا يَكْفِيْهِمْ ثُمَّ فَعَلَتِ الْخُلَفَاءُ بَعْدَهُ كَذٰلِكَ

یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ معمول تھا کہ فدک وغیرہ کا غلہ لیتے اور اہل بیت کے افراد میں حسب ضرورت تقسیم کرتے۔ آپ کے بعد آنے والے خلفاء بھی اسی طرح کرتے رہے۔ (شرح نہج البلاغۃ جلد ۵ ص ۱۰۷)

جب ان حقائق کا آپ نے مطالعہ فرما لیا تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر لگائے جانے والے الزام کی مکمل طور پر بیخ کنی ہو گئی اور اسی طرح حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی ذات اقدس واطہر پر جو بہتان تراشی کی جاتی تھی اس کا بھی نام ونشان نہ رہا۔

الحمد لله رب العالمين و الصلوة و السلام على سيد المرسلين و على اله الطاهرين و ازواجه الطاهرات امهات المومنين و على سائر الصحابة و التابعين اجمعين.

Marfat.com

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ

پراعتراضات کا علمی جائزہ

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذاتِ گرامی ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت اور اسلام کی حقانیت کی روشن دلیل ہے، جس سے کوئی سلیم الطبع انسان انکار نہیں کر سکتا۔ ان کی کتابِ زیست کا ہر صفحہ یقین، خلوص، عشق اور ایثار کے تابندہ نقوش سے جگمگا رہا ہے۔ کاروانِ ملت اگر آپ کے نقوش پا کو اپنا خضر راہ بنالے تو آج بھی وہ سدرہ کی بلندیوں پر اپنا آشیاں بنا سکتا ہے، لیکن بدقسمتی سے ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو دانستہ یا نادانستہ اس فرزند جلیل پر الزامات اور اعتراضات کی بوچھاڑ کرتے ہوئے نہیں تھکتے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ حق کی جستجو کرنے والوں کے سامنے حقیقت حال بے کم و کاست پیش کر دی جائے تاکہ شکوک و شبہات کا غبار چھٹ جائے اور حقیقت اپنے رخِ زیبا کے ساتھ آشکارا ہو جائے۔ کسی کو نفس و شیطان کی چیرہ دستیوں سے نجات دلانا اور کمند ہوا و ہوس سے رہائی دلانا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ دین اسلام کا ایک ادنیٰ خادم ہونے کی حیثیت سے ہم پر فرض عائد ہوتا ہے کہ پوری دیانت داری، دلسوزی اور کمال خلوص سے ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں تاکہ امت محمدیہ علی صاحبہا اجمل الثناء واطیب التحیۃ کا کوئی فرد شیطان کے گمراہ کن پروپیگنڈہ سے متاثر ہو کر نعمت ایمان سے محروم نہ ہو جائے۔ ہم رحمت پروردگار سے امیدوار ہیں کہ وہ حق کی تلاش کرنے والوں کی دستگیری فرمائے گا اور منزلِ مراد تک پہنچائے گا۔

وَمَا ذٰلِکَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيۡزٍ۔

یہاں چند ایسے اعتراضات ذکر کیے جا رہے ہیں جو بعض حلقوں کی طرف سے بڑی شد و مد اور جوش و خروش سے پیش کیے جاتے ہیں۔ جب حقیقت حال آپ کے سامنے پیش کی جائے گی تو آپ کو ان اعتراضات کی لغویت کا یقین آجائے گا۔ وَمَا تَوۡفِيۡقِىۡۤ اِلَّا بِاللّٰهِ الۡعَلِيِّ الۡعَظِيۡمِ۔

۱۔ حضرت خالد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے جرنیل تھے۔ انہوں نے مالک

بن نویرہ کو قتل کر دیا، حالانکہ وہ مسلمان تھا اور اس کی بیوی ام تمیم کو اپنے گھر ڈال لیا جو شرعاً جائز نہیں۔ بحیثیت خلیفہ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر لازم تھا کہ آپ قتل بے گناہ کے قصاص میں حضرت خالد کو قتل کرتے اور جرمِ زنا کی سزا میں آپ کو سنگسار کرتے۔ آپ نے حضرت خالد کو کوئی سزا نہیں دی۔ اس طرح شریعت اسلامیہ کی حدود کو توڑا ہے۔

جواب: جب تک صورتِ حال کا تفصیلی تذکرہ آپ کے سامنے ذکر نہ کیا جائے یہ غلط فہمی دور نہیں ہوسکتی۔ مالک بن نویرہ قبیلہ بنی تمیم کا سردار تھا۔ وجیہہ، خوب صورت، سخی اور شجاعت میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ اپنے قبیلہ کے ساتھ بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوا۔ حضور ﷺ نے ازراہِ نوازش اسے اپنے قبیلہ کی زکوٰۃ اور صدقات جمع کرنے کا منصب تفویض فرمایا اور حضور ﷺ کے وصال تک یہ اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔ سرورِ دو عالم ﷺ کی رحلت کے بعد ارتداد کا جو جھکڑ چلا اس میں یہ بھی اپنی شمع ایمان کو بچا نہ سکا۔ دوسرے کئی لوگوں کی طرح اس نے بھی زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ زکوٰۃ اور صدقات کی مد میں جو روپیہ یا غلہ اس کے پاس جمع تھا، اس نے اسے اپنی قوم میں تقسیم کر دیا۔ جب حضور ﷺ کی وفات کی خبر اس کے پاس پہنچی تو اس کے گھر کی عورتوں نے مہندی لگائی، ڈھول بجائے اور خوب فرحت وشادمانی کا اظہار کیا۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے طلیحہ، جس نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا، کے مقابلے کے لیے حضرت خالد کو روانہ کیا۔ حضرت خالد جب اس کے علاقہ میں پہنچے تو طلیحہ نے راہِ فرار اختیار کی اور اس کا قبیلہ تتر بتر ہو گیا۔ اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے مالک بن نویرہ کی گوشمالی کا قصد کیا جو بطاح کے علاقہ میں انکار زکوٰۃ کی خطرناک مہم کا سرغنہ بنا ہوا تھا۔ آپ کی آمد کی خبر سن کر اس کے حواس باختہ ہو گئے۔ اس کے کئی ساتھی تائب ہو کر از سرِ نو مسلمان ہو گئے، لیکن یہ شش و پنج میں ہی مبتلا رہا اور آخر وقت تک کوئی فیصلہ نہ کر سکا اور وہ انکار زکوٰۃ کے موقف پر ڈٹا رہے یا اپنے دوسرے رفقاء کی طرح توبہ کر کے از سرِ نو مسلمان ہو جائے۔

حضرت خالد قبیلہ اسد و غطفان اور ان کے حلیفوں سے نپٹنے کے بعد جب بطاح کے

Marfat.com

علاقہ میں پہنچے تو مالک بن نویرہ نے اپنے قبیلہ کو منتشر ہونے کا حکم دے دیا اور انہیں مسلمانوں سے جنگ کرنے سے منع کر دیا۔ جب خالد بطاح میں پہنچے تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ آپ نے اپنے لشکر کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے علاقہ میں پھیل جانے کا حکم دیا اور انہیں ہدایت کی کہ جو شخص تمہیں ملے اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دو۔ اگر وہ یہ دعوت قبول کرے تو اس سے تعرض نہ کرنا اور اگر وہ انکار کر دے تو وہ مرتد ہے اور واجب القتل۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بھی اسلامی لشکروں کو ملک کے مختلف اطراف میں روانہ کرنے سے پہلے یہ وصیت کی تھی کہ وہ جہاں جائیں اذان دیں۔ اگر وہاں کے رہنے والے بھی اذان دیں تو ان پر حملہ نہ کریں اور اگر ان کی بستی سے اذان کی آواز بلند نہ ہو تو ان پر حملہ کرنے کی اجازت ہے۔ جب وہ اسلام کی دعوت کو قبول کر لیں تو پھر ان سے زکوٰۃ کے بارے میں دریافت کریں۔ اگر وہ زکوٰۃ دینے پر بھی آمادہ ہو جائیں تو انہیں کچھ نہ کہا جائے اور اگر وہ زکوٰۃ دینے سے انکار کریں تو پھر ان کو تہ تیغ کر دیں۔

لشکر اسلام کا ایک دستہ مالک بن نویرہ کو اس کے چند ساتھیوں کے ساتھ گرفتار کر کے حضرت خالد کے پاس لے آیا۔ آپ نے اس دستہ سے پوچھا کہ کیا مالک نے اسلام قبول کیا ہے یا نہیں؟ تو حضرت ابو قتادہ انصاری نے جو اس دستہ میں شریک تھے کہا کہ بے شک اس نے اسلام قبول کیا، لیکن اس دستہ میں شامل دوسرے لوگوں نے اس کے مسلمان ہونے کی تردید کی اور بتایا کہ وہ حسب سابق اپنے ارتداد پر قائم ہے۔ اس اختلاف کے باعث حضرت خالد نے خود مالک بن نویرہ سے طویل گفتگو کی۔ تفصیل دیگر مؤرخین کے علاوہ علامہ ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں تحریر کی ہے۔

جب مسلمان لشکر مالک بن نویرہ کو گرفتار کر کے حضرت خالد کی خدمت میں لے آیا تو آپ کی اس سے طویل گفتگو ہوئی۔ مالک نے حضرت خالد کے استفسار کے جواب میں کہا:

اَنَا آتِی بِالصَّلٰوۃِ دُوْنَ الزَّکٰوۃِ۔

(میں نماز ادا کرتا ہوں لیکن زکوٰۃ کی فرضیت کا قائل نہیں ہوں)۔

Marfat.com

حضرت خالد نے کہا:

"اَمَا عَلِمۡتَ اَنَّ الصَّلٰوۃَ وَالزَّکٰوۃَ مَعًا لَّا تُقۡبَلُ وَاحِدَۃٌ دُوۡنَ اُخۡرٰی؟"۔

"کیا تم نہیں جانتے کہ نماز اور زکوٰۃ کی فرضیت یکساں ہے اور ایک کے بغیر دوسری قبول نہیں ہوتی؟"۔

مالک نے بڑی بے پرواہی سے جواب دیا:

قَدۡ کَانَ صَاحِبُکَ یَقُوۡلُ ذٰلِکَ۔

(ہاں! تمہارا صاحب یونہی کہا کرتا تھا)۔

حضرت خالد اس کے گستاخانہ لہجہ اور اندازِ گفتگو کو سن کر برافروختہ ہو گئے۔ فرمایا: کیا حضور تمہارے صاحب نہیں ہیں؟ اگر تم زکوٰۃ دینے سے انکار کرو گے تو تمہارا سر قلم کر دوں گا۔

پھر اس کے منہ سے نکلا:

اَوۡ بِذٰلِکَ اَمَرَ صَاحِبُکَ؟ (کیا تمہارے صاحب نے تمہیں یہی حکم دیا ہے؟)

خالد نے غصہ سے کہا:

وَھٰذِہٖ بَعۡدَ تِلۡکَ ثُمَّ اَمَرَ بِقَتۡلِہٖ۔ (1)

پہلی گستاخی کے بعد دوبارہ پھر گستاخی کر رہے ہو، پھر آپ نے اس کے قتل کا حکم دیا۔

اسی گفتگو سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ مالک بن نویرہ اگرچہ نماز کا قائل تھا، لیکن زکوٰۃ کا منکر تھا۔ پھر نبی کریم ﷺ کے ادب اور احترام سے اس کا دل خالی تھا۔ اسی لیے بار بار صاحبک کا لفظ اس کی زبان سے نکل جاتا تھا۔ آپ خود ہی انصاف کریں کہ جو شخص مسلمان ہونے کے بعد مرتد ہو جائے، جو شخص ارکانِ دین سے زکوٰۃ جیسے اہم رکن کا انکار کر دے، جو شخص بارگاہ رسالت ﷺ میں گستاخانہ لہجہ اختیار کرے، اس کا اسلام سے کیا تعلق باقی رہتا ہے؟ یقیناً وہ شخص واجب القتل تھا اور حضرت خالد نے شریعت اسلامیہ کے ضابطے کے مطابق اس کو تہ تیغ کیا۔

1۔ خالد بن ولید از محمود شیث خطاب، صفحہ 99، دار الفکر بیروت

Marfat.com

کیونکہ وہ نماز کی فرضیت کا قائل تھا، حضرت ابوقتادہ نے اس کی اذان ضرور سنی ہوگی لیکن اس وقت جو فتنہ اٹھ کھڑا ہوا تھا وہ نماز کی فرضیت کے بارے میں نہ تھا، بلکہ زکوٰۃ کی فرضیت کے بارے میں تھا اور امت کا اس پر اجماع ہے کہ جو شخص دین کے فرائض میں سے کسی ایک فرض کا بھی انکار کرے تو وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

علامہ ابن خلدون نے اس واقعہ کی تفصیل یوں لکھی ہے:

حضرت خالد کے پہنچنے سے پہلے مالک نے اپنے لشکر کو منتشر کر دیا۔ حضرت خالد نے انہیں تلاش کرنے کے لیے اپنی فوج کے دستے روانہ کیے۔ ایک دستہ مالک بن نویرہ کو اس کے چند ساتھیوں کے ساتھ گرفتار کر کے لے آیا۔ اس کے بارے میں اس دستہ میں اختلاف رونما ہوا۔ ابوقتادہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اذان بھی دی اور نماز بھی پڑھی۔ دوسرے مجاہدین اس بات کو تسلیم نہ کرتے تھے۔ حضرت خالد نے ان لوگوں کو نظر بند کر دیا تاکہ ان کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے پوری تحقیق کر لی جائے اور حضرت ضرار بن ازور کو ان کی حفاظت پر مقرر کیا۔ موسم سخت سرد تھا اور رات کو بارش برسنے لگی۔ حضرت خالد کو ان نظر بندوں کا خیال آیا تو پریشان ہو گئے۔ مبادا سردی اور بارش کی وجہ سے انہیں تکلیف پہنچ رہی ہو۔ آپ نے ایک آدمی دوڑایا جس نے یہ پیغام پہنچایا:

اِدْفِئُوْا اَسْرَاکُمْ۔ اس کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ اس کڑاکے کی سردی میں ان نظر بندوں کو گرم رکھو تاکہ ٹھنڈ انہیں گزند نہ پہنچائے، لیکن بنی کنانہ کی لغت میں یہ جملہ بطورِ کنایہ قتل کرنے کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا۔ ضرار، جن کے سپرد ان کے اسیروں کی نگہداشت تھی، بنی کنانہ کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے، انہوں نے یہی سمجھا کہ قائد لشکر نے ان قیدیوں کو تہ تیغ کرنے کا حکم دیا ہے، چنانچہ انہوں نے ان سب کا کام تمام کر دیا۔ جب شور و غل بلند ہوا تو حضرت خالد نے اس کی وجہ پوچھی۔ حقیقت حال سن کر آپ بڑے متاسف ہوئے، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا؟ (1)۔ اس واقعہ کے بارے میں ایک تیسری روایت ہے جسے علامہ یاقوت

1۔ تاریخ ابن خلدون، جلد 2، صفحہ 875، دار الکتب اللبنانی بیروت

Marfat.com

نے اپنی کتاب معجم البلدان میں ''بطاح'' کے عنوان کے نیچے درج کیا ہے۔

لکھتے ہیں: بطاح بنی اسد قبیلہ کے علاقہ میں ایک چشمہ کا نام ہے، وہاں مسلمان اور مرتدین کے درمیان جنگ ہوئی۔ مسلمانوں کے سپہ سالار حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ تھے اور ضرار بن ازور اسلامی مقدمہ الجیش کے سالار تھے۔ مالک بن نویرہ اپنے لشکر کے ساتھ ان کے مقابلہ کے لیے نکلا۔ بطاح کے میدان میں دونوں لشکروں کے درمیان جنگ ہوئی۔ ضرار نے کھلی جنگ میں مالک کو قتل کیا۔ (1)۔ ان روایات میں جو تاریخی اہمیت کی حامل ہیں اس بات کا ثبوت نہیں کہ حضرت خالد نے قتل عمد کا ارتکاب کیا اور مالک بن نویرہ کو مسلمان سمجھتے ہوئے تہ تیغ کیا، تاکہ ان سے قصاص لیا جائے۔

صاحب اغانی نے اس واقعہ کو جس افسانوی رنگ میں پیش کیا ہے وہ ادب کی کتابوں میں تو گوارا کیا جا سکتا ہے، لیکن مؤرخ کی نظروں میں اس کی قطعاً کوئی تاریخی اہمیت نہیں تاکہ اس پر استدلال کی عمارت تعمیر کر کے حسب منشا نتائج اخذ کیے جائیں، لیکن یہ بات وہیں ختم نہیں ہوتی۔ ابو قتادہ غصہ سے بھرے ہوئے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور زور وشور سے حضرت خالد کی شکایت کی۔ انہوں نے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو اپنا ہمنوا بنالیا۔ چنانچہ حضرت خالد کو دربار خلافت میں طلب کیا گیا اور آپ سے اس بارے میں باز پرس کی گئی۔ آپ نے جب خلیفۃ الرسول کی بارگاہ میں حقیقت حال پیش کی تو حضرت ابوبکر مطمئن ہو گئے اور انہیں اپنی فوج کی قیادت کرنے کے لیے محاذ جنگ پر واپس بھیج دیا۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب آپ کو بار بار مجبور کیا کہ خالد سے قصاص لیا جائے تو آپ نے فرمایا:

هَبْهُ، يَا عُمَرُ! تَاوَّلَ فَاخطأَ فَارْفَعْ لِسَانَكَ عَنْ خَالِدٍ.

اے عمر! چھوڑ دو بھی۔ زیادہ سے زیادہ اس نے تاویل کی ہے اور اس میں اس سے خطا ہوئی۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ پھر بھی نہ مانے تو آپ نے دوٹوک الفاظ میں کہا:

1۔ معجم البلدان، جلد 1، صفحہ 445، دار صادر بیروت

Marfat.com

يَا عُمَرُ! مَا كُنتُ لَا شِيمَ سَيفًا سَلَّهُ اللّٰهُ عَلَى الْكَافِرِينَ۔ (1)

اے عمر! ہرگز نہیں! میں اس تلوار کو نیام میں ڈالنے کے لیے تیار نہیں جسے اللہ تعالیٰ نے کفار پر بے نیام کیا ہے۔

اہل نظر جب حضرت خالد کے بارے میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے فیصلے کو دیکھتے ہیں تو ان کی حیرت کی حد نہیں رہتی کہ آپ نے وہی فیصلہ کیا کہ جو آپ کے آقا و مولا ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں کیا تھا، جب ان ہی خالد سے اسی قسم کا واقعہ سرزد ہوا تھا۔ اس واقعہ کا اجمالی ذکر فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

بنی خدیمہ کی طرف حضور ﷺ نے ایک سریہ بھیجا تھا جس کے قائد حضرت خالد تھے۔ وہ لوگ اس سے پہلے مسلمان تو ہو چکے تھے، لیکن اسلامی قواعد اور اصطلاحات سے روشناس نہ تھے۔ جب مجاہدین نے ان پر حملہ کیا تو زور زور سے کہنے لگے: ''صَبَأْنَا صَبَأْنَا''۔ اس کا لفظی معنی تو یہ ہے کہ ہم بے دین ہو گئے۔ ہم بے دین ہو گئے۔ لیکن ان الفاظ سے ان کا مقصد یہ تھا کہ ہم نے اپنا آبائی دین چھوڑ دیا ہے اور نیا دین، اسلام قبول کر لیا ہے۔ صحابہ کرام ان کے اس مفہوم کو نہ سمجھ سکے اور ان میں سے بیشتر کو تہ تیغ کر دیا۔

حضور ﷺ کی خدمت میں جب یہ واقعہ پیش کیا گیا تو حضور ﷺ بہت برافروختہ ہوئے اور بڑے افسوس کے ساتھ یہ الفاظ کہے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَبْرَئُ اِلَيْکَ مِمَّا صَنَعَ خَالِدٌ۔ (2)

''اے اللہ! خالد نے جو کچھ کیا ہے میں اس سے تیری جناب میں برأت کا اظہار کرتا ہوں''۔

حضور ﷺ نے ان مقتولین کی دیت بیت المال سے ادا کر دی، لیکن نہ حضور نے حضرت خالد کو ان کے قصاص میں قتل کیا اور نہ ان کو ان کے منصب سے معزول کیا۔ جو

1۔ الکامل فی التاریخ، جلد 2، صفحہ 59-358، خالد بن ولید للمخزومی، صفحہ 101

2۔ صحیح بخاری، باب بعث النبی ﷺ الی بنی خذیمۃ، جلد 2، صفحہ 622

Marfat.com

فیصلہ حضور ﷺ نے حضرت خالد کے بارے میں کیا تھا، حضور ﷺ کے جانشین صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بعینہٖ وہی فیصلہ فرمایا۔ اب کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ بارگاہِ صدیقی میں زبان طعن دراز کر سکے؟

اس کے علاوہ عہد نبوت میں متعدد واقعات رو پذیر ہوئے اور حضور ﷺ نے کسی سے قصاص نہیں لیا۔

ایک جنگ میں حضرت اسامہ نے ایک ایسے شخص کو قتل کر دیا جس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پڑھا تھا۔ حضور ﷺ کو پتہ چلا تو حضور ﷺ نے فرمایا:

"یَا اُسَامَۃُ اَقَتَلْتَہٗ بَعْدَ اَنْ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" (1)

اے اسامہ! تو نے اس کے بعد اس شخص کو قتل کیا جب اس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا اقرار کر لیا۔

یہ جملہ حضور ﷺ نے تین مرتبہ دہرایا۔ اسامہ کے اس فعل پر اپنی ناراضگی کا اظہار کر لیا لیکن حضرت اسامہ سے نہ قصاص لیا اور نہ ان کو دیت ادا کرنے کا حکم دیا اور نہ یہ فرمایا کہ تم کفارہ ادا کرو۔

حالت جنگ میں اس قسم کے واقعات فوری طور پر رو پذیر ہوتے رہتے ہیں کہ جن کے بارے میں فیصلہ درست نہیں ہوتا، لیکن اس میں کسی قسم کی بدنیتی کا شائبہ نہیں ہوتا۔ اگر ایسے واقعات پر قائد لشکر سے قصاص کا مطالبہ شروع کر دیا جائے تو پھر جنگ ہو چکی۔

ہم ان لوگوں سے بڑے ادب کے ساتھ یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر اعتراض کرتے ہوئے نہیں تھکتے کہ اگر ان سے کوئی شخص یہ پوچھے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے باوجود خلیفہ با اختیار ہونے کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے کیوں قصاص نہیں لیا تو اس کا وہ کیا جواب دیں گے؟ جو ان کا جواب ہوگا وہی حضرات حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف سے قبول فرمالیں۔

1۔ صحیح بخاری، باب قول اللہ ومن احیاھا، جلد 2، صفحہ 1015

Marfat.com

اس سلسلے میں دوسرا اعتراض مالک بن نویرہ کی زوجہ ام تمیم کے بارے میں کیا جاتا ہے کہ حضرت خالد نے مالک کے قتل کے بعد فوراً اسے اپنی زوجہ بنالیا، حالانکہ انقضائے عدت سے پہلے اس کے ساتھ نکاح جائز نہیں تھا۔

اس کے بارے میں عرض ہے کہ عدت وفات کا گزارنا اس وقت ضروری ہوتا ہے جب خاوند مسلمان ہو ایک کافر اور مرتد کے قتل کے بعد اس کی بیوی پر عدت گزارنا ضروری نہیں البتہ استبراء رحم ضروری ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ وہ حاملہ نہیں اور وہ ایک حیض سے بھی ہو سکتا ہے اور اس قسم کی روایات کتب معتبرہ میں موجود ہیں کہ آپ نے تین حیض گزارنے کے بعد اس کو نکاح کا پیغام بھیجا جو اس نے قبول کر لیا۔

علامہ ابن خلقان لکھتے ہیں:

وَ قِيلَ اِنَّهَا اعْتَدَّتْ ثَلَاثَ حِيَضٍ ثُمَّ خَطَبَهَا عَلٰى نَفْسِهٖ فَاَجَابَتْهُ۔

(وفیات الاعیان)

کہ ام تمیم نے تین حیض گزار کر اپنی عدت پوری کی اور پھر حضرت خالد نے اسے نکاح کا پیغام بھیجا جو اس نے قبول کر لیا۔

اسی طرح علامہ ابن کثیر نے تصریح کی ہے:

فَلَمَّا حَلَّتْ بَنٰى بِهَا۔ (1)

جب وہ شرعاً حلال ہوگئی تو آپ نے اس کو اپنی زوجیت میں لیا۔

۲۔ دوسرا اعتراض

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر معترضین کی طرف سے یہ الزام بھی عائد کیا جاتا ہے کہ شہدائے جنگ موتہ کا انتقام لینے کے لیے سرورِ دو عالم ﷺ نے ایک لشکر ترتیب دیا۔ اس میں مہاجرین وانصار کے جلیل القدر بزرگ شامل تھے۔ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا نام ان مجاہدین میں تھا، لیکن حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نہ خود گئے اور نہ حضرت عمر

1۔ البدایۃ والنھایۃ، جلد 6، صفحہ 322 ف

Marfat.com

رضی اللہ عنہ کو بھیجا، حالانکہ حضور ﷺ نے یہ تاکیدی حکم فرمایا تھا:

جَهِّزُوا جَيْشَ أُسَامَةَ لَعَنَ اللّٰهُ تَعَالٰى مَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا.

''اسامہ کے لشکر کی تیاری کرو۔ خدا اس شخص پر لعنت کرے جو اس کے پیچھے رہ جائے''۔

وہ کہتے ہیں کہ اس فرمانِ نبوی ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سیرت کے بارے میں ساری خوش فہمیاں ختم ہو جاتی ہیں۔

جواب

معترضین نے اپنے دل کا غبار نکالنے کے لیے یہ اعتراض تو جڑ دیا، لیکن حالات کا تفصیلی جائزہ لینے کی زحمت گوارا نہ کی جو اس وقت رونما ہوئے، ورنہ وہ غلط فہمی کی اس دلدل میں پھنس کر نہ رہ جاتے۔ حقیقت حال پیش خدمت ہے۔ مطالعہ فرمائیے اور اپنے قلب سلیم سے فیصلہ طلب کیجئے۔ ساری غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

۲۶ صفر بروز دوشنبہ حضور ﷺ نے ایک لشکر تیار کیا۔ زید بن حارثہ شہید موتہ کے نوخیز فرزند حضرت اسامہ کو اس کا سپہ سالار مقرر کیا۔ ۲۸ صفر کو نبی کریم ﷺ کی طبیعت ناساز ہوگئی، اس کے باوجود حضور ﷺ نے دوسرے روز اپنے دست مبارک سے پرچم باندھا اور اسامہ کو حکم دیا:

اُغْزُ بِسْمِ اللّٰهِ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ فَقَاتِلْ مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ. (1)

''اللہ کا نام لے کر اللہ کے راستے میں جہاد کے لیے روانہ ہو جاؤ، جو شخص اللہ تعالیٰ کا منکر ہو اس کے ساتھ جنگ کرو''۔

حضرت اسامہ یہ پرچم لیے ہوئے مقامِ جرف پر آ کر رکے اور مجاہدین کا انتظار کرنے لگے۔ بدھ کے روز مرض نے شدت اختیار کر لی۔

پنجشنبہ کی رات کو فخر دو عالم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ نماز میں لوگوں کی امامت کا فریضہ انجام دیں جس کی تفصیل آپ پہلے پڑھ چکے ہیں۔ گویا ابتداء میں

1۔ تاریخ الخمیس، جلد 2، صفحہ 154

Marfat.com

حضور ﷺ نے آپ کو اسامہ کے لشکر کا سپاہی مقرر کیا، لیکن پھر حضور ﷺ نے ہی اپنی علالت کی وجہ سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اپنی مسجد کا امام مقرر فرمایا اور سب لوگوں کو حکم دیا کہ وہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں نماز ادا کریں۔ ڈیوٹی میں تبدیلی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنی مرضی سے نہیں کی، بلکہ حضرت رسالت مآب ﷺ نے فرمائی۔ آپ کا تخلف حضور ﷺ کے حکم سے تھا نہ کہ اپنی مرضی سے اور جو کام صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے مرشد برحق کے ارشاد کے مطابق سرانجام دیا اس پر کسی کو اعتراض کرنے کا کیا حق ہے؟

حضور سرورِ دو عالم ﷺ کے وصال کے بعد امت مسلمہ نے بالاتفاق آپ کو خلیفۃ الرسول کے منصب کے لیے چن لیا۔ اب صرف اسامہ کے لشکر کی تیاری ہی آپ کا فرض نہیں رہا تھا، بلکہ مملکت اسلامیہ کو داخلی اور بیرونی، ہر قسم کے خطرات سے محفوظ کرنا آپ کی منصبی ذمہ داری ہو گئی تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ حضور ﷺ کے وصال کے سانحہ کے بعد یکایک ارتداد و بغاوت کی آندھیاں چلنے لگیں۔ وہی قبائل جو کل تک اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے اب اسلام کی بنیادی تعلیمات کا انکار کرنے لگ گئے۔ ان حالات کے پیش نظر اکابر صحابہ نے یہ مشورہ دیا کہ اسامہ کے لشکر کی روانگی کو کچھ وقت کے لیے ملتوی کر دیا جائے، ایسا نہ ہو کہ دارالسلطنت کو خالی دیکھ کر دشمن یلغار کر دے۔ بے شک مصلحت کا تقاضا تو یہی تھا، بظاہر حالات بھی اس تجویز کی تائید کر رہے تھے، لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ایمان اور یقین اس مشورہ کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ آپ نے فرمایا: جس لشکر کا پرچم رحمت عالم ﷺ نے اپنے دست مبارک سے باندھا ہے، ابو بکر کی مجال نہیں کہ اس کو کھول سکے۔ حالات کتنے ہی ابتر اور سنگین کیوں نہ ہوں؟ یہ لشکر نبی اکرم ﷺ کی مقرر کردہ مہم کو سر کرنے کے لیے ضرور جائے گا۔ پھر پورے ساز و سامان کے ساتھ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جیش اسامہ کو الوداع کہا اور چند ہفتوں کے بعد فتح و نصرت کے پھریرے لہراتا ہوا یہ لشکر بخیر و عافیت مدینہ منورہ واپس آ گیا۔

Marfat.com

ان حالات میں اس لشکر کو روانہ کرنا، اس کے لیے ہر قسم کا اسلحہ اور ساز وسامان مہیا کرنا، تمام مصلحتوں اور خطرات کو پس پشت ڈالتے ہوئے اتنی بعید مسافت پر اس کو بھیجنا، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا وہ کارنامہ ہے جس پر اسلام اور ایمان کو ناز ہے۔

گر نبیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

نیز یہ جملہ "جَهِّزُوْا الخ" جو ان لوگوں نے حضور ﷺ کی طرف منسوب کیا ہے، اہل سنت کی کسی معتبر کتاب میں موجود نہیں۔ یہ ان لوگوں کی خانہ زاد اختراع ہے جو آفتابِ صدیقیت کی تاب نہیں لا سکتے۔

تیسرا اعتراض

معترضین کہتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خود اعتراف کیا:

اِنَّ لِیْ شَیْطَانًا یَّعْتَرِیْنِیْ۔ فَاِنِ اسْتَقَمْتُ فَاَعِیْنُوْنِیْ وَاِنْ زَغْمْتُ فَقَوِّمُوْنِیْ۔

یعنی ایک شیطان ہے جو مجھ پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اگر میں سیدھے راستے پر چلوں تو میری امداد کرو اور اگر کجی اختیار کروں تو مجھے درست کرو۔

معترضین کہتے ہیں کہ آپ شیطان کے زیر اثر ہیں۔ وہ جب چاہے آپ کو راہِ راست سے بہکا سکتا ہے۔ ایسا شخص تو امامت وخلافت کے منصب کا ہرگز سزاوار نہیں۔

جواب

اس کے متعلق پہلی گزارش تو یہ ہے کہ اہل سنت کی کسی معتبر کتاب میں یہ قول موجود نہیں بلکہ ان حضرات کا طبع زاد ہے جو صحابہ کرام کی شان کی تنقیص میں ہر لحہ جدت طرازیاں کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے اس کے جواب کی ذمہ داری ہم پر عائد ہی نہیں ہوتی اور اگر ایک لحہ کے لیے یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ آپ کا ہی قول ہے تو اس میں قباحت کون سی ہے؟ اللہ کے بندے ہر وقت اپنے نفس کی وسوسہ اندازیوں سے چوکنے رہتے ہیں۔ شیطان کی وسوسہ کاریوں سے بچنے کے لیے مصروفِ عمل رہتے ہیں۔ کیا آپ نے حضرت یوسف

Marfat.com

علیہ السلام کا یہ قول نہیں پڑھا جسے زبانِ قدرت نے قرآن مجید میں نقل فرمایا ہے:

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیۡ

(یوسف: ۵۳)

آپ نبی ہیں، صدیق ہیں، گلشن خلیل کے گل سر سبد ہیں، لیکن بایں ہمہ فرماتے ہیں کہ میں اپنے نفس کی برأت کا دعویٰ نہیں کرتا۔ بے شک نفس کا کام ہی یہ ہے کہ وہ برائی کا بکثرت حکم دیتا ہے مگر جس پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے وہ اس کی زد سے محفوظ رہتا ہے۔

یہ عجز و نیاز کا مقام ہے۔ جتنا کسی کا مرتبہ بلند و بالا ہوتا ہے اتنا ہی اس میں سرافگندگی اور اعتراف عبدیت کا جذبہ شدید ہوتا ہے۔ یہ اس کے کمال کی دلیل ہے نہ کہ نقص وعیب۔

امام الاتقیاء سید الاولیاء حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشادِ گرامی ہے:

فَلَا تَكُفُّوْا عَنْ مَقَالَةٍ بِحَقٍّ اَوْ مَشْوَرَةٍ بِعَدْلٍ فَاِنِّیْ لَسْتُ فِیْ نَفْسِیْ بِفَوْقِ اَنْ اُخْطِیَ وَلَا اٰمَنُ ذٰلِکَ مِنْ فِعْلِیْ۔(1)

یعنی حق بات کہنے سے اور عدل کا مشورہ دینے سے باز نہ رہا کرو، کیونکہ میں اپنے آپ کو خطا سے بلند خیال نہیں کرتا اور نہ مجھے یہ یقین ہے کہ میرا ہر فعل درست ہے۔ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد آپ کی رفعت شان کی دلیل ہے۔ اس لیے یہ معنی اخذ کرنا کہ آپ خطا کار تھے یا آپ کے افعال قابل اعتماد نہ تھے، پھر اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ آپ منصب امامت کے اہل نہ تھے حد درجہ کی نادانی اور ابلہی ہے۔

حضرت امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ، جن کی زندگی کا ہر ہر لمحہ ذکر الٰہی اور اطاعت الٰہی میں بسر ہوا۔ جن کے دامن عصمت پر خطا اور غفلت کا کوئی داغ موجود نہیں، بارگاہِ الٰہی میں دست دعا پھیلاتے ہیں اور یوں عجز و نیاز کا اظہار کرتے ہیں۔

"قَدْ مَلَکَ الشَّیْطٰنُ عِنَانِیْ فِیْ سُوْءِ الظَّنِّ وَ ضَعْفِ الْیَقِیْنِ وَ اَنَا اَشْکُوْ سُوْءَ مُجَاوَرَتِهٖ لِیْ وَ طَاعَةَ نَفْسِیْ لَهٗ وَاَسْتَعْصِمُکَ مِنْ مَلَکَتِهٖ وَاَتَضَرَّعُ اِلَیْکَ

1۔ نہج البلاغۃ، جلد 2، صفحہ 227، مکتبہ تجاریہ کبریٰ مصر

Marfat.com

فِیۡ صَرۡفِ کَیۡدِہٖ عَنِّیۡ"۔ (صفحہ ۱۱۶ صحیفہ کاملہ سجادیہ مطبوعہ تہران۔ مصنف حاجی شیخ عباس قمی)

اس عربی عبارت کا فارسی ترجمہ بھی اسی کتاب کے صفحہ ۱۱۶ پر موجود ہے وہ بھی پیش خدمت ہے تاکہ کسی قسم کا اشتباہ نہ رہے۔ مترجم ہیں آقائی حاج مرزا ابوالحسن شعرانی۔

"شیطان عنان مرا گرفتہ سوئے ضعف یقین و بدگمانی مے کشاند اکنوں از بد صحبتی او نسبت بمن وخوش طاعتی خودم نسبت باو شکایت دارم واز چیرہ گشتن او پناہ بتو مے برم وبلابہ وزاری از تو مے خواہم کید او را از من دفع کنی"۔

ترجمہ: (الٰہی!) شیطان میری باگ کو پکڑ کر مجھے یقین اور (تیری رحمت سے) بدگمانی کی طرف کھینچ رہا ہے اور اب اپنے بارے میں اس کی ہمسائیگی کی برائی اور اس کی اطاعت کیشی سے میں تیری جناب میں شکوہ سنج ہوں۔ اس کے غالب آنے سے میں تیری پناہ ڈھونڈتا ہوں۔ بڑی عاجزی اور زاری سے درخواست کرتا ہوں کہ اس کے مکر وفریب کو مجھ سے دور کردے"۔

بارگاہِ رب العزت میں امام معصوم کی یہ درخواست عجز و نیاز کا ایک لاجواب مرقع ہے، جو صرف آپ کے مقامِ رفیع اور ذات ستودہ صفات کے شایانِ شان ہے۔ اگر کوئی بد دماغ اس عبارت کو پڑھ کر آپ کی علو مرتبت کا انکار کرتا ہے یا اس اعتراف کے پیش نظر آپ کو منصب امامت کا اہل نہیں گردانتا تو یہ اس کی بدبختی اور حرماں نصیبی کی انتہا ہے۔ اسی ارشاد پر آپ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف منسوب اس قول کو محمول کر لیجئے۔

اگر آپ اس خود ساختہ روایت کا سہارا لے کر بارگاہِ صدیقی میں زبانِ طعن دراز کرنے پر مصر ہوں گے تو بات یہاں پر ختم نہیں ہو جائے گی، بلکہ ان اولوالعزم ہستیوں کے بارے میں آپ گستاخ لوگوں کو زبان درازی کا زریں موقع فراہم کردیں گے۔

چوتھا اعتراض

یہ صاحبان جولانی طبع کا مظاہرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

Marfat.com

اَقِیْلُوْنِیْ فَلَسْتُ بِخَیْرِکُمْ وَ عَلِیٌّ فِیْکُمْ۔

''مجھے بیعت خلافت سے سبکدوش کردیں، میں تم میں سے بہتر نہیں ہوں جبکہ علی تم میں موجود ہے''۔

یہ جملہ نقل کرنے کے بعد معترضین کہتے ہیں کہ اگر آپ خلیفہ برحق تھے تو آپ کا مستعفی ہونا معصیت تھا اور اگر آپ خلیفہ برحق نہیں تھے، بلکہ جبراً مسند خلافت پر متمکن ہو گئے تھے تو پھر آپ کے بارے میں کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔

جواباً گزارش ہے کہ یہ عبارت بھی اہل سنت کی کتب احادیث میں سے کسی معتبر کتاب میں موجود نہیں اور نہ اس کی سند کا سراغ لگ سکتا ہے۔ یہ عبارت بھی اپنی اس ترتیب کے ساتھ یارانِ ستم کیش کی طبع فتنہ زاد کا اختراع ہے۔

پانچواں اعتراض

اس اعتراض کو بھی بڑے زور وشور سے اچھالا جاتا ہے اور اس سے شانِ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تنقیص ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی جاتی ہے۔ اسے بھی سماعت فرمائیے، پھر حقیقت حال پیش خدمت کی جائے گی۔ آپ بآسانی کسی نتیجہ پر پہنچ جائیں گے۔

وہ کہتے ہیں کہ ۷ھ میں حجاج کا جو قافلہ مدینہ طیبہ سے روانہ ہوا، اس کے امیر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مقرر ہوئے۔ نیز آپ کو یہ حکم دیا گیا کہ وہاں جا کر حج کے موقع پر سورۂ برأت کا اعلان کردیں۔ اس قافلہ کے روانہ ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس منصب کے اہل نہ سمجھا اور معزول کردیا اور وہ قافلۂ حجاج کے امیر بھی نہیں بن سکتے، ساری امت مسلمہ کے امیر کیونکر بن سکتے ہیں؟

یہ تو تھی ان کی بات۔ اب حقیقت حال پر غور فرمائیں۔

۶ھ کو صلح حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا۔ شرائط صلح میں سے ایک شرط یہ تھی کہ اس دفعہ مسلمان واپس چلے جائیں اور آئندہ سال وہ حج ادا کرنے کے لیے آسکتے ہیں۔ چنانچہ ۷ھ میں حجاج کرام کا ایک قافلہ تیار ہوا۔ اہم مصروفیات کے باعث سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود تشریف نہ لے

Marfat.com

جا سکے اور اپنی جگہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر قافلہ متعین فرما دیا۔

ایک روایت کے مطابق سورۂ برأت نازل ہو چکی تھی۔ حضور نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ حج کے موقع پر جب جزیرۂ عرب کے اطراف واکناف سے حج کرنے کے لیے لوگ جمع ہو جائیں، وہاں سورۂ برأت کا اعلان کر دیں۔ وہ قافلہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی قیادت میں مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوا۔ بعد میں نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ جائیں اور عرفات کے میدان میں حضور ﷺ کی طرف سے سورۂ برأت کا اعلان کریں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ مکہ کی طرف رواں دواں تھے، اچانک حضور نبی کریم ﷺ کی اونٹنی قصویٰ کی آواز آپ کے کانوں میں گونجی۔ فوراً رک گئے اور بڑی بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ خیال ہوا کہ سرکار بنفس نفیس حج کے لیے تشریف لا رہے ہیں، لیکن ناقہ سوار پہنچا تو معلوم ہوا کہ اونٹنی پر سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سوار ہیں۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے پہلا سوال یہ کیا اَنْتَ اَمِیْرٌ اَوْ مَامُوْرٌ۔ کیا آپ قافلۂ حجاج کے امیر بن کر تشریف لائے ہیں یا مامور بن کر یعنی دوسرے عام حاجیوں کی طرح قافلہ میں شرکت کے لیے پہنچے ہیں۔ آپ نے جواب دیا: "بَلْ مَامُوْرٌ" کہ امیر قافلہ بدستور آپ ہی ہیں، میں مامور بن کر آیا ہوں۔ چنانچہ اس سفر میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی امامت میں نماز ادا کرتے رہے، آپ کی قیادت میں تمام ارکانِ حج ادا کرتے رہے۔ یوم ترویہ یعنی آٹھ ذی الحجہ سے ایک دن پہلے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بحیثیت امیر الحج تمام لوگوں کو جمع کیا، خطبہ ارشاد فرمایا اور اس میں حج کے اسلامی طریقہ سے انہیں روشناس کیا(1)۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فقط اس مقصد کے لیے بھیجے گئے تھے کہ کفار و مشرکین کے ساتھ جو معاہدہ ہوا تھا اس کے کالعدم ہونے کا اعلان کریں اور لوگوں کو یہ بتائیں کہ اس سال کے بعد کسی کافر کو بیت اللہ شریف کا طواف کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ عہد جاہلیت کے رواج کے مطابق کوئی شخص ننگا ہو کر طواف نہ کر سکے گا۔ اعتراض تو تب درست ہوتا اگر حضور سرور عالم ﷺ نے حضرت

1۔ البدایہ والنہایہ، جلد 5، صفحہ 37-36، تفسیر کبیر، جلد 8، صفحہ 27-226

Marfat.com

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو قافلۂ حجاج کی امارت سے معزول کر دیا ہوتا اور ان کے بجائے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ مقرر کیے جاتے۔ جب ایسا نہیں ہوا اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بدستور امیر الحج کے فرائض انجام دیتے رہے تو پھر محل اعتراض کیا ہے؟ رہی یہ بات کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورۂ برأت کے اعلان کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کیوں بھیجا؟ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ سورت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی روانگی کے بعد نازل ہوئی۔ تفسیر بیضاوی، مدارک، نیشاپوری، جذب القلوب اور دیگر مستند کتب میں اسی روایت کو ترجیح دی گئی ہے اور علمائے حدیث کے نزدیک بھی یہی روایت قابل ترجیح ہے، لیکن دوسری روایت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سورت پہلے نازل ہو چکی تھی اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اس کے اعلان کا بھی حکم دیا تھا۔ اس صورت میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو بھیجنے کی وجہ یہ ہے کہ عرب میں یہ دستور تھا کہ جب معاہدہ کو کالعدم قرار دینا مقصود ہوتا تو اس کا اعلان معاہدہ کرنے والا خود کرتا یا اس کا کوئی قریبی رشتہ دار، کیونکہ سورۂ برأت کا اعلان عرب کے غیر مسلم باشندوں کے سامنے کیا جانا تھا جو اسلامی قواعد وضوابط سے ناواقف تھے، اس لیے ان کے مروجہ طریقہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمایا تاکہ وہ کفار اور مشرکین کے مجمع میں سابقہ معاہدوں کے کالعدم ہونے کا اعلان فرما دیں۔(1)

چھٹا اعتراض

صحابہ کرام خصوصاً خلفائے راشدین کے بے رحم نقاد بڑی سنگدلانہ جسارت سے یہ پروپیگنڈہ کرتے ہوئے نہیں تھکتے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نمازِ جنازہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ شامل نہیں ہوئے۔ یہ حصولِ اقتدار کی جنگ میں یوں مصروف ہو گئے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تجہیز و تکفین کے فرائض کی ادائیگی کا انہیں خیال نہ رہا۔

کہنے کو انسان جو جی چاہے کہتا رہے اور لکھنے کو جو جی میں آئے لکھتا رہے۔ آزادی کا زمانہ ہے، کوئی کسی سے یہ پوچھنے کا حق نہیں رکھتا کہ میاں حق وصداقت کا منہ کیوں چڑا رہے

1۔ البدایۃ والنہایۃ، جلد 5، صفحہ 37، تفسیر کبیر، جلد 8، صفحہ 227

Marfat.com

ہو؟ اس سعی لاحاصل سے باز آ جاؤ، لیکن کسی کے کہنے یا کسی کے لکھنے سے حقیقت تو نہیں بدل جایا کرتی۔ تاریخ کے ان مٹ واقعات تو مسخ نہیں کیے جا سکتے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ سرورِ کائنات کی نمازِ جنازہ اس طرح نہیں پڑھی گئی جس طرح عام لوگوں کی پڑھی جاتی ہے کہ لوگ صفیں باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ امام آگے بڑھتا ہے، بلند آواز سے متعدد بار تکبیریں کہتا ہے، سلام پھیرتا ہے اور اس طرح نمازِ جنازہ اختتام پذیر ہو جاتی ہے۔ بلکہ اہل سنت اور اہل تشیع سب متفق ہیں کہ حضور ﷺ کی نمازِ جنازہ ایک مخصوص طریقہ سے پڑھی گئی۔ حضور ﷺ کو غسل دینے کے بعد کفن پہنایا گیا اور لحد مبارک کے کنارے پر چارپائی رکھ دی گئی۔ دس دس آدمی اندر داخل ہوتے۔ صف باندھ کر کھڑے ہوتے جاتے۔ پہلے حضور پر درود و سلام بھیجتے، پھر حضور ﷺ کی رسالت کی گواہی دیتے اور باہر نکل آتے۔ یہ سلسلہ سوموار کی سہ پہر سے شروع ہوا، بقیہ دن آئندہ رات اور منگل کا دن اسی طرح لوگ گروہ در گروہ اپنے آقا کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور ہدیہ صلوٰۃ و سلام پیش کرتے رہے۔ پہلے حضور ﷺ کے خاندان نے یہ شرف حاصل کیا، پھر مہاجرین و انصار صف در صف حاضر ہوتے رہے۔ جب سارے مرد نمازِ جنازہ پڑھ چکے، پھر عورتوں کی باری آئی۔ ان کے بچوں نے یہ شرف حاصل کیا یہاں تک کہ کوئی غلام اور لونڈی بھی ایسی نہ رہی جس نے حاضری نہ دی ہو اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق تو صراحتاً مذکور ہے کہ آپ جب حجرہ شریفہ میں داخل ہوئے تو ان کے ہمراہ مہاجر اور انصار بھی تھے اور انہوں نے عرض کی:

اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَ رَحْمَۃُ اللّٰہِ وَ بَرَکَاتُہٗ۔ (1)

نمازِ جنازہ کی یہ کیفیت کتب اہل سنت میں مذکور ہے۔ اب شیعہ حضرات کی معتبر کتب کے حوالے ملاحظہ فرمائیے! تاکہ یہ غلط فہمی آپ کے ذہن سے نکل جائے۔

اصول کافی جو ان حضرات کی حدیث کی معتبر ترین کتاب ہے۔ اس میں حضرت امام محمد

1۔ الطبقات الکبریٰ لابن سعد، جلد 2، صفحہ 90-89-288، دار صادر بیروت

Marfat.com

باقر سے نقل کرتے ہیں:

عَنْ اَبِیْ مَرْیَمَ الْاَنْصَارِیِّ عَنْ اَبِیْ جَعْفَرٍ عَلَیْهِ السَّلَامُ قَالَ قُلْتُ لَهٗ کَیْفَ کَانَتِ الصَّلٰوةُ عَلَی النَّبِیِّ صلی اللہ تعالٰی علیه وآله وسلم؟ قَالَ لَمَّا غَسَلَهٗ اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَیْهِ السَّلَامُ وَ کَفَّنَهٗ، سَجَّاهُ ثُمَّ اَدْخَلَ عَلَیْهِ عَشَرَةً فَدَارُوْا حَوْلَهٗ۔ ثُمَّ وَقَفَ اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ فِیْ وَسْطِهِمْ فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِکَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا فَیَقُوْلُ الْقَوْمُ کَمَا یَقُوْلُ حَتّٰی صَلّٰی عَلَیْهِ اَهْلُ الْمَدِیْنَةِ وَ اَهْلُ الْعَوَالِیْ۔ (1)

ابومریم انصاری نے امام محمد باقر سے پوچھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نمازِ جنازہ کی کیفیت بتائیے۔ آپ نے فرمایا: جب امیر المومنین نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غسل دیا اور کفن پہنایا تو اوپر چادر ڈال دی، پھر حجرہ میں دس آدمی داخل ہو گئے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اردگرد دائرہ بنا کر کھڑے ہو گئے اور یہ آیت تلاوت کی۔ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِکَتَهٗ (الآیۃ) یہ لوگ آپ کی زبان سے جو نکلتا اس کو دہراتے رہے یہاں تک کہ تمام اہل مدینہ اور اردگرد کی بستیوں میں رہنے والوں نے نمازِ جنازہ ادا کی۔

اس کتاب کی دوسری حدیث، جس کے راوی امام جعفر صادق ہیں، اس میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد منقول ہے:

یَا اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَآله وَسَلَّمَ اِمَامٌ حَیًّا وَّ مَیِّتًا، وَّ قَالَ اِنِّیْ اُدْفَنُ فِی الْبُقْعَةِ الَّتِیْ اُقْبَضُ فِیْهَا، ثُمَّ قَامَ عَلَی الْبَابِ فَصَلّٰی عَلَیْهِ، ثُمَّ اَمَرَ النَّاسَ عَشَرَةً عَشَرَةً یُصَلُّوْنَ عَلَیْهِ ثُمَّ یَخْرُجُوْنَ۔ (2)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی زندگی میں بھی اور وفات کے بعد بھی سب کے امام ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مجھے اس جگہ دفن کیا جائے گا جہاں میری روح قبض ہو گی، پھر علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ حجرہ کے دروازہ پر کھڑے ہوئے، نمازِ

1۔ اصول کافی، کتاب الحجہ، جلد 2، صفحہ 62-461، مکتبہ اسلامیہ تہران

2۔ اصول کافی، کتاب الحجہ، جلد 2، صفحہ 463، مکتبہ اسلامیہ تہران

Marfat.com

جنازہ پڑھی، پھر لوگوں کو حکم دیا کہ دس دس داخل ہو کر نمازِ جنازہ پڑھتے رہیں اور نکلتے رہیں۔

اسی کتاب میں ایک اور حدیث اسی جگہ پر مذکور ہے:

عَنْ اَبِیْ جَعْفَرٍ عَلَیْهِ السَّلَامُ قَالَ: لَمَّا قُبِضَ النَّبِیُّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم صَلَّتْ عَلَیْهِ الْمَلَائِکَةُ وَالْمُهَاجِرُوْنَ وَالْاَنْصَارُ فَوْجًا فَوْجًا۔ (1)

یعنی امام محمد باقر فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے وصال کے بعد پہلے فرشتوں نے پھر تمام مہاجرین اور تمام انصار نے فوج در فوج، گروہ در گروہ حجرہ شریفہ میں داخل ہو کر نمازِ جنازہ ادا کی۔

اسی کتاب کے مترجم آیۃ اللہ الحاج الشیخ محمد باقر الکمرئی فارسی ترجمہ کے بعد لکھتے ہیں کہ طبرسی نے اپنی مشہور کتاب الاحتجاج میں لکھا ہے:

سپس دہ دہ از مہاجرین و انصار را وارد کرد، بر او نماز خواندند و رفتند، تا ہمہ بر او نماز خواندند۔(2)

یعنی پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اہل بیت کے ساتھ نمازِ جنازہ ادا کی اس کے بعد دس دس مہاجرین اور انصار کو اندر داخل کرتے اور وہ نمازِ جنازہ ادا کرتے اور چلے جاتے یہاں تک کہ تمام مہاجرین اور انصار نے نمازِ جنازہ کا شرف حاصل کیا۔

جب دو روز تک اور بعض روایات کے مطابق تین روز تک رات دن نمازِ جنازہ کا سلسلہ جاری رہا اور ان کی اپنی تصریحات کے مطابق مہاجرین اور انصار میں سے کوئی بھی ایسا نہ رہا جس نے نمازِ جنازہ کی سعادت حاصل نہ کی ہو تو پھر یہ پروپیگنڈا کرنا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے نمازِ جنازہ نہیں پڑھی، عقل وانصاف کے سراسر خلاف ہے۔

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔

1۔ اصول کافی، کتاب الحجۃ، جلد 2، صفحہ 463، مکتبہ اسلامیہ تہران

2۔ اصول کافی مع شرح وترجمہ، کتاب الحجۃ، جلد 2، صفحہ 462

Marfat.com

حضرت سیدنا
علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ
اور خلفائے راشدین

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حضور رحمت عالم ﷺ کی بعثت کے وقت دنیا میں جو متمدن حکومتیں قائم تھیں وہاں ملوکیت (شاہی) کا نظام رائج تھا۔ ہر بادشاہ کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا یا اس کا قریبی وارث مسند حکومت پر فائز ہوتا اور ساری رعایا بے چون و چرا اس کو اپنا حاکم اعلیٰ تسلیم کر لیتی۔ شاہی خاندانوں نے اپنی حکومت کی جڑوں کو مستحکم اور گہرا کرنے کے لیے مذہب کو بھی بڑی مہارت سے استعمال کیا۔ انہوں نے اپنی حفاظت کے لیے مذہبی تقدس کا ہالہ اپنے ارد گرد قائم رکھا تا کہ رعایا میں سے کوئی شخص بھی بادشاہِ وقت پر اعتراض نہ کر سکے اور نہ اس کو ہٹانے کا تصور اس کے دل و دماغ میں رونما ہو۔ چنانچہ عوام الناس اپنے بادشاہ کی بے چون و چرا اطاعت مذہبی فریضہ یقین کرتے تھے۔ بادشاہ خواہ کتنا ظالم، نااہل اور بدکردار ہو، اس کے ہٹانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح بے بس رعایا ظالم حکمرانوں کے جبر و استبداد کو برداشت کرتی۔ یہ ان کی نالائقیوں کی سزا بھگتتی اور ان کی حماقتوں کے باعث طرح طرح کے مصائب کا شکار ہوتی رہتی۔

ایران میں آلِ ساسان کی حکومت قائم تھی اور نسلاً بعد نسل یہی خاندان ایران کا حکمران چلا آرہا تھا اور ایرانی یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ آلِ ساسان کو یہ بادشاہی اور حکمرانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی ہے اور کسی کو ان پر اعتراض کرنے کا حق نہیں۔ کوئی دوسرا ایرانی خواہ وہ کتنا قابل، مدبر اور منصف مزاج ہو، اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ آلِ ساسان کے کسی نالائق جابر اور عاقبت نااندیش حکمران کو ہٹا کر زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لے۔ یہ چکر کئی ہزار سال سے چل رہا تھا۔ مغرب میں یہی حالت بزنطینی بادشاہوں کی تھی جو قیصر کے لقب سے ملقب تھے، انہوں نے بھی اپنی رعایا کے دلوں میں یہ عقیدہ جما دیا تھا کہ ان کو حکومت کرنے کا حق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا ہے۔ جو اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے گا وہ صرف قیصر وقت کا ہی باغی نہیں ہوگا بلکہ رب العالمین کا بھی نافرمان ثابت ہوگا۔ اہل چین اپنے

Marfat.com

شہنشاہ کو آسمان کا فرزند کہتے تھے اور ان کا یہ اعتقاد تھا کہ آسمان اور زمین میاں بیوی ہیں اور شہنشاہ ختاان کا پہلوٹی کا لڑکا ہے اور وہ سارے چینیوں کا باپ بھی ہے اور ماں بھی۔

یہ حال تو اس وقت کی متمدن اور ترقی یافتہ اقوام کا تھا اور جو قومیں وحشت و بربریت کی زندگی بسر کر رہی تھیں ان کا تو ذکر ہی بے سود ہے۔

جب دنیا شاہی استبداد کے شکنجہ میں بری طرح کسی ہوئی تھی۔ مایوسی اور محرومی کے اندھیرے ہر طرف چھائے ہوئے تھے۔ اس وقت سارے عالم کا نجات دہندہ، سفینۂ انسانیت کا ناخدا، محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان تمام زنجیروں کو کاٹ کے رکھ دیا جن میں انسانیت بری طرح جکڑی ہوئی تھی، ان تمام بندھنوں کو توڑ ڈالا جن میں انسان صدیوں سے مقید تھا۔

اسلام نے زندگی کے دیگر شعبوں میں جہاں دوررس تبدیلیاں کیں وہاں نظامِ حکومت میں بھی انقلاب برپا کر دیا۔ ملوکیت کی جگہ خلافت اور وراثت کی جگہ شورائی نظام رائج کر کے دنیا کو ایک انوکھے اور عظیم البرکت اصول سے روشناس کیا۔ قرآنِ کریم میں دستورِ اسلامی کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۠ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۸﴾ (الشوریٰ)

"اور اہل ایمان وہ ہیں جنہوں نے اپنے رب کا حکم مانا اور نماز قائم رکھی اور ان کے معاملات باہمی مشورہ سے طے پاتے ہیں اور جو ہم نے انہیں رزق دیا ہے اس سے خرچ کرتے ہیں"۔

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ اپنے رسولِ معصوم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتا ہے:

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (آل عمران: ۱۵۹)

"اے محبوب! آپ ان سے درگزر فرمائیں، ان کے لیے بخشش طلب کیجئے اور اہم معاملات میں ان سے مشورہ کیجئے"۔

اسی امر خداوندی کے پیش نظر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے کسی صحابی کو یا اپنے کسی رشتہ دار کو خلیفہ مقرر فرمایا اور نہ ہی خلافت کو وراثت قرار دیا، بلکہ خلیفہ کے تقرر کو جمہور مسلمانوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا تاکہ وہ باہمی مشورہ سے جن کو چاہیں اپنا سربراہِ مملکت منتخب کریں۔

اس مسئلہ میں اسلام کو ماننے والے تقریباً تمام فرقے متفق ہیں۔ البتہ شیعہ کا مذہب یہ ہے کہ وہ خلافت کو موروثی تصور کرتے ہیں اور حضور کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خلیفہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کو یقین کرتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا کے بیٹے اور عزیز داماد ہیں اور آپ کے بعد آپ کی اولاد میں خلافت اور امامت کو منحصر سمجھتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کریم، سنت نبوی اور خود حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے تعامل سے کس نظریہ کی تصدیق ہوتی ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو نیاز مند شاگرد اپنی شبانہ روز محنت سے تیار کیے تھے وہ اپنے محبوب مرشد کی محبت اور عشق میں اتنے سرشار اور وارفتہ تھے کہ وہ اپنے آقا کے ادنیٰ اشارے پر اپنا سب کچھ قربان کر دینا سب سے بڑی سعادت سمجھتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی تعمیل اور پیروی ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ ان کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کسی ارشاد سے روگردانی ممکن نہ تھی۔ تاریخ اسلام کا ہر ورق اس حقیقت پر شاہد ہے۔ چنانچہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وصال کے بعد جب انصار نے خلافت کا دعویٰ کیا اور جب انہیں یہ بتایا گیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

اَلْاَئِمَّۃُ مِنَ الْقُرَیْشِ۔ (1)

(خلیفہ قریش میں سے ہونا چاہیے۔)

تو انصار کسی تامل کے بغیر اپنے مطالبہ سے دستبردار ہو گئے۔ حالانکہ مدینہ طیبہ میں انصار کی کثرت تھی، یہ ان کا آبائی وطن تھا، مہاجرین کی تعداد ان سے کم تھی اور قریش کی تعداد نسبتاً اور بھی قلیل تھی اور یہ یہاں کے اصلی باشندے بھی نہ تھے، لیکن جب انصار نے

1۔ فتح الباری، جلد 14، صفحہ 167، مکتبۃ الکلیات الازہریہ مصر

Marfat.com

اپنے نبی مکرم کا یہ فرمان سنا تو اسی وقت اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ اگر حضور ﷺ نے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو اپنا خلیفہ مقرر فرمایا ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہ کرتے یا انہیں چھوڑ کر کسی اور کو خلیفہ بنانا منظور کرتے۔ حضور ﷺ کی اطاعت میں مہاجرین بھی انصار سے کسی طرح پیچھے نہ تھے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ دعویٰ فرمایا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مجھے اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے اور نہ یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے میری خلافت منصوص ہے، بلکہ جب اکابر مہاجرین و انصار نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تو آپ بھی ان بیعت کرنے والوں میں شریک ہو گئے۔ کتب شیعہ سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ آپ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت فرمائی۔ شیعہ مصنفین نے بعض مقامات پر آپ کی بیعت کے ساتھ مُکْرَھًا (1) کا لفظ بڑھا دیا ہے یعنی آپ نے بیعت کی، مجبوروناچار ہو کر۔ حضرت علی المرتضیٰ کی شخصیت کے متعلق یہ کہنا زیادتی اور پرلے درجے کی گستاخی ہے کہ آپ نے مجبور ہو کر بیعت کی۔ آپ سے کوئی شخص آپ کی منشا کے خلاف بجبر و اکراہ بیعت نہیں لے سکتا۔ اگر حضور کریم ﷺ نے آپ کو اپنا خلیفہ متعین کیا ہوتا تو آپ کسی قیمت پر بھی منصب خلافت سے دست کش نہ ہوتے۔ دین کے معاملے میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی جرأت اور بے باکی ضرب المثل ہے۔ وہ سچی بات کہنے سے گریز نہ کرتے تھے۔ کسی کی شوکت اور دبدبہ انہیں حق سے انحراف پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔

''کشف الغمہ فی معرفۃ الائمہ'' جو شیعہ کی معتبر کتاب ہے، اس کا ایک ایمان افروز واقعہ سماعت فرمائیے:

ایک روز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں خطبہ دیتے ہوئے سامعین سے پوچھا:

لَوْ صَرَّفْنَاکُمْ عَمَّا تَعْرِفُوْنَ اِلٰی مَا تُنْکِرُوْنَ مَا کُنْتُمْ صَانِعِیْنَ۔ (2)

1۔ کتاب الروضۃ، اصول کافی، جلد 1، صفحہ 07-105-97

2۔ بال جبریل، صفحہ 62 (کلیات اقبال اردو صفحہ 386)

یعنی بالفرض اگر ہم تمہیں دین کے ان اصولوں سے روگردانی کرنے پر مجبور کردیں، جنہیں تم جانتے ہو اور ایسی باتوں کا حکم دیں جنہیں تم نہیں جانتے تو تمہارا ردِ عمل کیا ہوگا؟

سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اٹھے اور ارشاد فرمایا:

اِذًا کُنَّا تَسْتَتِیْبُکَ فَاِنْ تُبْتَ قَبِلْنَاکَ۔

یعنی پہلے ہم آپ کو اس غلط روی سے توبہ کرنے کی دعوت دیں گے۔ اگر آپ توبہ کرلیں گے تو ہم اس کو قبول کرلیں گے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر میں توبہ نہ کروں؟ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

اِذًا نَضْرِبُ الَّذِیْ فِیْہِ عَیْنَاکَ۔

یعنی اس صورت میں ہم آپ کا وہ سر قلم کردیں گے جس میں آپ کی دونوں آنکھیں ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسرت سے سرشار ہو کر فرمایا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ جَعَلَ فِیْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ مَنْ اِذَا اَعْوَجَجْنَا اَقَامَ اودنا۔

یعنی اس خدا کریم کا ہزار ہزار شکر ہے جس نے اس امت میں ایسے لوگ پیدا کیے ہیں کہ اگر ہم میں کجی رونما ہو جائے تو وہ ہماری کجی کو درست کرسکتے ہیں۔

(کشف الغمہ جلد اول ص ۱۵۷ مطبوعہ ایران)

یہ کوئی معمولی سا واقعہ نہیں ہے جسے بے توجہی سے نظر انداز کردیا جائے، بلکہ اس سے اس انقلابِ عظیم کا پتہ چلتا ہے جو رہبر انسانیت رحمت عالم ﷺ نے اپنی امت کے دلوں میں برپا کیا تھا۔ حضور ﷺ کے فیض تربیت سے امت مسلمہ سچی بات کہنے کی خوگر ہوگئی تھی۔ حکومت کی ہمنوائی اور حاکم کی خوشامد ان کے تربیت یافتہ مزاج سے کوئی مناسبت نہ رکھتی تھی۔ یہ اس دور کا واقعہ ہے جب فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی فوجیں مشرق و مغرب میں اپنی فتح و کامرانی کے پرچم لہرا رہی تھیں۔ ایران کی عظمت اور روم کی شوکت غلامانِ مصطفیٰ ﷺ کی خدمت میں سلامِ عقیدت پیش کرنے میں فخر و عزت محسوس کرتی تھی۔

Marfat.com

جب کہ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا آفتابِ اقبال نصف النہار پر جگمگا رہا تھا۔ قیصر و کسریٰ آپ کا نام سن کر کانپ جاتے تھے۔ اس وقت آپ نے لوگوں سے یہ عجیب و غریب سوال پوچھا تھا، لیکن عزتِ نفس، خودداری اور حق گوئی و حق پرستی کا جو جذبہ اسلام نے مسلمانوں میں پھونک دیا تھا وہ سطوتِ فاروق سے مرعوب نہیں ہوتا، بلکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ بڑی صاف گوئی سے ساری امت کی ترجمانی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہم پہلے آپ کو اس غلط روش سے باز آنے کی دعوت دیں گے اور اگر آپ نے ہماری اس دعوت کو قبول نہ کیا تو پھر ہم آپ کو کسی قیمت پر اجازت دینے کے لیے تیار نہ ہوں گے کہ آپ سنت نبویہ کو بدل دیں۔ ہم اپنی تلواروں کو بے نیام کریں گے اور آپ کا سر قلم کر کے رکھ دیں گے۔ یہ حال تو رعایا کا ہے، جن کے جذبات و احساسات اور جذبات کی ترجمانی حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمائی۔ اب اس جواب کا اثر خلیفۂ وقت پر کیا ہوتا ہے؟ یہ بھی قابل غور ہے۔ آپ اس تلخ جواب سے برہم نہیں ہوئے۔ آپ اسے منصب خلافت کی توہین خیال نہیں کرتے، بلکہ ایمان افروز جواب سن کر آپ خوشی سے پھولے نہیں سماتے اور آپ کی زبان سے بے ساختہ نکلتا ہے کہ بار الہا! ساری حمد و ثناء کا سزاوار تو ہی ہے جس نے اس خیر الامم میں ایسے حق گو اور حق پرست نفوس پیدا فرمائے ہیں جن کی جرأت کا یہ عالم ہے کہ اگر فرمانروائے مملکت بھی تیرے دین کے حکم سے روگردانی کرے اور لوگوں کو غلط راہ پر چلانے کی جسارت کرے تو وہ اسے بزورِ شمشیر روک سکتے ہیں۔ جب ایک فروعی مسئلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ ترکِ سنت پر خاموش نہیں ہوتے تو ہم یہ کیسے مان سکتے ہیں کہ خلافت کا اصول ان کے سامنے پامال ہوتا رہا اور وہ خاموشی اختیار کیے رہے؟

حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی ایک خصوصیت بیان فرمائی، بلکہ پیشین گوئی کی جو قطعاً غلط نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ سچے نبی کی پیشین گوئی ہے۔ حضور نے فرمایا: جب میری سنت کو ترک کیا جائے گا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی ذوالفقار کو بے نیام کر لیں گے۔ اس حیات آفرین واقعہ کو ذرا تفصیل سے سماعت فرمائیں۔

حضرت امام باقر اپنے پدرِ بزرگوار سے روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نعل مبارک کا تسمہ ٹوٹ گیا۔ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اسے مرمت کرنے کا حکم دیا اور ایک جوتا پہنے ہوئے تھوڑا سا چلے اور اپنے صحابہ کی طرف روئے انور کر کے فرمایا:

اِنَّ مِنۡکُمۡ مَنۡ یُقَاتَلُ عَلَی التَّاوِیۡلِ کَمَا یُقَاتَلُ مَعِیۡ عَلَی التَّنۡزِیۡلِ۔

یعنی ہم میں سے ایک ایسا شخص ہے جس کے ساتھ قرآن کی تاویل پر جنگ کی جائے گی، جس طرح میرے ساتھ قرآن کے نزول پر جنگ کی جا رہی ہے۔

فَقَالَ اَبُوۡبَکۡرٍ اَنَا ذَاکَ یَا رَسُوۡلَ اللّٰہِ؟

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! کیا وہ شخص میں ہوں؟

فَقَالَ لَا۔

فرمایا: نہیں۔

صحابہ خاموش ہو گئے اور ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

فَقَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ: لٰکِنَّہٗ خَاصِفُ النَّعۡلِ وَ اَوۡمٰی اِلٰی عَلِیٍّ فَاِنَّہٗ یُقَاتِلُ عَلَی التَّاوِیۡلِ اِذَا تُرِکَتۡ سُنَّتِیۡ وَ نُبِذَتۡ وَ حُرِّفَ کِتَابُ اللّٰہِ وَ تَکَلَّمَ فِی الدِّیۡنِ مَنۡ لَیۡسَ لَہٗ ذٰلِکَ فَیُقَاتِلُھُمۡ عَلٰی اِحۡیَآءِ دِیۡنِ اللّٰہِ تعالٰی۔

''حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا بلکہ وہ شخص جوتا مرمت کرنے والا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کیا۔ (پھر فرمایا) کہ یہ تاویل پر جنگ کریں گے جب میری سنت کو ترک کر دیا جائے گا۔ جب کتابِ الٰہی کی غلط تفسیر کی جائے، جب دینی معاملات میں ایسے لوگ لب کشائی کرنے لگیں جنہیں یہ حق نہیں پہنچتا۔ اس وقت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ، اللہ تعالیٰ کے دین کو زندہ کرنے کے لیے ان سے جہاد کریں گے''۔

(کشف الغمہ جلد اول ص ۲۸۱ مطبوعہ ایران)

اس حدیث سے بھی واضح ہو گیا کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی غیرتِ ایمانی ہرگز یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ کسی سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نظر انداز کیا جائے یا دینی معاملات میں نااہل

Marfat.com

لوگ لب کشائی کرنے لگیں۔ایسی صورت میں آپ علم جہاد بلند کر دیں گے اور جب دین کی بنیاد ہی منہدم کی جارہی ہو تو شیر خدا کس طرح خاموش رہ سکتے ہیں؟ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس پیشین گوئی سے یہ معلوم ہو گیا کہ خلفائے ثلاثہ کے ایام میں کوئی سنت ترک نہیں کی گئی۔کسی نے اپنی رائے کو احکامِ خداوندی میں دخیل نہیں بنایا۔اسی لیے سیدنا علی رضی اللہ عنہ ان حضرات کے ساتھ صلح و آشتی اور محبت و پیار سے برتاؤ کرتے رہے۔بصورتِ دیگر آپ ہرگز دین کی پامالی کو برداشت نہ کرتے اور دنیا کی کوئی طاقت آپ کو اپنی ذوالفقار بے نیام کرنے سے باز نہ رکھ سکتی۔

حیرت کا مقام ہے کہ ایک طرف تو ہم حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی شجاعت و بہادری کے واقعات بیان کرتے ہیں۔آپ کی حق گوئی اور بے باکی کی توصیف میں رطب اللسان رہتے ہیں۔آپ کی جسمانی قوت اور ایمانی طاقت کا ذکر کر کے فلک شگاف نعرے لگاتے ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ ہم آپ کو اس حیثیت سے پیش کرنے کی بھی گستاخی کرتے ہیں کہ اسلام کا چمن، جسے مصطفیٰ کریم ﷺ نے عمر بھر کی محنت، جان سوزی اور چٹانوں کو پگھلا دینے والی مصیبتوں کو برداشت کر کے پروان چڑھایا اور اپنے پیارے چچا حضرت حمزہ، اپنے عم زاد بھائی حضرت جعفر طیار اور قریبی رشتہ دار اور مخلص دوستوں کے خون سے سیراب کر کے اس کو بہار آشنا کیا، اس باغ کی بقول شیعہ ایک ایک کلی مسلی جاتی رہی، ایک ایک کونپل نوچی جاتی رہی، ایک ایک اصول پامال ہوتا رہا، حقوق غصب ہوتے رہے، لوگ اپنے گھروں میں بے نکاحی عورتیں ڈالے رہے، نماز وضو کے طریقے بھی بدل دیے گئے، یہ سب دھاندلی حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں اور آپ کے سامنے ہوتی رہی اور آپ معاذ اللہ تقیہ کیے رہے اور خاموش رہے۔

کتاب الروضہ اصول کافی جلد اول کی ایک روایت دل پر پتھر رکھ کر آپ بھی سن لیں تاکہ آپ کو پتہ چل جائے کہ شیعہ حضرات حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ شیر خدا کی سیرت کا کیا خاکہ پیش کرتے ہیں:

ثم اَقْبَلَ بِوَجْهِهٖ وَ حَوْلَهٗ نَاسٌ مِنْ اَهْلِ بَيْتِهٖ وَ خَاصَّتِهٖ وَ شِيْعَتِهٖ فَقَالَ: قَدْ عَمِلَتِ الْوُلَاةُ قَبْلِیْ اَعْمَالًا خَالَفُوْا فِيْهَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مُتَعَمِّدِيْنَ لِخِلَافِهٖ، نَاقِضِيْنَ لِعَهْدِهٖ، مُغَيِّرِيْنَ لِسُنَّتِهٖ وَ لَوْ حَمَلْتُ النَّاسَ عَلٰى تَرْكِهَا لَتَفَرَّقَ عَنِّیْ جُنْدِیْ حَتّٰى اَبْقٰى وَحْدِیْ اَوْ قَلِيْلٌ مِنْ شِيْعَتِیْ۔

(کتاب الروضہ اصول کافی جلد اول مطبوعہ تہران ص ۹۵ تا ۱۰۷)

"پھر آپ ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے جو آپ کے اردگرد اہل بیت خواص اور شیعہ میں سے بیٹھے تھے اور کہا: مجھ سے پہلے جو والی گزرے ہیں انہوں نے ایسے ایسے کام کیے ہیں جس میں انہوں نے دانستہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خلاف ورزی کی ہے۔ آپ کے ساتھ کیے ہوئے وعدے کو توڑا ہے اور آپ کی سنت کو بدل ڈالا ہے۔ اگر میں لوگوں کو ان بدعتوں کے ترک کرنے پر مجبور کروں تو میرا لشکر مجھے چھوڑ کر منتشر ہو جائے گا۔ میں اکیلا یا تھوڑے سے شیعے باقی رہ جائیں گے"۔

اس کے بعد راوی نے جن چیزوں کا شمار حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ کی زبان سے کرایا ہے۔ ان کی فہرست بڑی طویل ہے۔ ان میں سے چند یہ ہیں کہ لوگوں نے اپنے پاس دوسروں کی عورتیں رکھی ہوئی ہیں۔ اگر میں ان کو ان کے اصلی خاوندوں کی طرف لوٹا دوں اور غسل اور وضو اس طرح کرنے کا حکم دوں جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا اور نماز کو صحیح اوقات میں ادا کرنے کا حکم دوں تو سارے لوگ مجھے چھوڑ دیں گے۔(1)

آپ ذرا غور فرمائیے! اس تضاد کو کون قبول کرے گا؟ ان انہونی داستانوں کو کون مانے گا؟ شیر خدا علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ کی سیرتِ طیبہ کو اس بھونڈے انداز میں پیش کرنا اور حضرت کی ذات ستودہ صفات کو یوں داغدار کرنا کسی دشمن دین و ایمان کے لیے تو ممکن ہو سکتا ہے، لیکن حضرت کی ذات سے عقیدت رکھنے والا، آپ کی محبت کا دم بھرنے والا اور آپ کی غلامی اور پیروی پر ناز کرنے والا اس لغویت کو قبول کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہو

1۔ الروضۃ من الکافی مع شرح و ترجمہ، جلد 2، صفحہ 179

Marfat.com

سکتا۔ اپنے متعلق تو ہم علامہ اقبال کا یہ شعر پڑھتے ہیں اور ہماری آنکھوں میں چمک پیدا ہوتی ہے اور سر فخر سے اکڑ جاتا ہے۔

آئین جواں مرداں، حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی (1)

لیکن فاتح خیبر، اللہ اور اس کے رسول کے شیر کے متعلق روباہی کی بیہودہ حکایتیں آپ کیسے برداشت کر سکتے ہیں؟ کیا دل آپ کو ملامت نہیں کرتا؟ کیا آپ کا ضمیر فریاد کناں احتجاج نہیں کرتا؟ کچھ تو غور کرو خدارا! کچھ تو غور کرو۔ فلک عظمت کے نیر اعظم کو گہنانے کی جو کوشش محبت کی آڑ میں کی جارہی ہے اگر ہم اس کے سامنے سینہ تان کر کھڑے نہیں ہو سکتے تو قیامت کے دن ساقی حوضِ کوثر کو کیا منہ دکھاؤ گے اور کس برتے پر شفاعت کی امید کرو گے؟ اس جملہ معترضہ کے بعد پھر ہم اصلی موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔ اسلام کے سیاسی نظام میں موروثیت کی کوئی گنجائش نہیں اور سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کا عمل اور آپ کے ارشادات اس کے لیے براہین قاطعہ ہیں۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد لوگوں نے آپ کے دست مبارک پر بیعت کی اور آپ کو اپنا خلیفہ مقرر کیا تو اس کے بعد آپ نے کسی کی مخالفت کی پرواہ نہیں کی۔ جس نے بھی علم بغاوت بلند کیا، اس کا مقابلہ کیا اور جس نے فتنہ وفساد کی آگ بھڑکانے کی کوشش کی تو آپ نے اس کو بجھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ جمل، نہروان اور صفین کی جنگوں میں لاکھوں بہادر جوانمرد دونوں طرف سے لقمۂ اجل بنے، لیکن آپ نے خلافت کے تقدس پر آنچ نہ آنے دی اور اس سے کنارہ کشی اختیار نہ کی۔ جب آپ کو عامۃ المسلمین نے خلیفہ منتخب کیا تو آپ نے کسی کی مخالفت کی پرواہ نہ کی۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو خلیفہ مقرر کیا ہوتا تو کسی مصلحت کے پیش نظر آپ خاموشی اختیار نہ کرتے اور بڑی سے بڑی مخالف قوت سے ٹکرا جاتے۔ آپ کے اس طریقہ کار سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ خم غدیر کے موقع پر

1۔ کشف الغمہ فی معرفۃ الائمۃ، جلد 1، صفحہ 157، مطبوعہ ایران

Marfat.com

حضور ﷺ کا یہ ارشاد مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ (1) آپ کی خلافت کا اعلان نہیں تھا، ورنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس سے ضرور استدلال کرتے جو آپ نے نہیں کیا۔ اس کے علاوہ کئی اور چیزیں ہمارے اس نظریہ کی تائید کرتی ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ تمام اہل اسلام کی طرح یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ خلافت کا معاملہ باہمی شوریٰ سے طے پاتا ہے۔ یہ موروثی نہیں۔

یہ کہنا بھی درست نہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اعوان و انصار دستیاب نہ تھے۔ اس لیے آپ نے خلافت کا اس وقت مطالبہ نہ کیا۔ کیونکہ ایک تو آپ کی شخصیت ان چیزوں کو خاطر میں لانے والی نہیں۔ وہ تنہا سارے باطل کے سامنے اور اس کی طاغوتی قوتوں کے سامنے سینہ سپر ہونے کی ہمت رکھتے تھے۔ دوسرا یہ قول واقعہ کے بھی خلاف ہے کہ آپ بے یار و مددگار تھے۔ آپ کی مدد کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

ناسخ التواریخ جزو اول ص ۳۰ میں مذکور ہے کہ ابوسفیان نے یہ دیکھا کہ لوگ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر متفق ہو گئے تو وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دولت کدہ پر حاضر ہوا اور کہنے لگا:

أُبْسُطْ يَدَكَ أُبَايِعْكَ. وَاللّٰهِ! إِنْ شِئْتَ لَأَمْلَئَنَّهَا عَلٰى أَبِي فَصِيلٍ يَعْنِي أَبَابَكْرٍ خَيْلًا وَ رِجَلًا. (2)

"یعنی آپ ہاتھ کھولیے تاکہ میں آپ کی بیعت کروں۔ اگر آپ چاہیں گے تو میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خلاف شہسواروں اور پیادہ لوگوں کا اتنا لشکر جرار جمع کر دوں گا کہ مدینہ میں تل دھرنے کو بھی جگہ نہ ملے گی"۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اگر چاہتے تو اس پیش کش سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ خلافت بھی حاصل ہو جاتی اور فرمانِ نبوی ﷺ کی بھی تعمیل ہو جاتی۔ لیکن شاہِ مرداں شیر

1۔ المستدرک، جلد 3، صفحہ 116، مسند امام احمد، جلد 1، صفحہ 84، دار صادر بیروت، جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 213

2۔ ناسخ التواریخ، کتاب تاریخ الخلفاء، جلد 1، صفحہ 31-30

Marfat.com

یز داں نے ابوسفیان کی اس پیش کش کو بڑی حقارت سے ٹھکرادیا اور فرمایا:

''اے ابوسفیان! کسی لالچ کے بغیر تو حرکت نہیں کرتا۔ اسلام کو نقصان پہنچانے کے علاوہ تجھے کچھ اور نہیں سوجھتا۔ میں ہرگز تمہاری ان باتوں سے دھوکا نہیں کھاؤں گا اور تیرے دامِ فریب میں نہیں پھنسوں گا''۔ (1)

پس ابوسفیان حسرت و یاس سے چند شعر پڑھتا ہوا آپ کے ہاں سے نامراد واپس لوٹا۔

دوسری روایت میں ہے کہ ابوسفیان پہلے حضرت عباس کے پاس آیا انہیں ہمراہ لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس بیعت کرنے کے لیے آیا۔ جب آپ نے اسے دندان شکن جواب دیا تو اسے از حد صدمہ ہوا تو اس نے حسرت آمیز اشعار پڑھے۔ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا:

اَیُّهَا النَّاسُ شُقُّوْا اَمْوَاجَ الْفِتَنِ بِسُفُنِ النجَاةِ۔ وَ عَرِّجُوْا عَنْ طَرِيْقِ الْمُنَافَرَةِ وَدَعُوْا تِيْجَانَ الْمَفَاخَرَةِ۔ اَفْلَحَ مَنْ نَهَضَ بِجَنَاحٍ اَوِاسْتَسْلَمَ فَرَاحَ۔ مَاءٌ آجِنٌ وَ لُقْمَةٌ يَغَصُّ بِهَا آكِلُهَا وَ مُجْتَنِىُ الثَّمْرَةِ لِغَيْرِ وَقْتِ كَالزَّارِعِ بِغَيْرِ اَرْضِهٖ۔ (ناسخ التواریخ جزو اول ص ۳۱)

(یعنی اے لوگو! فتنے کی موجوں کو نجات کی کشتیوں کے ذریعے عبور کرو۔ منافرت پھیلانے کا راستہ ترک کردو۔ تکبر کے تاجوں کو سروں سے اتاردو۔ جو بازو کے سہارے اٹھتا ہے وہ کامیاب ہوتا ہے یا جو سلامتی کو اختیار کرتا ہے وہ راحت پاتا ہے۔ یہ ناگوار پانی ہے یا ایسا لقمہ ہے جو کھانے والے کے گلے میں پھنس جاتا ہے۔ پھول پکنے کے وقت سے پہلے اسے چننے والا ایسا ہے جیسا کسی غیر کی زمین میں فصل کاشت کرنے والا ہوتا ہے)۔

اسی خطبہ میں آپ نے فرمایا: میں موت سے ڈر کر خلافت سے دست کش نہیں ہوا ہوں۔ مجھے موت سے اتنا انس ہے جتنا شیر خوار بچے کو اپنی ماں کی چھاتی سے۔

ان اقتباسات سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ آپ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

1۔ ناسخ التواریخ، کتاب تاریخ الخلفاء، جلد 1، صفحہ 31

سے بیعت مجبوری کی حالت میں نہیں کی تھی، بلکہ اپنی خوشی اور مرضی سے بیعت کی۔ اس کی تصدیق کے لیے ناسخ التواریخ کا ایک اور حوالہ ملاحظہ فرمائیے:

سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جب لوگوں نے خلیفہ بنایا اور قبائل میں ارتداد کی وباء پھیل گئی تو میں نے سمجھا میرا اس وقت بیعت نہ کرنا اسلام کے لیے خطرناک ہے۔

فَمَشَیْتُ عِنْدَ ذٰلِکَ اِلٰی اَبِیْ بَکْرٍ فَبَایَعْتُہٗ وَ نَھَضْتُ فِی تِلْکَ الْاَحْدَاثِ حَتّٰی زَاغَ الْبَاطِلُ وَ زَھَقَ۔ وَ کَانَتْ کَلِمَۃُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا وَ لَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ

(یعنی میں چل کر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور بیعت کی۔ اس کے بعد جو خطرناک حادثات اسلام کو پیش آئے۔ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے میں کھڑا ہو گیا یہاں تک کہ باطل مٹ گیا اور اللہ تعالیٰ کے دین کا بول بالا ہو گیا۔ اگرچہ کافر اسے ناپسند کرتے تھے)۔ (ناسخ التواریخ جزو سوم جلد سوم ص ۳۲۲)

آپ کے اس ارشاد سے بالکل ثابت ہو گیا کہ آپ نے اپنی خوشی سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کی اور اس پر آشوب دور میں آپ کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہو کر ہجومِ بلا کا مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ باطل کو شکست ہوئی اور حق کو فتح مبین۔ آپ کے اس ارشاد سے ان لوگوں کی یہ غلط فہمی بھی دور ہو جانی چاہیے جو یہ کہتے ہیں کہ خلفائے ثلاثہ کے زمانے میں آپ نے امورِ مملکت میں کوئی حصہ نہیں لیا، بلکہ الگ تھلگ رہے۔ آپ کے زمانۂ خلافت میں جب بعض لوگ آپ کی خلافت پر معترض ہوئے تو آپ نے اپنی خلافت کے برحق ہونے کے لیے جو دلیل پیش کی وہ صاحب نہج البلاغۃ کے الفاظ میں یوں درج ہے:

اِنَّہٗ بَایَعَنِی الْقَوْمُ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا اَبَابَکْرٍ وَ عُمَرَ وَ عُثْمَانَ عَلٰی مَا بَایَعُوْ ھُمْ عَلَیْہِ۔ فَلَمْ یَکُنْ لِلشَّاھِدِ اَنْ یَّخْتَارَ وَ لَا لِلْغَائِبِ اَنْ یَرُدَّ وَ اِنَّمَا الشُّوْرٰی لِلْمُھَاجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ فَاِنِ اجْتَمَعُوْا عَلٰی رَجُلٍ وَ سَمَّوْہُ اِمَامًا کَانَ ذَالِکَ لِلّٰہِ رِضًا۔(1)

1۔ نہج البلاغۃ، مترجم، جلد 5، صفحہ 831، مطبوعہ تہران

Marfat.com

(یعنی میرے ساتھ اس قوم نے بیعت کی ہے جنہوں نے ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے ساتھ بیعت کی تھی اور انہیں شرائط کے ساتھ جن شرائط کے ساتھ انہوں نے ان کی بیعت کی تھی۔ اس کے بعد جو وہاں موجود تھے انہیں کوئی اختیار نہیں اور جو وہاں موجود نہ تھے وہ اس بیعت کو رد نہیں کر سکتے۔ شوریٰ کا حق صرف مہاجرین و انصار کو ہے۔ اگر وہ حضرات ایک شخص پر متفق ہو جائیں اور اس کو امام بنالیں تو اسی میں اللہ کی رضا ہے)۔

خط کشیدہ الفاظ سے صراحۃً پتہ چلتا ہے کہ علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا بھی یہی نظریہ تھا کہ خلیفہ کا تقرر شوریٰ سے ہوتا ہے اور جس کو مہاجرین اور انصار نے مقرر کر دیا، وہی امام برحق ہوتا ہے اور اسی میں خداوند کریم کی رضا اور خوشنودی ہوتی ہے۔ ایک دوسرے مقام پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا:

اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّکُمْ بَا یَعْتُمُوْنِیْ عَلٰی مَا بُوْیِعَ عَلَیْہِ مَنْ کَانَ قَبْلِیْ وَ اِنَّمَا الْخِیَارُ لِلنَّاسِ قَبْلَ اَنْ یُّبَایِعُوْا فَاِذَا بَایَعُوْا فَلَا خِیَارَ لَھُمْ۔

(ناسخ التواریخ جلد سوم ص ۱۶ جز و اول)

(اے لوگو! تم نے میرے ساتھ ان شرائط پر بیعت کی ہے جن شرائط پر تم نے میرے پیشرووں سے بیعت کی تھی۔ بیعت کرنے سے پہلے تو لوگوں کو اختیار ہوتا ہے، لیکن جب وہ ایک مرتبہ بیعت کرلیں تو انہیں کوئی اختیار نہیں رہتا)۔

مزید برآں خلفائے ثلاثہ کے زمانہ میں آپ ان کے معتمد علیہ مشیر، ان کی مجلس مشاورت کے رکن رکین تھے۔ نہج البلاغۃ اور دیگر کتب میں مذکور ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایرانی فوجوں کے مقابلہ کے لیے بنفس نفیس جانے کا ارادہ کیا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا اور اسی پر عمل کیا۔ دوسری مرتبہ جب قیصر روم سے فیصلہ کن جنگ کرنے کے لیے بذات خود شام جانے کا عزم فرمایا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مشورہ کے مطابق سفر کا ارادہ ترک فرمادیا۔ آپ کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے:

اِنَّ ھٰذَا الْاَمْرَ لَمْ یَکُنْ نَصْرُہٗ وَ لَا خِذْلَانُہٗ بِکَثْرَۃٍ وَّ لَا بِقِلَّۃٍ وَ ھُوَ دِیْنُ اللّٰہِ

Marfat.com

الَّذِی اَظْهَرَهُ وَ جُنْدُهُ الَّذِی اَعَدَّهُ وَ اَمَدَّهُ وَ نَحْنُ عَلٰی مَوْعُوْدٍ مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مُنْجِزٌ وَعْدَهُ وَ نَاصِرٌ جُنْدَهُ۔ الخ (1)

(یعنی اس کام کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار کثرت اور قلت پر نہیں۔ یہ اللہ کا دین ہے جس کو اس نے غلبہ دیا ہے۔ یہ اللہ کا لشکر ہے جس کو اس نے تیار کیا ہے۔ ہمارے ساتھ اللہ تعالیٰ نے فتح ونصرت کا وعدہ کیا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا اور اپنے لشکر کی ضرور مدد کرے گا)۔

آپ نے حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی فوجوں کو اللہ تعالیٰ کی فوج کہا ہے اور اسلام کے مجاہدوں کی فتح وکامرانی کو جس طرح سراہا ہے وہ قابل التفات ہے۔

آپ ان حضرات کے زمانہ میں اور اپنے عہد خلافت میں ان حضرات کی توصیف میں رطب اللسان رہے۔ ان کی سیرت کی پختگی، ایمان کی قوت، حسن تدبر اور اسلام کی سربلندی کے لیے ان کی خدماتِ جلیلہ کو بارہا خراجِ تحسین پیش کیا۔ ایک مرتبہ فرمایا:

فَتَوَلّٰی اَبُوْبَکْرٍ تِلْکَ الْاُمُوْرَ وَ سَدَّ دَ وَ یَسَّرَ وَ قَارَبَ وَاقْتَصَدَ وَ صَحِبْتُهُ مُنَاصِحًا وَ اَطَعْتُهُ فِیْمَا اَطَاعَ اللّٰهَ تَعَالٰی فِیْهِ جَاهِدًا۔

(ناسخ التواریخ جلد سوم جز وسوم ص ۳۲۲)

(یعنی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے۔ آپ نے راست روی اختیار کی، آسانیاں پیدا کیں، حق کا قرب اختیار کیا، میانہ روی کو اپنا شعار بنایا۔ پس میں نے ایک خیر خواہ ساتھی کی طرح آپ کی سنگت کی اور جن معاملات میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی میں ان کی اطاعت میں کوشاں رہا)۔

اسی خطبہ میں آگے چل کر ارشاد فرماتے ہیں:

وَ تَوَلّٰی عُمَرُ الْاَمْرَ فَکَانَ مَرْضِیَّ السِّیْرَةِ مَیْمُوْنَ النَّقِیْبَةِ۔ (2)

(پھر حضرت عمر والی بنے۔ آپ کا کردار بڑا پسندیدہ تھا۔ آپ کا بخت بڑا مبارک تھا یا

1۔ ناسخ التواریخ، جلد 3، جز دوم، صفحہ 360　　2۔ ناسخ التواریخ، جلد 3، جز 3، صفحہ 322

Marfat.com

آپ کی ذات بڑی بابرکت تھی)۔

ایک دوسرے مقام پر مجمع عام کو خطاب کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں:

ثُمَّ اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ بَعْدِهٖ اِسْتَخْلَفُوْا اَمِیْرَیْنِ مِنْهُمْ صَالِحَیْنِ اَحْیَا السِّیْرَةَ وَ لَمْ یَعْدُوَا لسُّنَّةَ۔ (ناسخ التواریخ جلد سوم جزو دوم ص ۲۲۲)

یعنی حضور ﷺ کے وصال کے بعد مسلمانوں نے اپنے میں سے دو صالح خلیفے چنے جنہوں نے سیرتِ نبوی ﷺ کو زندہ کیا اور سنت سے ذرا تجاوز نہ کیا۔

اسی کتاب کے صفحہ نمبر ۱۱۶ پر ارشاد فرماتے ہیں۔

ثُمَّ اِسْتَخْلَفَ النَّاسُ اَبَابَکْرٍ ثُمَّ اِسْتَخْلَفَ اَبُوْبَکْرٍ عُمَرَ وَ اَحْسَنَا السِّیْرَةَ وَ عَدَلَا فِی الْاُمَّةِ۔ (1)

(یعنی حضور ﷺ کے بعد لوگوں نے ابوبکر کو خلیفہ مقرر کیا۔ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ نامزد کیا۔ ان دونوں نے اپنی سیرت کو پاک رکھا اور امت میں عدل وانصاف قائم کیا)۔

سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے ان حضرات کے متعلق جن پاکیزہ خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان کا احاطہ ممکن نہیں۔ شیعہ مصنفین کی کتابوں میں بے شمار حوالہ جات موجود ہیں جن میں سے صرف چند آپ نے ملاحظہ فرمائے۔ جن کی پاکدامنی، نیک نفسی، اتباع سنت اور عدل و انصاف کی شہادت حضرت علی رضی اللہ عنہ دے رہے ہوں، ایک مرتبہ نہیں بلکہ بار بار، تو پھر ان کی بدگوئی کرنا کتنا ظلم اور بے انصافی ہے ایسا کر کے یہ لوگ بتا رہے ہیں کہ انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی گواہی بھی منظور نہیں۔ آپ کے بعد ائمہ اہل بیت بھی ان حضرات کی عدل گستری کی گواہی دیتے رہے اور ان کی توصیف وتعریف فرماتے رہے۔ چند حوالے پیش خدمت ہیں:

ایک دفعہ حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کی خدمت اقدس میں عراق کے چند

1۔ ناسخ التواریخ، جلد 3، جز 2، صفحہ 116

Marfat.com

آدمی وارد ہوئے اور خلفائے ثلاثہ کی شان میں کچھ ناشائستہ گفتگو کی۔ جب وہ لوگ اپنے خبث باطن کو ظاہر کر چکے تو آپ نے ان سے پوچھا کہ تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم ان مہاجرین اولین میں سے ہو؟ جن کی شان میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے:

الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا وَّ يَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ۚ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ (الحشر)

"جنہیں (جبراً) نکال دیا گیا تھا ان کے گھروں سے اور جائیدادوں سے یہ (نیک بخت) تلاش کرتے ہیں اللہ کا فضل اور اس کی رضا اور (ہر وقت) مدد کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی۔ یہی راستباز لوگ ہیں"۔

انہوں نے جواب دیا: ہم اس گروہ میں سے نہیں ہیں۔ پھر آپ نے دریافت فرمایا: کیا تم ان میں سے ہو؟ جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَ لَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (الحشر:۹)

"اور (اس حال میں) ان کا بھی ہے جو دار ہجرت میں مقیم ہیں اور ایمان میں (ثابت قدم) ہیں مہاجرین (کی آمد) سے پہلے محبت کرتے ہیں ان سے جو ہجرت کر کے ان کے پاس آتے ہیں۔ اور نہیں پاتے اپنے سینوں میں کوئی خلش اس چیز کے بارے میں جو مہاجرین کو دے دی جائے اور ترجیح دیتے ہیں (انہیں) اپنے آپ پر اگرچہ خود انہیں اس چیز کی شدید حاجت ہو"۔

ان لوگوں نے کہا کہ ہم اس گروہ سے بھی نہیں۔

حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان دونوں گروہوں میں سے نہ ہونے کا تم نے خود اعتراف کر لیا اور میں گواہی دیتا ہوں کہ تم مسلمانوں کے تیسرے گروہ میں سے بھی نہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

Marfat.com

وَ الَّذِیۡنَ جَآءُوۡ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَا اغۡفِرۡ لَنَا وَ لِاِخۡوَانِنَا الَّذِیۡنَ سَبَقُوۡنَا بِالۡاِیۡمَانِ وَ لَا تَجۡعَلۡ فِیۡ قُلُوۡبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا (الحشر:١٠)

(یعنی وہ لوگ جو ان کے بعد آئے وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی بخش دے جو ایمان کے ساتھ ہم سے پہلے گزر چکے ہیں اور اہل ایمان کے لیے ہمارے دلوں میں بغض مت ڈال)۔

پھر آپ نے بڑے غضبناک لہجہ میں فرمایا:

اُخۡرُجُوۡا عَنِّیۡ فَعَلَ اللّٰہُ بِکُمۡ۔

میرے پاس سے نکل جاؤ۔ خدا تمہیں ہلاک کرے۔

(کشف الغمہ جلد دوم صفحہ ٢٦٧)

پانچویں امام محمد باقر رضی اللہ عنہ کا نظریہ بھی سماعت فرمائیے۔ شاید آپ کی چشم بصیرت بینا ہو۔ عروہ بن عبداللہ کہتے ہیں: میں نے امام محمد باقر سے دریافت کیا کہ تلوار کو چاندی سے آراستہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ آپ نے فرمایا کہ اس میں کوئی حرج نہیں اور دلیل یہ پیش کی:

قَدۡ حَلّٰی اَبُوۡ بَکۡرِ ﹰالصِّدِّیۡقُ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنۡہُ سَیۡفَہٗ۔

(یعنی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی تلوار کو چاندی سے آراستہ کیا)۔

عروہ کہتا ہے کہ میں نے کہا: اے امام! آپ بھی ابو بکر کو صدیق کہتے ہیں۔ یہ سن کر آپ غصہ سے اٹھ بیٹھے اور قبلہ رو ہو کر فرمانے لگے:

نَعَمِ الصِّدِّیۡقُ نَعَمِ الصِّدِّیۡقُ نَعَمِ الصِّدِّیۡقُ فَمَنۡ لَمۡ یَقُلۡ لَہُ الصِّدِّیۡقُ فَلَا صَدَّقَ اللّٰہُ لَہٗ قَوۡلًا فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ۔

(ہاں وہ صدیق ہیں، ہاں وہ صدیق ہیں، ہاں وہ صدیق ہیں۔ جو انہیں صدیق نہیں کہے گا اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کی بات کو جھوٹا کرے گا)۔

(کشف الغمہ جلد ٢ صفحہ ٣٦٠)

جب حضرت امام محمد باقر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو صدیق فرما رہے تھے تو آپ خود

Marfat.com

ہی مقامِ ابوبکر کی رفعتوں اور بلندیوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یاد رہے کہ صدیق کا درجہ صالحین اور شہداء سے بھی اونچا ہوتا ہے اور صدیق سے اوپر نبی کا مقام ہوتا ہے۔ حضرت امام جعفر صادق کا ارشاد بھی ملاحظہ فرمایئے۔ آپ سے کسی نے پوچھا:

یَاابْنَ رَسُوْلِ اللّٰہِ مَا تَقُوْلُ فِیْ اَبِیْ بَکْرٍ وَّ عُمَرَ؟

اے ابن رسول! آپ ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟

آپ نے ارشاد فرمایا:

هُمَا اِمَامَانِ عَادِلَانِ قَاسِطَانِ کَانَا عَلَی الْحَقِّ وَ مَاتَا عَلَیْهِ فَعَلَیْهِمَا رَحْمَةُ اللّٰهِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ۔ (1)

(یہ دونوں امام تھے، عادل اور منصف تھے، جب تک زندہ رہے حق پر ثابت رہے اور حق پر ہی اس دنیا سے انتقال کیا۔ قیامت کے دن ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو)۔

اگرچہ بحث طویل ہوگئی ہے، لیکن اس مسئلہ کی اہمیت کا تقاضا یہ تھا کہ اسے شرح وبسط سے بیان کیا جائے، تاکہ اسلام کے سیاسی نظریہ کے متعلق کوئی شک وشبہ باقی نہ رہے اور یہ چیز روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائے کہ اسلام کے سیاسی دستور کا دارومدار موروثیت پر نہیں بلکہ شوریٰ پر ہے۔ نیز اسلام نے سربراہِ مملکت کو مطلق العنان بادشاہ کا مقام نہیں بخشا، بلکہ وہ خلیفہ ہے اور اس کا فرضِ اولین یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کرے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کا اتباع کرے اور امت مسلمہ کو بھی اس پر کاربند ہونے کی ہدایت کرے۔ شیعہ حضرات، جو خلافت کو موروثی سمجھتے ہیں ان کے سامنے بھی ہم نے قرآن و سنت اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے افعال واقوال اپنے دعوے کی شہادت میں پیش کر دیے۔ لطف یہ ہے کہ شیعہ حضرات خود ہی عملی طور پر اس توارث کو زیادہ عرصہ تک برقرار نہ رکھ سکے اور خلیفہ متعین کرنے میں ان میں بھی شدید اختلافات رونما ہوگئے۔ ان میں سے ایک فرقہ مختاریہ ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد حسنین کی امامت کا قائل نہیں بلکہ محمد ابن الحنفیہ

1۔ احقاق الحق از قاضی نور اللہ حسینی، جلد 1، صفحہ 70، مطبوعہ مطبعہ اسلامیہ تہران

Marfat.com

کو امام برحق سمجھتا ہے اور حضرت امام محمد باقر کی امامت کا منکر ہے۔ ان میں سے ایک فرقہ جارودیہ ہے جس کا عقیدہ یہ ہے کہ حسنین کے بعد امامت وراثت سے نہیں، بلکہ شوریٰ سے طے پاتی ہے۔

حضرت امام جعفر صادق کی اولاد کے بارے میں پھر شیعہ کا اختلاف ہے کہ آپ کے بعد کون امام برحق ہے؟ اسماعیلیہ فرقہ آپ کے صاحبزادے اسماعیل کو امامِ برحق سمجھتا ہے۔ اثنا عشریہ حضرت موسیٰ کاظم کو امامِ برحق سمجھتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ حضرت اسماعیل کے والد حضرت جعفر صادق ہیں اور والدۂ محترمہ حضرت امام حسن کی پوتی حضرت فاطمہ ہیں، جبکہ حضرت کاظم کی والدہ ماجدہ حمیدہ ہیں جو کہ ایک آزاد شدہ کنیز ہیں۔ غرضیکہ اس مسئلہ پر شیعہ مذہب سینکڑوں فرقوں میں بٹ گیا اور فرقہ اثنا عشریہ کو بھی حضرت امام حسن عسکری کے بعد امام غائب کے عقیدے کا سہارا لینا پڑا۔

یاد رہے کہ حضرت امام عسکری گیارہویں امام کا وصال ۲۶۰ھ میں ہوا اور امام مہدی کو غائب ہوئے گیارہ صدیوں سے زیادہ وقت گزر چکا ہے، لیکن ابھی تک وہ ظاہر نہیں ہوئے۔ شیعہ حضرات کا عقیدہ ہے کہ ہر زمانہ میں ایک ایسا امام ہونا چاہیے جو معصوم ہو، کامل ہو۔ احکام وعلوم میں اپنی رعایا سے بے نیاز ہو کر وہ کہتے ہیں کہ کسی زمانہ کا ایسے امام سے خالی ہونا محال ہے۔

وَالِاسْتِدْلَالُ الصَّحِيْحُ مِنْ وُجُوْدِ إِمَامٍ مَعْصُوْمٍ كَامِلٍ غَنِيٍّ عَنْ رِعَايَاهُ فِي الْأَحْكَامِ، وَالْعُلُوْمِ فِي كُلِّ زَمَانٍ لِاسْتِحَالَةِ خُلُوِّ الْمُكَلَّفِيْنَ مِنْ سُلْطَانٍ.

(کشف الغمہ، جلد سوم، ص ۳۳۷)

لیکن ۲۶۰ھ میں جبکہ حضرت امام حسن عسکری کا وصال ہوا، اس وقت سے لے کر آج تک گیارہ سو بتیس سال گزر چکے ہیں، لیکن ابھی تک امام غائب ہیں جن سے ہم ابھی تک کسی قسم کا استفادہ نہیں کر سکے۔ جن کی غیر حاضری کے باعث دین کے احکام معطل پڑے ہیں اور باطل کو غلبہ حاصل ہے اور کفر دندناتا پھر رہا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے:

Marfat.com

پری نہفتہ رخ و دیوار کرشمہ و ناز
گریست عقل زحیرت کہ ایں چہ بو العجبیت

یعنی حق کا علمبردار تو غار میں جا کر چھپ گیا ہے اور باطل کے پرستار عشوہ طرازیوں میں مصروف ہیں اور لوگوں کو اپنے دامِ فریب میں پھنسا رہے ہیں۔ میری عقل حیرت کے مارے اشکبار ہے۔ یہ کیا تماشا ہے؟

شیعہ کا عقیدہ ہے کہ امام مہدی علیہ السلام قیامت سے قبل غار سے باہر تشریف لائیں گے اور انیس سال تک مسند خلافت پر جلوہ افروز ہوں گے۔ اس عرصہ میں اسلام کو سربلند کریں گے۔ ساری دنیا میں حق کا بول بالا اور باطل کا منہ کالا ہوگا۔ ہر طرف عدل وانصاف کا دور دورہ ہوگا اور آپ کے وصال کے صرف چالیس دن بعد قیامت برپا ہو جائے گی۔ ایک سلیم الطبع آدمی یہ باتیں سن کر انگشت بدنداں رہ جاتا ہے کہ یہ کیا ماجرا ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے، قرآنِ کریم نازل ہوا، ہزاروں معجزات ظاہر ہوئے لیکن حق کو غلبہ نصیب نہ ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (الفتح۔۲۸) کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا نہ ہوا۔ چودہ صدیاں بیت گئیں۔ اہل حق زبوں رہے اور حق مغلوب و مقہور رہا، باطل اور اہل باطل کا ڈنکا بجتا رہا۔ معلوم نہیں کب امام مہدی تشریف لائیں گے اور حق کو سربلند کریں گے؟ اور وہ بھی صرف انیس سال کے قلیل عرصہ کے لیے۔

یہ سب باتیں محض تکلفات ہیں اور اسلام کے شورائی نظامِ خلافت سے انحراف کا نتیجہ ہیں۔ کاش! ہم اب بھی اپنی ناروا ضد سے باز آئیں اور قرآنِ حکیم، سنت حبیب خدا اور سیرتِ علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور احوال ائمہ اطہار کی روشنی میں اسلام کے نظامِ سیاست کو سمجھنے کی کوشش کریں، تاکہ ہم اہل دنیا کو بتا سکیں کہ جمہوریت اور عام انتخابات، آزادئ رائے اور احترامِ آدمیت کے جن اصولوں پر وہ ناز کرتے ہیں، ان کا لانے والا اور دنیائے انسانیت میں ان کا پرچار کرنے والا، ہمارا نبی مکرم، رحمت عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ بابرکات ہے۔

Marfat.com

آؤ! ان کا دامن رحمت تھام لو۔ نجات پا جاؤ گے۔ طرح طرح کے فتنوں اور طوفانوں میں انسانیت کی ہچکولے کھاتی ہوئی کشتی سلامتی کے کنارے لنگر انداز ہوگی۔ ہم بڑے فخر سے ساری دنیا کے سامنے یہ اعلان کر سکتے ہیں کہ وہ ہمارا خلیفہ اول ہی تھا جس نے اپنے پہلے خطبہ میں یہ تاریخ ساز الفاظ فرمائے تھے:

اَیُّھَا النَّاسُ قَدْ وُلِّیْتُ اَمْرَکُمْ وَ لَسْتُ بِخَیْرِکُمْ۔ اَیُّھَا النَّاسُ! اِنِّیْ اَنَا مُتَّبِعٌ وَ لَسْتُ بِمُبْتَدِعٍ۔ فَاِنْ اَحْسَنْتُ فَاَعِیْنُوْنِیْ وَ اِنْ زِغْتُ فَقَوِّمُوْنِیْ۔ (1)

اے لوگو! مجھے تمہاری امانت سونپی گئی ہے، میں اپنے آپ کو کسی سے بہتر نہیں سمجھتا۔ اے لوگو! میں قرآن کا متبع ہوں اور اپنی طرف سے کوئی قانون نافذ کرنے والا نہیں۔ اگر میں حسن و خوبی سے اتباع قرآن و سنت کرتا رہوں تو میری امداد کرنا۔ اگر مجھ میں ذرا سا میل اور کجی پاؤ تو مجھے درست کر دو۔

1۔ الطبقات الکبریٰ لابن سعد، جلد 3، صفحہ 83-182، نور الابصار، صفحہ 81، دار الکتب العلمیہ بیروت

Marfat.com

حضرت سیدنا
امام حسین رضی اللہ عنہ
اور یزید

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

صحت مند ذہن ایسے لوگوں کا گرویدہ ہوتا ہے جو پاک باز اور پارسا ہیں، جن کی زندگی ایک اعلیٰ مقصد کے لیے وقف ہوتی ہے، جن کا وجود منبع خیرات و برکات ہوتا ہے، جن کا دامن انانیت، خودغرضی، حرص وغیرہ رذائل سے پاک ہوتا ہے، جو زندگی کے افق پر مہر و ماہ بن کر نمودار ہوتے ہیں، ان کی حیاتِ مستعار کی ہر گھڑی بنی نوع انسان کی خیر خواہی میں گزرتی ہے اور جب وہ یہاں سے رخصت ہوتے ہیں تو اپنے پیچھے بطورِ یادگار ایسے نقوش چھوڑ جاتے ہیں جو آنے والی نسلوں کے لیے مینارۂ نور کا کام دیتے ہیں۔

لیکن جب ذہن میں فتور، نگاہ میں کجی اور سوچ میں بگاڑ ہو جاتا ہے تو پھر وہ لوگ اس کی دلچسپی بلکہ عقیدت کا مرکز بن جاتے ہیں جو کبر و غرور کا پیکر ہوتے ہیں، جنہیں ہوس اقتدار اتنا اندھا کر دیتی ہے کہ وہ عدل و انصاف کی قدروں کو پامال کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے، قوم کی غیرت و حریت کو بھی داؤ پر لگانے سے باز نہیں آتے، جور و ستم کا ایک طوفان بن کر نمودار ہوتے ہیں اور جہاں سے گزرتے ہیں تباہی و بربادی مچاتے چلے جاتے ہیں۔

فتنۂ خارجیت، کئی صدیوں تک امت کے خرمن امن و عافیت پر بجلی بن کر گرتا رہا۔ اپنی فتنہ انگیزیوں سے جنگ و جدال اور قتل و غارت کا بازار گرم رکھا۔ آخر کار علمی محاذ پر علمائے ربانیین نے انہیں شکست دی اور میدانِ جنگ میں مجاہدین اسلام کی شمشیر خارا شگاف نے اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ اب وہی فتنہ پھر پرپرزے نکال رہا ہے، بلکہ عصر حاضر میں ان کے پیرو اپنے پیشرووں سے دو قدم آگے ہیں۔ پہلے خارجی سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور آپ کی ذریت طاہرہ کے مخالف تھے تو ساتھ ہی یزید اور اس کے ہم مشرب دوسرے لوگوں سے بھی انہیں شدید عداوت تھی، لیکن آج کے خارجی یزید کو خلیفۂ برحق، مجاہد اسلام، ملت کا بطل جلیل ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ اس کے پس پردہ اہل بیت کرام خصوصاً امام عالی مقام سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شان گھٹانے کا جذبہ کارفرما ہے۔

Marfat.com

یہ تحریک اپنے نتائج و عواقب کے اعتبار سے از حد خطرناک ہے۔ آج تک تو یہ کیفیت ہے کہ جب بھی کوئی جابر اور ظالم حاکم ہم پر مسلط ہو جاتا ہے، تو حالات کی نامساعدت کی پرواہ کیے بغیر اسوۂ شبیری کی یاد تازہ کر کے نتائج سے بے نیاز ہو کر ہم اس کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیتے ہیں اور کشتیاں جلا کر میدانِ جنگ میں کود پڑتے ہیں۔ فیلسوف اسلام علامہ اقبال نے اپنی قوم کو، جو معاشی لحاظ سے مفلس و قلاش، علمی لحاظ سے پسماندہ اور سیاسی لحاظ سے منتشر و درماندہ تھی، انگریز کی غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لیے للکارا تو انہوں نے سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ ہی کا کردار پیش کیا۔ فرماتے ہیں:

موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید
ایں دو قوت از حیات آید پدید

''موسیٰ اور فرعون، شبیر اور یزید یہ دو قوتیں ہیں جو کشمکش حیات میں نمایاں ہوتی ہیں''۔

زندہ حق از قوت شبیری است
باطل آخر داغ حسرت میری است

''حق کی بقا کا راز قوتِ شبیری میں مضمر ہے اور باطل کے مقدر میں حسرت و ناکامی کی موت ہے''۔

اس حقیقت کے بیان کے بعد کہ کارگاہِ حیات میں یہ ساری بزم آرائیاں اور رنگینیاں قوتِ شبیری کی ممنونِ احسان ہیں، اقبال اب آپ کے زندۂ جاوید کارنامے کا ذکر کرتے ہیں۔

چوں خلافت رشتہ از قرآن گسیخت
حریت را زہر اندر جام ریخت

''خلافت نے جب قرآن سے اپنا رشتہ توڑ لیا اور حریت و آزادی کے جام میں زہر گھول دیا''۔

Marfat.com

خاست آں سر جلوهٔ خیر الامم
چوں سحاب قبلہ باراں در قدم

''خیر الامم کا سرتاج اٹھا۔ مینہ برسانے والے ابر رحمت کی مانند''۔

بر زمین کربلا بارید و رفت
لالہ در ویرانہا کارید و رفت

''یہ بادل کربلا کی زمین پر برسا اور چلا گیا۔ اس نے ویرانے میں گل لالہ کو کاشت کیا اور چلا گیا''۔

تا قیامت قطع استبداد کرد
موجِ خون او چمن ایجاد کرد

''اپنا سر دے کر آپ نے قیامت تک جبر واستبداد کی جڑ کاٹ دی اور آپ کے خونِ ناب کی موج نے چمن ایجاد کر دیا''۔

اپنے سارے خاندان کی اور اپنی قربانی دے کر آپ نے ملت اسلامیہ کو یہ درس دیا۔

ما سوی اللہ را مسلماں بندہ نیست
پیش فرعونے سرش افگندہ نیست (1)

''اللہ تعالیٰ کے سوا مسلمان کسی کا غلام نہیں ہے، کسی فرعون کے سامنے اس کا سر نہیں جھک سکتا''۔

حق وصداقت کے ایسے نڈر، علمبردار، شرفِ انسانی کے بہادر پاسبان اور حریت فکر کے بے باک مجاہد، حسین رضی اللہ عنہ کی زندگی اور آپ کے حیات آفرین کردار کو اگر یہ لوگ اپنی قوم کے نوجوانوں کی نگاہ میں مشکوک بنا دیں گے تو بے سروسامانی کے عالم میں حق کی شمع پر پروانہ وار جل مرنے کا جذبہ ان کے دلوں میں کیونکر پیدا ہوگا؟ اگر یزید ہی خلیفۂ راشد ہے تو پھر اس بے ثمر بحث کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیجئے کہ اسلام کا نظامِ سیاست، حق کی بالا دستی،

1۔ اسرار و رموز، صفحہ 11-110 (کلیات اقبال فارسی، صفحہ 11-110)

اہل حق کی سرفرازی، عدل، حریت، مساوات جیسی عالی اقدار کا نقیب ہے۔ جس اسلام میں یزید خلیفۂ راشد، ابن زیاد، شمر، سنان بن انس اور خولی جیسے لوگ خلافت کے دست و بازو ہوں گے، اس اسلام سے انسانیت کے مقدر کو وابستہ کرنا انتہا درجہ کی ابلہی ہے، لیکن یہ وہ اسلام نہیں جو اللہ تعالیٰ کا محبوب نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لے کر تشریف لایا تھا۔ اس کے فیض تربیت نے صحابہ کرام جیسی پاک نہاد جماعت پیدا کی، اس نے انسانی تاریخ کو خلفائے اربعہ جیسے عادل حاکم عطا فرمائے۔

اگر یہ لوگ اپنے اس مذموم مقصد میں بدقسمتی سے کامیاب ہو جاتے ہیں، اپنی تحریر و تقریر سے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے کردار کو گہنا دیتے ہیں اور یزید جیسے شخص کو ملت کا ہیرو ثابت کرنے کی مہم سر کر لیتے ہیں تو اس پر جو خطرناک، بلکہ تباہ کن اثرات مرتب ہو سکتے ہیں ان کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ملت کی تاریخ کے معتبر مصادر کی طرف رجوع کیا جائے اور جو بات پایۂ ثبوت کو پہنچے قوم کے سامنے اسے پیش کر دیا جائے، تاکہ جو لوگ صدق دل سے تلاشِ حق میں سرگرداں ہیں ان کی دلجمعی کا سامان ہو جائے۔ پہلے ہم ان صاحبان کے ممدوح یزید کے شخصی کردار کا جائزہ لیں گے اور یہ دیکھیں گے کہ ذاتی طور پر یہ شخص کن خوبیوں اور خجستہ صفات کا حامل تھا، پھر یہ دیکھیں گے کہ اس نے اپنے دورِ اقتدار میں جو سنہری کارنامے انجام دیے ہیں ان کی حقیقت کیا تھی؟ پھر اس کے ان محامد اور خصالِ حمیدہ پر تبصرہ کریں گے جن کو اس کے مداح بڑے جوش و خروش سے پیش کرتے رہتے ہیں۔ آخر میں دیکھیں گے کہ اکابر امت کا یزید کے بارے میں کیا نظریہ تھا؟ وہ اس کی ستم کیشیوں کو کس نظر سے دیکھتے تھے؟ پھر یہ فیصلہ کرنے میں آپ کو زیادہ دقت نہ ہو گی کہ یہ شخص آفرین و نفرین میں سے کس کا مستحق ہے؟

شخصی کردار

سب سے پہلے ہم زیاد بن سمیہ کی رائے پیش کرتے ہیں جو یزید اور اس کے خاندان کا دل و جان سے وفادار تھا۔ جس نے اور جس کے بیٹوں نے یزید کے لیے صرف تن من دھن

Marfat.com

ہی نہیں، بلکہ اپنی شہرت اور اپنا دین ایمان بھی اس پر نثار کر دیا۔ ایسے وفادار اور جانثار شخص کی رائے پر دشمنی، جانب داری، تعصب وغیرہ کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے یزید کے بارے میں جو کچھ کہا ہوگا، حزم و احتیاط کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے کہا ہوگا۔ مؤرخ شہیر ابن جریر طبری اپنی تاریخ میں یہ واقعہ نقل کرتے ہیں۔

اس کے مطالعہ سے یزید کے بارے میں زیاد کی جو رائے ہے وہ آپ کو معلوم ہو جائے گی۔

لَمَّا اَرَادَ مُعَاوِيَةُ اَنْ يُبَايِعَ لِيَزِيْدَ كَتَبَ اِلٰى زِيَادٍ يَسْتَشِيْرُهٗ.......... شَاوَرَ زِيَادٌ عُبَيْدَ بْنَ كَعْبٍ النَّمِيْرِيَّ وَ اَخْبَرَهٗ اَنَّ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ كَتَبَ اِلَيَّ يَزْعَمُ اَنَّهٗ قَدْ عَزَمَ عَلٰى بَيْعَةِ يَزِيْدَ وَهُوَ يَتَخَوَّفُ نَفْرَةَ النَّاسِ وَ يَرْجُوْا مُطَابَقَتَهُمْ وَ يَسْتَشِيْرُنِيْ وَ عِلَاقَةُ اَمْرِ الْاِسْلَامِ وَ ضَمَانُهٗ عَظِيْمٌ. وَ يَزِيْدُ صَاحِبُ رِسْلَةٍ وَ تَهَاوُنٍ مَعَ قَدْ اُوْلَعَ بِهٖ مِنَ الصَّيْدِ فَالْقَ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ مُؤَدِّيًا عَنِّيْ فَاَخْبِرْهُ عَنْ فَعَلَاتِ يَزِيْدَ فَقُلْ لَهٗ رُوَيْدَكَ بِالْاَمْرِ وَلَا تَعْجَلْ فَاِنَّ دَرْكًا فِيْ تَاخِيْرٍ خَيْرٌ مِنْ تَعْجِيْلٍ عَاقِبَتُهُ الْفَوْتُ. (تاریخ طبری ص ۱۶۹ ج ۳، جز ۶)

ترجمہ: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے (آئندہ خانہ جنگی کے خوف سے) جب یہ ارادہ کیا کہ لوگ یزید کی بیعت کر لیں تو آپ نے زیاد کی طرف لکھا کہ اس بارے میں اس کی کیا رائے ہے؟ زیاد نے اپنے ہمراز عبید بن کعب نمیری سے مشورہ کیا اور اسے بتایا کہ امیر المومنین نے اس کی طرف لکھا ہے کہ وہ یزید کے لیے خلافت کی بیعت لینے کا عزم کر چکے ہیں۔ ساتھ ہی انہیں یہ خوف بھی ہے کہ لوگ اس اقدام کو مبادا نفرت کی نگاہ سے دیکھیں۔ ان کی آرزو ہے کہ لوگ اس کی بیعت پر متفق ہو جائیں۔ زیاد نے عبید سے کہا: یہ بڑا اہم مسئلہ ہے۔ اس کا تعلق اسلام سے ہے۔ یہ بات اور اس کی ضمانت بڑی عظیم ذمہ داری ہے۔ یزید لا ابالی مزاج کا مالک ہے۔ غفلت اور تہاون اس کا شعار ہے۔ اس کے علاوہ شکار کا بڑا دلدادہ ہے۔ تم جاؤ، امیر المومنین سے ملاقات کرو اور میری طرف سے انہیں یہ پیغام دو اور یزید کی کارستانیوں سے بھی انہیں خبردار کر دو اور عرض کرو کہ آپ اس معاملہ

Marfat.com

میں صبر سے کام لیں اور جلد بازی نہ کریں، کیونکہ اگر گوہر مقصود تاخیر سے حاصل ہو جائے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ انسان جلد بازی سے کام لے اور مقصد کو ضائع کر بیٹھے۔

علامہ ابن اثیر نے اپنی تاریخ ''الکامل''(1) میں بعینہٖ انہی الفاظ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ گویا زیاد جیسے وفادار کے نزدیک بھی یزید کا کردار ناپسندیدہ اور داغدار ہے، لیکن بعد میں یہ طے پایا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو یزید کے صحیح حالات سے آگاہ نہ کیا جائے، بلکہ خود یزید کو سمجھایا جائے کہ وہ غلط کاریوں سے باز آئے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو یزید کے اطوار کا پوری طرح علم نہ تھا اور ان کے گورنر اور اعیان مملکت میں یہ جرأت مفقود تھی کہ وہ اس کے حالات سے آپ کو پوری طرح مطلع کریں۔

اور سنیے!

''امیر المؤمنین حضرت عمر بن عبد العزیز کی مجلس میں ایک روز یزید کا ذکر چھڑ گیا۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا: قَالَ اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ یَزِیْدُ. یعنی امیر المومنین یزید نے یہ کہا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز غصہ سے بولے: تم یزید (جیسے نابکار) کو امیر المؤمنین کہہ رہے ہو؟ پھر آپ نے حکم دیا کہ امیر المومنین کہنے والے کو بیس درے لگائے جائیں''۔

(تہذیب التہذیب ص ۳۶۱ جلد ۱۱)

سب جانتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبد العزیز خاندان بنی امیہ کے ایک فرد تھے، لیکن یزید کے بارے میں آپ یہ سننا تک گوارا نہ کر سکے کہ اسے کوئی شخص امیر المومنین کے معزز لقب سے یاد کرے، بلکہ آپ نے ایسا کہنے والے پر ناراضگی کا اظہار ہی نہیں کیا، بلکہ اسے بیس کوڑوں کی سزا دی، تاکہ آئندہ کوئی شخص اسے امیر المومنین کہنے کی جرأت نہ کر سکے۔ کیا تیرہ سو سال بعد آنے والے یہ محققین یزید کے کردار و سیرت کو حضرت عمر بن عبد العزیز سے بہتر جانتے ہیں؟ جب آپ اس کو اس منصب کا اہل نہیں سمجھتے تو پھر ہمیں یا کسی اور کو کیا حق پہنچتا ہے کہ ایسے شخص کو امیر المومنین اور خلیفۂ راشد کے القاب سے ملقب کر کے ان عزت و

1۔ الکامل فی التاریخ، جلد 3، صفحہ 505

Marfat.com

حرمت والے القاب کی تذلیل کریں؟

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنی شہادت سے پہلے کربلا کے تپتے ہوئے میدان میں اپنے نوجوان بچوں، بھائیوں اور عزیزوں کے بکھرے ہوئے لاشوں کے درمیان کھڑے ہو کر جو آخری خطبہ ارشاد فرمایا، اس سے بھی اس مصنوعی خلیفہ راشد کی سیرت و کردار پر روشنی پڑتی ہے۔

آپ نے فرمایا:

اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ رَاٰی سُلْطَانًا جَائِرًا مُسْتَحِلًّا لِحَرَامِ اللّٰهِ. نَاکِثًا لِعَهْدِ اللّٰهِ مُخَالِفًا لِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَعْمَلُ فِیْ عِبَادِ اللّٰهِ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ فَلَمْ یُغَیِّرْ عَلَیْهِ بِفِعْلٍ وَلَا قَوْلٍ کَانَ حَقًّا عَلَی اللّٰهِ تَعَالٰی اَنْ یُدْخِلَهٗ مَدْخَلَهٗ اِلَّا وَ اِنَّ هٰؤُلَاءِ قَدْ لَزِمُوْا طَاعَةَ الشَّیْطَانِ وَ تَرَکُوْا طَاعَةَ الرَّحْمٰنِ وَ اَظْهَرُوا الْفَسَادَ وَ عَطَّلُوا الْحُدُوْدَ وَ اسْتَاثَرُوْا بِالْفَیْءِ وَ اَحَلُّوْا حَرَامَ اللّٰهِ وَ حَرَّمُوْا حَلَالَهٗ وَ اَنَا اَحَقُّ مِنْ غَیْرِ۔ (تاریخ طبری ص ۲۲۹ جلد ۳، جز ۶، تاریخ کامل ص ۴۸ ج ۴)

ترجمہ: اے لوگو! اللہ تعالیٰ کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص ایسے ظالم سلطان کو دیکھتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے حرام کو حلال کرنے والا ہے، اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑنے والا ہے، رسول اللہ کی سنت کی مخالفت کرنے والا ہے، اللہ تعالیٰ کے بندوں کے ساتھ گناہ اور زیادتی کا برتاؤ کرتا ہے پھر وہ دیکھنے والا اپنے عمل یا قول سے اس کو بدلنے کی کوشش نہیں کرتا، تو وہ قیامت کے دن اس شخص کو بھی جہنم کے اس طبقہ میں داخل کیا جائے گا جہاں وہ ظالم سلطان داخل ہوگا۔ اے لوگو! کان کھول کر سن لو، انہوں نے (یزید اور اس کے حواریوں نے) شیطان کی اطاعت کو اپنے اوپر لازم کر لیا ہے، رحمٰن کی اطاعت کو چھوڑ دیا ہے، فساد برپا کر دیا ہے، حدود اسلام کو معطل کر دیا ہے، فے کا مال خود ہڑپ کر جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے حلال کو حرام اور اس کے حرام کو حلال کر دیا ہے۔ مجھ پر یہ لازم ہے کہ میں ایسے

Marfat.com

ظالم سلطان کے خلاف علم بغاوت بلند کروں''۔

اس خطبہ میں یزید کے خلاف علم جہاد بلند کرنے کی وجہ آپ نے بڑی تفصیل سے بیان فرمادی۔ امام حسین جیسی ہستی کی زبان پر کبھی جھوٹ نہیں آسکتا۔ خصوصاً زندگی کے آخری لمحوں میں جب آپ اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہونے والے ہیں۔ ذرا غور فرمایئے! اور اس منظر کا تصور کیجئے کہ شیعان کوفہ صدہا خطوط اور قاصد بھیج کر بڑی منت وسماجت سے حضرت کو اپنے ہاں بلاتے ہیں، لیکن جب ابن زیاد کا کوڑا ان کی پیٹھ پر برسنے کے لیے ہوا میں لہراتا ہے تو اپنی بیعت کو توڑ دیتے ہیں۔ نہ صرف آپ کی امداد کرنے سے دست کش ہوتے ہیں بلکہ آپ کے مدمقابل خم ٹھونک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب اپنے شیعہ کی طوطا چشمی کا یہ ہولناک منظر آپ نے دیکھا ہوگا تو آپ کے قلب مبارک پر کیا گزری ہوگی۔ آپ کو صاف نظر آ رہا تھا کہ اب جامِ شہادت پیئے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔ اس دنیا کو چھوڑنے سے پہلے اور خداوند ذوالجلال کی بارگاہ میں پیش ہونے سے پہلے یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ آپ نے یزید اور اس کے امرائے حکومت پر جھوٹا بہتان لگایا ہوگا۔ کسی نازک سے نازک مقام پر حق وصداقت کا دامن چھوڑ دینا شان حسین رضی اللہ عنہ سے بہت ہی بعید ہے، بلکہ آپ نے اس وقت اپنے جہاد کی جو وجوہات بیان کی ہیں وہ حق وصداقت کی ترجمانی ہے۔ خود ہی انصاف فرمایئے کہ جس شخص کے بارے میں امامِ عالی مقام کی یہ رائے ہو، اس کو خلیفۂ راشد اور امیر المومنین کہنے کی جرأت وہی لوگ کرسکتے ہیں جو امام کے مقامِ رفیع سے بے خبر ہیں۔

ایک اور شہادت سماعت فرمایئے۔ یہ شاہد حضرت عبداللہ ہیں۔ ان کے والد ماجد کا نام حنظلہ ہے جو شہید احد اور غسیل ملائکہ ہیں۔ ایسے نامور باپ کا بیٹا ہونا ان کے لیے کوئی کم شرف نہیں، لیکن اپنی خوبیوں اور زہد وتقویٰ کی وجہ سے وہ راہب کے لقب سے ملقب تھے۔ دنیا اور امور دنیا سے ان کی دلچسپی برائے نام تھی۔ زیادہ وقت خلوت میں ذکر الٰہی کرتے گزر جاتا۔ یہ حضرت عبداللہ، اہل مدینہ کے ایک وفد کے ساتھ یزید کی ملاقات کے لیے گئے۔

Marfat.com

وہاں کئی دن تک اس وفد نے قیام کیا۔ انہوں نے اس شخص کے صبح و شام کے معمولات پر آگاہی حاصل کی اور جب واپس آئے تو اہل مدینہ کو یزید کے احوال و اطوار سے آگاہ کیا۔ اہل مدینہ اس کے فسق و فجور کے حالات سن کر حیران رہ گئے۔ چنانچہ تمام اہل مدینہ نے ایسے فاسق شخص کی بیعت کو توڑ دیا۔ اس وفد نے یزید کے بارے میں اہل مدینہ کو جو بتایا اسے ملاحظہ فرمائیے:

قَالُوْا قَدِمْنَا مِنْ عِنْدِ رَجُلٍ لَیْسَ لَهٗ دِیْنٌ یَشْرَبُ الْخَمْرَ وَ یَضْرِبُ بِالطَّنَابِیْرِ وَ یَعْزِفُ عِنْدَهُ الْقِیَانُ وَ یَلْعَبُ بِالْکِلَابِ وَ یَسْمُرُ عِنْدَهُ الْحرَّابُ وَ هُمُ اللُّصُوْصُ وَ اِنَّا نُشْهِدُکُمْ اَنَّا قَدْ خَلَعْنَاهُ۔

(تاریخ طبری ص ۴ جلد ۴، جزء ۷۔ تاریخ کامل صفحہ ۱۰۳ جلد ۴)

ترجمہ: ''ہم ایک ایسے شخص کے پاس سے آئے جس کا کوئی دین نہیں، جو شراب پیتا ہے، طنبورے بجاتا ہے، لونڈیاں اس کے سامنے گاتی ہیں، کتوں کے ساتھ کھیلتا ہے، رات گئے تک چور اچکے لوگ اس کے پاس بیٹھ کر داستان سرائی کرتے ہیں اور اے اہل مدینہ! ہم تمہیں گواہ بناتے ہیں کہ ہم نے اس شخص کی بیعت کا قلاوہ گردن سے اتار کر پھینک دیا ہے''۔

اس وفد کے ایک رکن حضرت زبیر کے فرزند منذر تھے۔ یہ اس وفد کے ساتھ واپس نہیں آئے بلکہ دمشق سے کوفہ گئے۔ وہاں سے مدینہ طیبہ پہنچے، یزید کے بارے میں ان کی رائے بھی ملاحظہ ہو:

اِنَّ یَزِیْدَ وَاللّٰهِ! لَقَدْ اَجَازَنِیْ بِمِائَةِ اَلْفِ دِرْهَمٍ وَاِنَّهٗ لَا یَمْنَعُنِیْ مَا صَنَعَ اِلٰی اَنْ اَخْبَرَکُمْ خَبَرَهٗ وَ اَصْدِقَکُمْ عَنْهُ وَاللّٰهِ! اِنَّهٗ لَیَشْرَبُ الْخَمْرَ وَ اِنَّهٗ لَیَسْکَرُ حَتّٰی یَدَعَ الصَّلٰوةَ وَ عَابَهٗ بِمِثْلِ مَا عَابَهٗ اَصْحَابُهُ الَّذِیْنَ کَانُوْا مَعَهٗ۔

(تاریخ کامل ص ۱۰۴ جلد ۴۔ تاریخ طبری ص ۴ جلد ۴، جزء ۷)

ترجمہ: بخدا! یزید نے مجھے ایک لاکھ درہم کا عطیہ دیا ہے، لیکن یہ عطیہ مجھے یہ کہنے سے نہیں روک سکتا کہ اس کے بارے میں سچی بات بتاؤں۔ وہ شرابی ہے۔ وہ اتنی شراب پیتا

Marfat.com

ہے کہ نشہ کی وجہ سے نماز ترک ہو جاتی ہے۔ وفد کے دوسرے ارکان نے یزید کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، انہوں نے حرف بحرف اس کی تصدیق کر دی۔

اس موقعہ پر یزید کے مداح یہ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ اور ان کے ساتھیوں نے حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے فرزند محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ کو بھی اس جہاد میں شرکت کی دعوت دی، لیکن آپ نے اسے قبول نہ کیا اور جب اس وفد کے ارکان نے یزید کے ناشائستہ اخلاق و کردار کے بارے میں کہا تو آپ نے جواب دیا: ''میں بھی یزید کے پاس رہا ہوں، میں نے کبھی اسے شراب پیتے نہیں دیکھا''۔ یہ صاحبان حضرت ابن حنفیہ رضی اللہ عنہ کا یہ قول لے کر یزید کی پاکدامنی اور پارسائی ثابت کرنے کے لیے رطب اللسان ہو جاتے ہیں حالانکہ اگر وہ یہ سوچتے کہ آپ جیسی ہستی کی موجودگی میں یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ شراب پیتا یا دیگر قبیح حرکات کرتا؟ آپ کی موجودگی میں اس کا ایسا نہ کرنا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ آپ کی غیر موجودگی میں ان حرکات سے اپنے دامن کو آلودہ نہیں کرتا ہو گا۔ بڑے بڑے رند اور مے خوار وقتی ضرورت کے مطابق زاہد و متقی بن جایا کرتے ہیں اور ہمارے پاس متعدد شواہد موجود ہیں جو اس کے کرتوتوں کی تصدیق کرتے ہیں۔

آگے پڑھنے سے پہلے ایک بات ضرور ذہن نشین کر لیجیے۔

اہل مدینہ کو کس چیز نے یزید کی بیعت توڑنے پر برانگیختہ کیا؟

یہ حادثہ کربلا کے خونین سانحہ کے بعد پیش آیا، جس میں یزیدی فوج نے حقوق نبوت، حقوق قرابت، احسان و مروت، الغرض جملہ حقوق کو پس پشت ڈال کر گلستان رسالت کو برباد کر دیا۔ اہل مدینہ کو اس بارے میں قطعاً کوئی غلط فہمی نہ تھی کہ یزید ان کے ساتھ بھی ایسا ہی ظالمانہ، بلکہ اس سے بھی بدتر سلوک کرے گا۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ یزید کی سلطنت اسلامی قلمرو کے بیشتر صوبوں میں مستحکم ہو چکی ہے۔ مدینہ طیبہ کی تنہا ایک بستی اس کا کامیاب مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ فوج، اسلحہ اور دیگر وسائل کی اس کے ہاں بڑی افراط تھی۔ مدینہ کے سارے پیر و جواں مل کر بھی اس کے لشکر کا عشر عشیر بھی نہیں بن سکتے۔ وہ اس

Marfat.com

جہاد کے انجام کو اچھی طرح جانتے تھے، اس لیے یہ کہنا حقائق سے چشم پوشی کرنا ہے کہ حضرت عبداللہ نے خود خلیفہ بننے کے لیے اور مسند اقتدار پر قابض ہونے کے لیے ایسا کیا تھا۔ ان کی طاقت اور یزید کی قوت میں توازن نام کی کوئی چیز نہ تھی، اس لیے ایک غیر جانبدار مبصر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اسلام کے سیاسی نظام اور نظریۂ خلافت کے تقدس کو محفوظ رکھنے کے لیے یہ جرأتمندانہ اقدام کیا تھا۔ سانحۂ کربلا کے بعد وہ دنیا کو پھر یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ محمد مصطفیٰ ﷺ کے غلام ایسے شخص کو اسلامی مملکت کے سربراہ اور خلیفۃ المسلمین تسلیم کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں جس میں مندرجہ بالا امور پائے جاتے ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ قلت تعداد، اسلحہ اور دیگر وسائل کے فقدان کے باوجود اہل مدینہ اپنے قائد کے ساتھ میدانِ جہاد میں مردانہ وار کود پڑے۔ دین حنیف کے ان مٹھی بھر پاسبانوں نے جس جرأت، حوصلہ اور جانثاری سے یزید کے لشکر جرار کا مقابلہ کیا اس نے بدر و حنین کی یاد تازہ کر دی۔ حضرت عبداللہ بڑی بے جگری سے لڑ رہے تھے۔ گھمسان کا رن پڑ رہا تھا۔ آپ نے اپنے جواں سال بچوں کو للکارا کہ آؤ نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے ناموس کی حفاظت کے لیے جانیں لڑا دو، سر کٹا دو۔ سعادت مند بچے اپنے مجاہد باپ کی للکار پر ایک ایک کر کے آگے بڑھتے رہے۔ عقاب کی طرح دشمن پر جھپٹتے اور جام شہادت نوش کر کے خلد بریں کو سدھارتے رہے۔ یکے بعد دیگرے آپ کے ساتوں بچوں نے اپنے سروں کا نذرانہ پیش کر دیا۔ عین اس وقت جب ان کے جگر کے ٹکڑے کٹ کٹ کر گر رہے تھے۔ اس مجاہد کی شان ایثار دیدنی تھی۔ ہاتھوں میں تلوار تھی جو بجلی کی سی تیزی کے ساتھ چل رہی تھی، خود فرطِ جوش سے یہ رجز پڑھ رہے تھے اور مجاہدین کے دلوں کو گرما رہے تھے:

بُعْدًا لِمَنْ رَامَ الْفَسَادَ وَ طغٰی وَ جَانَبَ الْحَقَّ وَ اٰیٰاتِ الْھُدٰی

لَا یُبْعِدُ الرَّحْمٰنُ اِلَّا مَنْ عَصٰی

(تاریخ کامل ص ۱۱۷ جلد ۴)

''وہ شخص برباد ہو جائے جس نے فساد کا قصد کیا اور سرکشی کی، جس نے حق کو اور ہدایت

کی آیتوں کو نظر انداز کر دیا۔ خداوند رحمٰن اسی کو ہلاک کرتا ہے جو سرکش ہوتا ہے"۔

یہ رجز پڑھتے پڑھتے انہوں نے اپنی جان، جانِ آفریں کے حوالے کر دی۔

اس رجز کے الفاظ سے بھی جو مرنے سے پہلے ان کی زبان سے گونجے، یزید کے بارے میں ان کے پہلے نظریہ کی تصدیق ہوتی ہے۔ ایک صحابی دار الآخرت کی طرف سفر کرتے وقت جو بات کہتا ہے اس میں تصنع، ریا کاری اور جھوٹ کی آمیزش نہیں ہوتی، بلکہ وہ اس کے دل کی آواز ہوتی ہے۔ آپ کا یہ رجز یزید کے بارے میں آپ کے سابقہ خیالات کی تائید کرتا ہے۔

آخر میں یزید کے بارے میں علامہ ابن کثیر کی رائے پیش کرتا ہوں جو انہوں نے یزید کی مدح اور قدح میں مذکور جملہ اقوال و آثار کا بنظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد اپنی تاریخ میں رقم کی ہے۔ یزید کے مداح بھی یہ حوالہ پیش کرتے ہیں، لیکن اس کی ابتدائی چند سطریں نقل کر کے رہ جاتے ہیں۔ میں پورا حوالہ لکھ رہا ہوں۔

اس کے مطالعہ سے حقیقت حال واضح ہو جائے گی:

وَ قَدْ كَانَ يَزِيْدُ فِيْهِ خِصَالٌ مَحْمُوْدَةٌ مِنَ الْكَرَمِ وَ الْحِلْمِ وَ الْفَصَاحَةِ وَ الشِّعْرِ وَالشُّجَاعَةِ وَ حُسْنِ الرَّأيِ فِى الْمُلْكِ وَ كَانَ ذَا جَمَالٍ، حُسْنَ الْمُعَاشَرَةِ وَ كَانَ فِيْهِ اَيْضًا اِقْبَالٌ عَلَى الشَّهَوَاتِ وَ تَرْكُ بَعْضِ الصَّلَوَاتِ فِى بَعْضِ الْاَوْقَاتِ وَ اِمَاتَتُهَا فِىْ غَالِبِ الْاَوْقَاتِ (البدایہ والنہایہ ص ۲۳۰ جلد ۸)

ترجمہ: یزید میں چند عمدہ صفات بھی تھیں: سخاوت، حلم، فصاحت، شعر گوئی، شجاعت، ملکی امور میں حسن رائے، وہ خوش شکل تھا، لوگوں سے اچھا برتاؤ کرتا تھا، اس کے باوجود اس میں یہ عیوب بھی تھے: وہ شہوات نفسانی کا گرویدہ تھا، بعض دفعہ نماز بھی نہیں پڑھا کرتا تھا اور جب نماز پڑھا کرتا تو اکثر وقت گزرنے کے بعد۔

اسی کتاب کے صفحہ ۲۳۵ پر علامہ ابن کثیر یزید کے بارے میں لکھتے ہیں:

قَدْ رُوِیَ اَنَّ يَزِيْدَ كَانَ قَدِ اشْتَهَرَ بِالْمَعَازِفِ وَ شُرْبَ الْخَمْرِ وَ الْغِنَا

وَالصَّیْدَ وَاتِّخَاذِ الْغِلْمَانِ وَالْقِیَانِ وَالْکِلَابِ وَالنِّطَاعِ بَیْنَ الْکِبَاشِ۔ وَالذِّیَابِ وَالْقُرُوْدِ وَ مَا مِنْ یَوْمٍ اِلَّا یُصْبِحُ فِیْهِ مَخْمُوْرًا۔ (البدایہ والنہایہ ص ۲۳۵، جلد ۸)

''یعنی یزید ان باتوں میں بڑی شہرت کا مالک تھا۔ گانا بجانا، میخواری، غنا، شکار، لونڈے لونڈیاں رکھنا، کتے پالنا، مینڈھوں، ریچھوں، بندروں کے درمیان کشتی کرانا۔ وہ جب صبح کو بیدار ہوتا تو شراب کے نشے میں مست ہوتا۔

یہ ہے یزید، جس کے بارے میں بادشاہ سے زیادہ وفادار زیاد کی رائے اور دیگر حضرات کی آراء آپ پڑھ آئے ہیں۔ ان اقوال کے آئینے میں یزید کی داغدار سیرت کے خدوخال آپ باآسانی دیکھ سکتے ہیں۔ ایسے شخص کی مدح وستائش میں آج کتابیں لکھی جارہی ہیں، پمفلٹ شائع کیے جارہے ہیں، تقریریں کی جارہی ہیں اور قیامت بالائے قیامت یہ ہے کہ اس کو ایک ایسی شخصیت پر فضیلت دینے کی ناکام کوشش کی جارہی ہے جس کا نام حسین رضی اللہ عنہ ہے فداہ ابی وامی۔ جس کا ذکر پاک سن کر مردہ دل زندہ ہو جاتے ہیں، جس کی داستانِ جہاد کے مطالعہ سے پژمردہ حوصلے اور افسردہ ولولے زندہ ہو جاتے ہیں اور باطل سے ٹکر لینے کی آرزو بے چین کر دیتی ہے، وہ حسین رضی اللہ عنہ، جس کے بارے میں محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

عَنْ اُسَامَةَ بْنِ زَیْدٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ کَانَ یَاْخُذُهٗ وَالْحَسَنُ یَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اُحِبُّهُمَا فَاَحِبَّهُمَا۔

''اسامہ بن زید کہتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حسن وحسین رضی اللہ عنہما کو گلے لگا لیتے اور پھر یہ دعا فرماتے: اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں، تو بھی ان سے محبت فرما''۔

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ! هُمَا رَیْحَانَتَایَ مِنَ الدُّنْیَا۔

(باب المناقب، بخاری ص ۵۳۰ ج ۱)

''آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس دنیا کے باغ سے یہ میرے دو پھول ہیں''۔

ترمذی کی کثیر احادیث میں سے صرف ایک حدیث سماعت فرمائیے:

Marfat.com

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلّٰی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: اَلْحَسَنُ وَالْحُسَیْنَ سَیِّدَا شَبَابِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ۔ (1)

''کہ حسن اور حسین، جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہما''۔

یہ تو ہوا یزید کی شخصی زندگی کا ایک ورق۔

یزید بحیثیت حکمران

اگرچہ یورپ کے ماہرین سیاست یہ کہتے ہیں کہ ہمیں کسی کی شخصی زندگی سے سروکار نہیں، ہم تو اس کو ان اعمال کی کسوٹی پر پرکھیں گے جن کا تعلق قوم اور ملک سے ہے۔ اسلام اس تفریق کا قائل نہیں۔ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا باہم چولی دامن کا ساتھ ہے، دونوں ایک دوسرے سے متاثر ہوتی ہیں اور ایک دوسرے پر اثر بھی کرتی ہیں، لیکن آیئے! ان صاحبان کے ممدوح ''یزید'' کے ان کارناموں پر بھی سرسری نظر ڈالیں جو بحیثیت حکمران اس نے انجام دیے اور یہ دیکھیں کہ اس مجاہد اور بطل جلیل نے اسلام اور ملت اسلامیہ کی کون کون سی سنہری خدمات انجام دی ہیں جن کے صلہ میں یہ حضرات اسے خلیفۂ راشد کہنے پر مصر ہیں۔

سب سے پہلے سانحۂ کربلا کو لیجئے، کیونکہ یزید کی حکومت کا آغاز اسی خونی حادثہ سے ہوا۔ مجھے اس وقت ابن زیاد اور اس کے لشکر کی ستم کیشیوں اور جفا کاریوں سے بحث مطلوب نہیں۔ اس سانحہ سے یزید کا جہاں تک براہِ راست تعلق ہے اس پر بحث کرنا ہے۔ آپ خود فیصلہ فرمائیں کہ یزید پر اس واقعہ کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے یا نہیں۔

یزید نے ابن زیاد کو کوفہ کا گورنر مقرر کیا اور اسے حکم دیا کہ مسلم بن عقیل کو جہاں پاؤ قتل کر دو۔ (1) (تاریخ طبری ص ۱۹۴ جلد ۳، جز ۶)

امام مسلم کو عبدالرحمن نامی ایک کوفی دھوکہ سے پکڑ کر لے آیا اور ابن زیاد کے سامنے پیش کر دیا۔ ابن زیاد نے حکم دیا کہ انہیں محل کی سب سے اونچی چھت پر لے جاؤ۔ وہاں ان

1۔ جامع ترمذی، باب مناقب الحسن والحسین، جلد 2، صفحہ 218

Marfat.com

کا سر قلم کر دو اور ان کے دھڑ کو اتنی بلندی سے گلی میں پھینک دو، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

اَمَرَ یَزِیْدُ بِقَتْلِ مُسْلِمٍ فَکَتَبَ اِلَیْهِ اَنْ یَطْلُبَ مُسْلِمَ بْنُ عَقِیْلٍ فَیَقْتُلَهٗ اِنْ وَجَدَهٗ فَجَاءَ بِمُسْلِمٍ اِلٰی عُبَیْدِ اللّٰهِ فَاَمَرَ بِهٖ فَاُصْعِدَ اِلٰی اَعْلَی الْقَصْرِ فَضَرَبْتُ عُنُقَهٗ وَاَلْقٰی جُثَّتَهٗ اِلَی النَّاسِ وَ اَمَرَ بِهَانِی فَسُحِبَ اِلَی الْکِنَاسَةِ فَصُلِبَ هُنَالِکَ۔ (طبری ص ۱۹۶ جلد ۳، جز ۶)

”ابن زیاد کے حکم سے ہانی کو بھی گھسیٹ کر لے گئے جہاں غلاظت کا ڈھیر تھا، وہاں لے جا کر انہیں سولی دے دی گئی“۔

تاریخ کامل میں ہے:

وَ بَعَثَ اِبْنُ زِیَادٍ بِرَأْسِ مُسْلِمٍ وَ هَانِی اِلٰی یَزِیْدَ فَکَتَبَ اِلَیْهِ یَزِیْدُ یَشْکُرُهٗ۔ (الکامل فی التاریخ صفحہ ۳۶، جلد ۴)

”پھر ابن زیاد نے ان دونوں شہیدانِ وفا کے سروں کو کوفہ سے دمشق یزید کے پاس بھیجا۔ (یزید کو اس سانحۂ فاجعہ پر ذرا دکھ نہ ہوا) بلکہ اس نے ابن زیاد کو خط لکھا جس میں اس نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ (گویا دو غیر مسلح افراد کو قتل کر کے اس نے شجاعت و بہادری کا ایک نادر نمونہ پیش کیا ہے)“۔

یہ حضرات کہتے ہیں کہ خاندانِ نبوت کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کی ساری ذمہ داری ابن زیاد پر عائد ہوتی ہے، یزید تو وہاں سے صدہا میل دور دمشق میں تھا۔ جو کچھ ہوا اس کے حکم کے بغیر ہوا اور اس کے علم کے بغیر ہوا۔ یزید کو جب اس حادثہ کا علم ہوا تو وہ بہت آزردہ ہوا اور رویا۔ اس کے محل میں مجلس ماتم برپا ہوئی جو تین دن تک جاری رہی۔ جس سے اس رنج و اندوہ کا پتہ چلتا ہے جو اس المناک واقعہ پر یزید کو ہوا۔

کاش! ایسا ہی ہوتا، لیکن تاریخ کے صفحات اس کے بالکل برعکس کہانی بیان کرتے ہیں۔ میدان کربلا میں جو لرزہ خیز اور شرمناک واقعات رونما ہوئے انہیں وہیں رہنے دیجئے۔ چلیے نیزوں کی انیوں پر آویختہ شہدائے گرامی کے سروں کے جلوس کے ساتھ چلئے۔

Marfat.com

اہل بیعت کی غمزدہ خواتین کے کارواں کے ساتھ، ہم آپ کو شام لے چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس سانحہ پر یزید کا پہلا اور حقیقی ردِ عمل کیا تھا۔ علامہ ابن جریر کی عبارت ملاحظہ ہو:

اَوْ فَدَهُ اِلٰی یَزِیْدَ بْنِ مُعَاوِیَةَ وَ مَعَهُ الرَّأْسُ فَوَضَعَ رَأْسَهُ بَیْنَ یَدَیْهِ وَ عِنْدَهُ اَبُوْ بَرْزَةَ الْاَسْلَمِیُّ فَجَعَلَ یَنْکُتُ بِالْقَضِیْبِ عَلٰی فِیْهِ وَ یَقُوْلُ:

یُفَلِّقْنَ هَامًا مِنْ رِجَالٍ اَعِزَّةٍ　عَلَیْنَا وَ هُمْ کَانُوْا اَعَقَّ وَ اَظْلَمَا

فَقَالَ لَهُ اَبُوْ بَرْزَةَ اِرْفَعْ قَضِیْبَکَ فَوَاللّٰهِ! لَرُبَّمَا رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ عَلٰی فِیْهِ یَلْثِمُهُ۔ (تاریخ طبری ص ۲۲۰ جلد ۳، جز ۶)

''ابن زیاد نے قاتل حسین کے ہاتھ آپ کے سر مبارک کو یزید کے پاس بھیجا۔ اس نے وہ سر مبارک یزید کے سامنے رکھ دیا۔ ایک صحابی ابو برزہ اسلمی وہاں موجود تھے۔ یزید ایک چھڑی سے آپ کے لب ہائے لعلین پر کچوکے دینے لگا اور یہ شعر پڑھنے لگا: انہوں نے ایسے آدمیوں کی کھوپڑیوں کو پھاڑ دیا جو ہمیں عزیز تھے، لیکن وہ بہت نافرمان اور ظالم تھے۔ ابو برزہ پیرانہ سالی کے باوجود اس گستاخی کو برداشت نہ کر سکے اور فرمایا: اے یزید! اپنی چھڑی کو پرے ہٹا لو۔ بخدا! میں نے بکثرت حضور ﷺ کو اس منہ کو چومتے ہوئے دیکھا ہے''۔

علامہ ابن اثیر نے اس واقعہ کو ذرا تفصیل سے لکھا ہے:

ثُمَّ اَذِنَ لِلنَّاسِ فَدَخَلُوْا عَلَیْهِ وَالرَّأْسُ بَیْنَ یَدَیْهِ وَ مَعَهُ قَضِیْبٌ وَ هُوَ یَنْکُتُ بِهِ ثَغْرَهُ ثُمَّ قَالَ اِنَّ هٰذَا وَ اِیَّانَا کَمَا قَالَ الْحُصَیْنُ بْنُ الْحُمَامِ:

اَبٰی قَوْمُنَا اَنْ یُّنْصِفُوْنَا فَاَنْصَفَتْ
قَوَاضِبُ فِیْ اَیْمَانِنَا تَقْطُرُ الدِّمَا
یُفَلِّقْنَ هَامًا مِنْ رِجَالٍ اَعِزَّةٍ
عَلَیْنَا وَ هُمْ کَانُوْا اَعَقَّ وَ اَظْلَمَا (1)

1۔ الکامل فی التاریخ، جلد 4، صفحہ 85

Marfat.com

''جب اس کے پاس سر مبارک رکھا گیا تو اس نے لوگوں کو دربار میں آنے کا اذنِ عام دیا۔ جب لوگ جمع ہو گئے تو اس نے ایک چھڑی سے آپ کے دندانِ مبارک پر ضربیں لگانا شروع کیں اور ساتھ ہی کہنے لگا: بے شک ان کی اور ہماری حالت ایسی ہی ہے جیسے ایک شاعر نے کہا تھا: ہماری قوم نے انکار کیا کہ ہمارے ساتھ انصاف کریں تو ہماری تلواروں نے انصاف کیا جو دائیں ہاتھ میں تھیں اور ان سے خون ٹپک رہا تھا۔ ان تلواروں نے ان لوگوں کی کھوپڑیوں کو پھاڑ دیا جو ہمیں عزیز تھے لیکن وہ بڑے نافرمان اور ظالم تھے''۔

اب آپ غور فرمائیے کہ جو شخص نواسۂ رسول ﷺ کے کٹے ہوئے سر مبارک کو یوں اپنے سامنے رکھنے کی جسارت کرتا ہے اور لوگوں پر اپنی قوت کی دھاک بٹھانے کے لیے انہیں یہ روح فرسا منظر دیکھنے کی عام اجازت دیتا ہے پھر وہ گستاخ چھڑی سے ان ہونٹوں پر چوٹیں لگاتا ہے، جن کو اللہ کا محبوب بکثرت چوما کرتا تھا اور پھر وہ اپنی شوکت کو نمایاں کرنے کے لیے ایسے متکبرانہ شعر پڑھتا ہے۔ کیا اس شخص کے بارے میں یہ خیال کرنا انتہائی سادگی بلکہ انتہائی بیہودگی نہیں کہ اسے اس سانحہ پر رنج تھا اور وہ بڑا افسردہ اور پژمردہ ہوا؟

حضرت ابو برزہ اسلمی وہاں بیٹھے تھے۔ اس گستاخانہ منظر کی تاب نہ لا سکے اور فوراً جھڑک دیا۔ آخر میں فرمایا: یہ وہ ہونٹ ہیں جو نبی کریم ﷺ کی بوسہ گاہ تھے۔ اے یزید! جب تو قیامت کے دن آئے گا تو تیرا شفیع ابن زیاد ہو گا اور جب یہ تشریف لائیں گے تو ان کے جد کریم محمد مصطفیٰ ﷺ ان کے شفیع ہوں گے۔ پھر آپ اس محفل سے نکل گئے تھے۔

مؤرخین نے اس راز سے پردہ اٹھاتے ہوئے یہ تصریح کی ہے:

فَجَهَّزَهُمْ (اِبْنُ زِيَادٍ) وَ حَمَلَهُمْ اِلَى يَزِيْدَ فَلَمَّا قَدِمُوْا عَلَيْهِ جَمَعَ مَنْ كَانَ بِحَضْرَتِهٖ مِنْ اَهْلِ الشَّامِ ثُمَّ اَدْخَلُوْهُمْ فَهَنَّئُوْا بِالْفَتْحِ۔

(تاریخ طبری ص ۲۲۱ جلد ۳۔ البدایہ ص ۱۹۷ جلد ۸)

''ابن زیاد نے اس لٹے پٹے قافلہ کو تیار کیا اور یزید کی طرف بھیجا۔ جب وہ دمشق پہنچے تو یزید نے ملک شام کے رؤسا کو اپنے دربار میں اکٹھا کیا پھر اس بھری محفل میں خاندان

نبوت کی مستورات اس کے سامنے پیش کی گئیں اور اس کے درباریوں نے یزید کو اس فتح پر مبارک باد پیش کی''۔

خود ہی سوچیے جو شخص دربارِ عام لگاتا ہے، ملک شام کے ہر قابل ذکر آدمی کو وہاں جمع کرتا ہے اور وہ اس کی خدمت میں اس فتح پر اسے مبارکیں پیش کرتے ہیں اور وہ ظالم اس بھرے دربار میں پردہ دار خواتین کو پیش کرنے کا حکم دیتا ہے۔ کیا ہم اس کے باوجود ان دوستوں کی بات مان لیں کہ یزید کو اس واقعہ پر بہت صدمہ ہوا۔ بعض روایات میں یہ مذکور ہے کہ یزید نے بڑے افسوس کا اظہار کیا اور آنسو بھی بہائے اور ابن زیاد کو برا بھلا بھی کہا، لیکن اس ڈرامے سے علامہ ابن اثیر نے یہ کہہ کر پردہ اٹھا دیا:

لَمَّا وَصَلَ رَأْسُ الْحُسَيْنِ إِلَى يَزِيْدَ حَسُنَتْ حَالُ ابْنُ زِيَادٍ عِنْدَهُ وَزَادَهُ وَوَصَلَهُ وَ سَرَّهُ مَا فَعَلَ ثُمَّ لَمْ يَلْبَثْ إِلَّا يَسِيْراً حَتّٰى بَلَغَهُ بُغْضُ النَّاسِ لَهُ وَ لَعَنَهُمْ وَ سَبُّهُمْ فَنَدِمَ عَلَى قَتْلِ الْحُسَيْنِ۔ (تاریخ کامل ص ۸۷ ج ۴)

جب شہید کربلا کا سر مبارک یزید کے پاس پہنچا تو یزید کے دل میں ابن زیاد کی قدر و منزلت بڑھ گئی۔ اس کی عزت میں اضافہ ہو گیا۔ جو کچھ اس نے کیا تھا یزید اس پر بڑا خوش ہوا، لیکن تھوڑی دیر کے بعد اسے یہ اطلاعیں ملنے لگیں کہ لوگ اس وجہ سے اس کے خلاف بغض رکھنے لگے ہیں، اس پر لعنتیں بھیجتے ہیں اور اسے سب و شتم کرتے ہیں، تو پھر امام حسین رضی اللہ عنہ کے قتل پر اس کو ندامت ہوئی۔

پھر اس نے کہا:

فَبَغَضَنِیْ بِقَتْلِهٖ إِلَى الْمُسْلِمِيْنَ وَ زَرَعَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعَدَاوَةَ فَابْغَضَنِیْ الْبَرُّوَ الْفَاجِرُ بِمَا اسْتَعْظَمُوْهُ مِنْ قَتْلِی الْحُسَيْنَ، مَالِیْ وَ لَا بْنِ مَرْجَانَةَ لَعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيْهِ۔ (1)

''ابن زیاد نے آپ کو شہید کر کے مجھے مسلمانوں کی نگاہوں میں مبغوض بنا دیا ہے۔

1۔ الکامل فی التاریخ، جلد 4، صفحہ 87

Marfat.com

ان کے دلوں میں میری عداوت بھر دی ہے اور ہر نیک و برا شخص میرے ساتھ بغض کرنے لگا ہے، کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ امام حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کر کے میں نے بڑا ظلم کیا ہے۔ خدا ابن زیاد پر لعنت کرے اور اس پر اپنا غضب نازل کرے، اس نے مجھے برباد کر دیا''۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ یزید ابتدا میں بڑا خوش ہوا کہ اس کا مدمقابل قتل کر دیا گیا ہے، لیکن جب اسے اپنی رسوائی اور بدنامی کا احساس ہوا، تو پھر اسے خجالت و ندامت ہوئی اور لوگوں پر یہ ظاہر کرنے کے لیے اس نے آنسو بہائے، لیکن وہ آنسو مگرمچھ کے تھے۔

اس دربارِ عام میں ایک اور المناک سانحہ پیش آیا جو یزید کی بد باطنی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اسی دربار میں ایک شامی کھڑا ہوا اور حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہمشیرہ زینب کی طرف اشارہ کر کے یزید کو کہنے لگا کہ یہ مجھے بخش دو۔ معصوم سیدہ یہ بات سن کر کانپ گئیں اور اپنی ہمشیرہ کے دامن کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا شیرنی کی طرح گرجیں اور فرمایا: اے شامی! تو جھوٹ بکتا ہے، تو لعین اور کمینہ ہے۔ یہ پاک شہزادی نہ تجھے مل سکتی ہے اور نہ اس تیرے یزید کو۔

فَغَضِبَ یَزِیْدُ وَ قَالَ کَذَبْتِ وَاللّٰہِ! اِنَّ ذٰلِکَ لِیْ وَلَوْ شِئْتُ اَنْ اَفْعَلَہٗ لَفَعَلْتُہٗ

یزید حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی بات سن کر غصے سے بے قابو ہو گیا اور کہنے لگا: زینب تم جھوٹ کہتی ہو۔ بخدا! یہ میرے قبضہ میں ہے، اگر میں اسے شامی کو دینا چاہوں تو دے سکتا ہوں۔

قَالَتْ کَلَّا! وَاللّٰہِ مَا جَعَلَ اللّٰہُ لَکَ ذٰلِکَ اِلَّا اَنْ تَخْرُجَ مِنْ مِلَّتِنَا وَ تَدِیْنَ بِغَیْرِ دِیْنِنَا۔ (1)

حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے جوش سے فرمایا: ہرگز نہیں، بخدا! تمہیں ایسا کرنے کا اللہ تعالیٰ نے ذرا حق نہیں دیا، بجز اس کے کہ تم اعلانیہ ہماری ملت سے نکل جاؤ اور ہمارے

1۔ الکامل فی التاریخ، جلد 4، صفحہ 86

Marfat.com

دین اسلام کو چھوڑ کر اور دین کو قبول کرنے کا اعلان کر دو۔

ان واقعات کو پڑھنے کے بعد اگر کوئی شخص اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ یزید کے دل میں خانوادۂ نبوت کی قدر و منزلت تھی تو اسے ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ دربارِ عام میں خاندانِ نبوت کی شہزادیوں کو عام لوگوں کے روبرو پیش کرنا ہی اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ یزید کے دل میں خاندانِ نبوت کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی۔ وہ نبی رحمت ﷺ جو اپنے دشمن کی بیٹی کو بھی ننگے سر دیکھتے تو اپنی چادر مبارک اتار کر اس پر ڈال دیتے۔ یزید کو شرم نہ آئی کہ حضور کی نواسیوں کو یوں بھرے دربار میں پیش کرنے کی جرأت کی۔ اگر یہ خلیفۂ راشد ہے تو ظالم اور جابر کس کو کہتے ہیں؟

اگر ایک لمحہ کے لیے یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یزید کے حکم اور اس کے علم کے بغیر ابن زیاد نے یہ قیامت صغریٰ برپا کی تو جب یزید کو اس قتل عام کا علم ہوا تو اس کے بعد اس نے ابن زیاد، ابن سعد، شمر وغیرہم کے خلاف کیا کارروائی کی؟ کیا اس نے قصاص لیا؟ اگر ایک غریب مسلمان بھی قتل کر دیا جائے تو حاکم کا فرض ہے کہ قاتل سے قصاص لے۔ یہاں تو معاملہ خاندانِ نبوت کا ہے۔ خاندانِ نبوت کے صرف ایک فرد کا نہیں، بلکہ ایک ایک فرد کا ہے جو یزید کی تیغ جفا کا شکار ہوئے۔ اگر قصاص نہیں لیا تھا تو کم از کم ان کو بطورِ سزا ان کے عہدوں سے برطرف کر دیا ہوتا، لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ان سے کوئی قصاص لیا گیا، نہ ان ظالموں کو ان کے عہدوں سے برطرف کیا گیا اور نہ ہی ان کو سرزنش اور ملامت کا کوئی خط تک لکھا۔ ان حالات میں ایک بچہ بھی بآسانی یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ جو کچھ ہوا یزید کی اجازت اور حکم سے ہوا اور وہ اس پر مطمئن تھا۔

یزید کے عہد حکومت کا یہ پہلا کارنامہ ہے جس نے اسلام کی تاریخ کو خون میں ڈبو دیا اور کئی ہولناک فتنوں کے لیے راہ ہموار کر دی۔ اس ''خلیفۂ راشد'' کا دوسرا کارنامہ ملاحظہ ہو:

آپ پہلے ان حالات کو پڑھ آئے ہیں جن کی وجہ سے اہل مدینہ نے یزید کی بیعت کو فسخ کیا اور تمام عواقب و نتائج سے بے نیاز ہو کر میدانِ جہاد میں کود پڑے۔ اب ذرا وہ الیہ

Marfat.com

ملاحظہ ہو جو اس نے رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شہر اور اس میں بسنے والوں کے ساتھ روا رکھا۔ وہ مدینہ اور اہل مدینہ، جس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا:

لَا یَکِیْدُ اَهْلَ الْمَدِیْنَةِ اَحَدٌ اِلَّا انْمَاعَ کَمَا یَنْمَاعُ الْمِلْحُ فِی الْمَاءِ۔ (1)

''حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص اہل مدینہ کے ساتھ مکر و فریب کرے گا۔ وہ یوں گل جائے گا جس طرح نمک پانی میں گلتا ہے''۔

امام مسلم نے اپنی صحیح میں یہ حدیث روایت کی ہے:

قَالَ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ! لَا یُرِیْدُ اَحَدٌ اَهْلَ الْمَدِیْنَةِ بِسُوْءٍ اِلَّا اَذَابَهُ اللّٰهُ فِی النَّارِ ذَوْبَ الرَّصَاصِ اَوْ ذَوْبَ الْمِلْحِ فِی الْمَاءِ۔ (2)

''جو شخص اہل مدینہ کے بارے میں برائی کا ارادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے آگ میں اس طرح پگھلا دے گا جس طرح قلعی پگھلتی ہے یا نمک پانی میں گل جاتا ہے''۔

امام احمد بن حنبل کی روایت کردہ ایک حدیث چشم ہوش کو کھولنے کے لیے کافی ہوگی۔

قَالَ عَلَیْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ! مَنْ اَخَافَ اَهْلَ الْمَدِیْنَةِ ظُلْمًا اَخَافَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی وَ عَلَیْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِکَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ۔ لَا یَقْبَلُ اللّٰهُ مِنْهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ صَرْفًا وَّلَا عَدْلاً۔ (3)

''جو شخص از راہ ظلم اہل مدینہ کو خوفزدہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے خوفزدہ کرے گا اور اس پر اللہ تعالیٰ کی، اس کے فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہو۔ قیامت کے دن اس سے کوئی بدلہ اور معاوضہ قبول نہیں کیا جائے گا''۔

اس مدینہ اور اہل مدینہ کے ساتھ یزید نے جو سلوک کیا اسے سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب اسے یہ اطلاع ملی کہ اہل مدینہ نے اس کی بیعت توڑ دی ہے تو اس نے

1۔ صحیح بخاری، باب اثم من کاد اهل المدینه، جلد 1 صفحہ 252
2۔ صحیح مسلم، باب فضل المدینه و دعا النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فیها بالبرکة وبیان تحریمها، جلد 1، صفحہ 441
3۔ مسند امام احمد، جلد 4، صفحہ 55

ایک ظالم اور جابر فوجی مسلم بن عقبہ کو اس لشکر کا سالار بنایا جو مدینہ طیبہ پر حملہ کرنے کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ یزید نے مسلم کو رخصت کرتے وقت یہ حکم دیا کہ پہلے قوم کو اس بات کی دعوت دو کہ وہ اطاعت قبول کر لے اور اگر ایسا کرے تو ان سے باز رہو اور اگر تین دن تک اطاعت قبول نہ کریں تو پھر ان سے جنگ کرو۔ اگر یزید نے اتنا ہی کہا ہوتا تو اس کی توجیہہ کی جا سکتی ہے کہ اہل مدینہ نے بغاوت کی تھی اور یزید کیونکہ وقت کا حاکم تھا، ملک میں امن و امان برقرار رکھنا اس کی ذمہ داری تھی بغاوت کو فرو کرنے کے لیے اس نے جو قدم اٹھایا وہ ناگزیر بھی تھا اور جائز بھی، لیکن یزید نے اس پر اکتفاء نہ کیا بلکہ اپنے جرنیل کو یہ حکم دیا:

وَ اِذَا ظَهَرْتَ عَلَيْهِمْ فَابِحِ الْمَدِيْنَةَ ثَلَاثًا۔ (1)

''کہ جب تم غالب آ جاؤ تو تین دن تک مدینہ کے شہر کو اپنے لشکر کے لیے مباح کر دو''

جو ان کا جی چاہے کریں، کسی کو قتل کریں، کسی کا مال لوٹیں، کسی کی آبروریزی کریں، کوئی باز پرس نہیں ہو گی، کوئی مؤاخذہ نہیں ہو گا۔ خود سوچیے کہ جو شخص مسلمانوں کی جان، مال اور آبرو کو اپنے فوجیوں کے لیے خوانِ یغما سمجھتا ہے کیا اس کے دل میں خدا کا خوف ہے؟ کیا اس کے دل میں خدا کے رسول کا احترام ہے؟ کیا اس کا قیامت پر ایمان ہے؟ کہ اسے اس روز بارگاہِ الٰہی میں پیش کیا جائے گا اور اس سے اس کی بدکاریوں کی باز پرس ہو گی۔

یزید کا یہ چنگیزی حکم لے کر مسلم، مدینہ طیبہ پر دھاوا بولتا ہے۔ اس جہاد میں اہل مدینہ نے اپنی جان سپاری کے بے نظیر کارنامے انجام دیے۔ ان کی ایک جھلک آپ پہلے پڑھ آئے ہیں۔ جب اہل مدینہ کے اکابر ایک ایک کر کے شہید ہو گئے۔ عبداللہ بن حنظلہ اپنے سات بچوں کو ناموسِ اسلام پر قربان کر کے خود بھی اپنے سر پر شہادت کا تاج سجائے دارالبقاء کو سدھار گئے اور اہل مدینہ اپنی اس مہم میں کامیاب نہ ہوئے، تو پھر خونخوار بھیڑیوں کی طرح یزیدی لشکر کے سپاہی اور افسر اس شہر گرامی میں داخل ہو گئے اور تین دن تک جو اودھم انہوں نے مچایا نہ قلم میں اتنی قوت ہے کہ وہ اسے کما حقہ بیان کر سکے اور نہ دل

1۔ البدایۃ والنہایۃ، جلد 8، صفحہ 219

Marfat.com

میں یہ تاب ہے کہ اسے سن سکے۔ ابن کثیر کی چند سطریں دل پر ہاتھ رکھ کر آپ بھی سن لیجئے:

ثُمَّ اَبَاحَ مُسْلِمُ بْنُ عُقْبَةَ الَّذِی یَقُوْلُ فِیْهِ السَّلَفُ مُسْرِفُ بْنُ عُقْبَةَ قَبَّحَهُ اللّٰهُ مِنْ شَیْخٍ سُوْءٍ مَا اَجْهَلَهُ الْمَدِیْنَةَ ثَلَاثَةَ اَیَّامٍ کَمَا اَمَرَهُ یَزِیْدُ لَا جَزَاهُ اللّٰهُ خَیْرًا وَ قَتَلَ خَلْقًا مِنْ اَشْرَافِهَا وَ قُرَّائِهَا وَانْتَهَبَ اَمْوَالًا کَثِیْرَةً مِنْهَا وَ وَقَعَ شَرٌّ عَظِیْمٌ وَ فَسَادٌ عَرِیْضٌ عَلٰی مَا ذَکَرَهُ غَیْرُ وَاحِدٍ۔ (البدایہ ص ۲۲۰ ج ۸)

"پھر مسلم بن عقبہ جسے اسلاف مسرف بن عقبہ کہتے ہیں، خدا اس کو ذلیل و رسوا کرے، وہ بڑا اجڈ اور جاہل بوڑھا تھا۔ اس نے مدینہ طیبہ کو تین دن کے لیے مباح کر دیا جس طرح یزید نے حکم دیا تھا۔ اللہ یزید کو کبھی جزائے خیر نہ دے۔ اس نے جنگ کے اختتام کے بعد وہاں کے بے شمار بزرگوں اور قاریوں کو تہ تیغ کیا۔ اہل مدینہ کے اموال کو بیدردی سے لوٹا اور جس طرح متعدد مؤرخین نے بیان کیا اس کی اس حرکت سے وہاں شر عظیم اور فساد کبیر برپا ہوا"۔

سید الانبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے تاریخ ساز خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا:

کُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَی الْمُسْلِمِ حَرَامٌ، دَمُهُ وَ مَالُهُ وَ عِرْضُهُ۔ (1)

"ہر مسلمان کا خون، اس کا مال اور اس کی آبرو دوسرے مسلمان پر حرام ہے"۔

اب یزید کو کیا حق پہنچتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی حرام کردہ چیزوں کو حلال اور مباح کرے اور اپنے لشکر کو مدینہ طیبہ کے شہریوں پر قیامت توڑنے کی اجازت دے؟

اگر آپ یزید کو خلافت راشدہ کی مسند پر بٹھانے کے لیے مصر ہوں گے تو اس داغ داغ شخصیت کو دیکھ کر لوگ اسلام سے بھی متنفر ہو جائیں گے اور یہ تصور کہ یہ دین، دین عدل و انصاف اور فضل و احسان ہے، ہمیشہ کے لیے درہم برہم ہو جائے گا۔ یزید نے جو ستم ڈھائے وہی ہمارے لیے کافی ہیں۔ اب اس کے یہ بہی خواہ اگر مزید کرم فرمائیوں سے باز آ

1۔ سنن ابن ماجہ، باب حرمۃ دم المؤمن ومالہ، صفحہ 290

Marfat.com

جائیں تو ان کی عنایت، ہوگی۔

اس سانحہ کے بارے میں علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں جسے یہاں لکھتے ہوئے قلم خجالت سے سرنگوں ہے۔

وَوَقَعُوا عَلَى النِّسَاءِ حَتّٰى قِيلَ اِنَّهُ حَبِلَتْ اَلْفُ اِمْرَاَةٍ فِيْ تِلْكَ الْاَيَّامِ مِنْ غَيْرِ زَوْجٍ فَاللّٰهُ اَعْلَمُ۔ قَالَ الْمَدَائِنِي عَنْ اَبِي قرة قَالَ قَالَ هِشَامُ بْنُ حَسَّانِ وَلَدَتْ اَلْفُ اِمْرَاَةٍ مِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ بَعْدَ وَقْعَةِ الْحَرَّةِ مِنْ غَيْرِ زَوْجٍ۔

(البدایہ ص ۲۲۱ ج ۸)

''یزید کے لشکری تین دن تک اہل مدینہ کی عصمتوں کو پامال کرتے رہے یہاں تک کہا گیا ہے۔ ان دنوں میں ہزار عورتیں ان کی اس بدمعاشی سے حاملہ ہوئیں۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم''۔

محتاط مؤرخ یہ دردانگیز حادثہ بیان کرنے کے بعد لکھنے پر مجبور ہوگیا:

وَ قَدْ اَخْطَاَ يَزِيْدُ خَطَاً فَاحِشًا فِيْ قَوْلِهٖ لِمُسْلِمِ بْنِ عُقْبَةَ اَنْ يَبِيْعَ الْمَدِيْنَةَ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ وَ هٰذَا خَطَاٌ كَبِيْرٌ فَاحِشٌ مَعَ مَا انْضَمَّ اِلٰى ذٰلِكَ مِنْ قَتْلِ خَلْقٍ مِنَ الصَّحَابَةِ وَ اَبْنَاءِ هِمْ وَ قَدْ تَقَدَّمَ اَنَّهُ قَتَلَ الْحُسَيْنَ وَ اَصْحَابَهُ عَلٰى يَدَيْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ زِيَادَ وَ قَدْ وَقَعَ فِيْ هٰذِهِ الثَّلَاثَةِ اَيَّامٍ مِنَ الْمَفَاسِدِ الْعَظِيْمَةِ فِي الْمَدِيْنَةِ النَّبَوِيَّةِ مَا لَا يُحَدُّ وَ لَا يُوْصَفُ مِمَّا لَا يَعْلَمُهُ اِلَّا اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ۔(1)

''یزید نے مسلم بن عقبہ کو تین دن تک مدینہ طیبہ کو مباح کرنے کا حکم دے کر بڑی اور فحش غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ بے شک یہ بہت بڑی اور سنگین غلطی ہے۔ مزید برآں بہت سے صحابہ کرام اور ان کے کثیر تعداد فرزند اس حادثہ میں شہید ہوئے۔ اس سے پہلے اس نے امام حسین رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھیوں کے قتل کا جریمہ کیا۔ اللہ تعالیٰ کے نبی کے شہر میں ان تین دنوں میں وہ عظیم تباہی اور بربادی ہوئی جس کی نہ کوئی انتہا ہے، نہ اس کی تفصیل

1۔ البدایۃ والنہایۃ، جلد 8، صفحہ 222

Marfat.com

بیان کی جاسکتی ہے۔ اس کا صحیح علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے''۔

تاریخ میں اس واقعہ کو واقعۂ حرۃ کہا جاتا ہے۔ علامہ ابن کثیر اس کے ذکر کے بعد کہتے ہیں کہ یزید نے تو مسلم بن عقبہ کو اس لیے بھیجا تھا کہ وہ اس کے مخالفین کا قلع قمع کر دے گا۔ اس کی سلطنت کی بنیادیں مضبوط ہو جائیں گی۔ اس کے عہد حکومت میں اس کا کوئی مد مقابل نہ رہے گا۔

فَعَاقَبَهُ اللّٰهُ بِنَقِيْضِ قَصْدِهٖ وَ حَالَ بَيْنَهُ وَ بَيْنَ مَا يَشْتَهِيْهِ فَقَصَمَهُ اللّٰهُ قَاصِمُ الْجَبَابِرَةِ وَ اَخَذَهُ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُقْتَدِرٍ۔ (البدایہ ص ۲۲۲ جلد ۸)

''اللہ تعالیٰ نے اس کے ارادہ کے برعکس اس کو سزا دی اور جو اس نے چاہا تھا، اس کو پورا نہ ہونے دیا۔ جابروں اور فرعونوں کی کمر توڑنے والے خدا نے اس کی کمر توڑ دی اور اس کو یوں پکڑا جس طرح عزت والا اور قدرت والا پکڑا کرتا ہے''۔

اب ہم اس المناک بحث کو چھوڑ کر آگے چلتے ہیں اور اس کے تیسرے سنہری کارنامے کی طرف اس کے مداحوں کی توجہ مبذول کرتے ہیں۔

ممکن ہے اہل بیت اطہار کے متعلق ان کے دلوں میں کوئی نرم گوشہ نہ ہو اور اس مقدس خاندان پر جو قیامت ٹوٹی اس سے ان کے دلوں پر کوئی چوٹ نہ لگی ہو۔ ممکن ہے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاک شہر کی عزت و حرمت کی ان کی نگاہوں میں کوئی زیادہ اہمیت نہ ہو، لیکن کعبہ مقدسہ کے بارے میں تو شاید ان کے دلوں میں عقیدت و احترام کے جذبات موجود ہوں۔

مدینہ طیبہ کو کھنڈرات کا ڈھیر بنانے کے بعد مسلم کو حکم ملا کہ وہ مکہ مکرمہ پر حملہ کرے اور وہاں کی اینٹ سے اینٹ بجادے، چنانچہ یہ جفا کار اپنے درندہ صفت فوجیوں کو لے کر مکہ مکرمہ پر دھاوا بولنے کے لیے روانہ ہوا۔ موت کے فرشتہ نے راستہ ہی میں اس کی گردن مروڑ دی اور جہاں اسے پہنچنا تھا وہاں پہنچا دیا۔ اس کے ہلاک ہونے کے بعد حصین بن نمیر الکوفی نے لشکر کی قیادت سنبھالی اور مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوا۔ مکہ پہنچ کر باہر کھلے میدان میں قیام کیا اور جنگ شروع ہوئی۔ فریقین میں کئی مرتبہ شدید جھڑپیں ہوئیں۔ کئی ماہ تک

Marfat.com

محاصرہ جاری رہا۔ ربیع الاول ۶۴ ھ میں اس نے کعبہ مقدسہ کے بالمقابل اپنی منجنیقیں نصب کیں اور بیت اللہ شریف پر پتھر برسانے شروع کیے۔ صرف پتھر ہی نہیں پھینکے بلکہ آگ لگانے والا مادہ بھی پھینکا گیا۔ یہاں تک کہ کعبہ شریف کا غلاف بھی جل گیا اور ایک دیوار بھی گر گئی۔ اس حالت میں جب کہ یزید کا جرنیل حصین، کعبہ مقدسہ پر سنگباری کر رہا تھا اور آتش گیر مادہ پھینک رہا تھا، یزید کو موت کے فرشتے نے آدبوچا اور جب اس کے مرنے کی اطلاع اس لشکر کو پہنچی تو اپنا محاصرہ اٹھا کر بے نیل مرام خائب و خاسر شام کو لوٹ گیا۔ (1)

تین سال ساڑھے سات ماہ کی اس مختصر مدت میں تاریخ نے یزید کے جن کارناموں کو بطورِ یادگار محفوظ رکھا ہے وہ یہی واقعات ہیں۔ ہمیں اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ یزید نے کوئی نیا ملک فتح کیا ہو، کسی دشمن کے قلعہ پر قبضہ کیا ہو، اندرونِ ملک رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے اہم اقدامات کیے ہوں۔ جس شخص کی ساری زندگی کا سرمایہ گلشن خانوادۂ نبوت کی بربادی، ہجرت گاہ مصطفیٰ ﷺ کی بربادی اور کعبہ مشرفہ پر سنگباری ہو، اس کی توصیف و تعریف میں لوگ زمین و آسمان کے قلابے ملاتے رہیں، دفتروں کے دفتر سیاہ کرتے رہیں، وہ یزید کے دامن کے بدنما داغوں میں سے ایک داغ بھی نہیں دھو سکتے اور جن رفعتوں اور بلندیوں پر اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کے نواسے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو فائز کیا ہے وہاں سے انہیں ہٹایا نہیں جا سکتا۔

یزید کے محامد کا جائزہ

جب یزید کے متوالوں کو اپنے ممدوح کی سیرت میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس کی بنیاد پر وہ اس کی عظمت کا قصر تعمیر کر سکیں، تو پھر وہ اس حدیث پاک کا سہارا لیتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اَوَّلُ جَیْشٍ مِنْ اُمَّتِیْ یَغْزُوْنَ مَدِیْنَةَ قَیْصَرَ مَغْفُوْرٌ لَهُمْ۔ (2)

1۔ الکامل فی التاریخ، جلد 4، صفحہ 24-123 (ملخصا)

2۔ صحیح بخاری، باب ما قیل فی قتال الروم، جلد 1، صفحہ 410

"یعنی میری امت کا پہلا لشکر جو قیصر کے شہر پر حملہ کرے گا وہ بخشا ہوا ہے"۔

وہ کہتے ہیں کہ یزید بھی اس پہلے لشکر میں شامل تھا۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے مطابق وہ بھی مرحوم و مغفور ہے اور جنتی ہے۔

آئیے! تاریخ کے آئینے میں پہلے یہ تحقیق کر لیں کہ کیا وہ لشکر پہلا لشکر تھا جس میں یزید شامل ہوا یا اس سے پہلے بھی اسلامی مجاہدین نے قسطنطنیہ پر حملے کا شرف حاصل کیا؟

علامہ ابن کثیر کی یہ عبارت ملاحظہ فرمائیے:

وَ فِيهَا (۳۲ ھ) غزا مُعَاوِيَةُ بِلَادَ الرَّوْمِ حَتّٰى بَلَغَ الْمَضِيقَ مَضِيقَ الْقُسْطُنْطَنِيه۔ (البدایہ ص ۱۵۹ ج ۷)

یعنی ۳۲ھ میں حضرت امیر معاویہ نے مملکت روم کے شہروں پر حملہ کیا یہاں تک کہ قسطنطنیہ کی تنگ نائے تک پہنچ گئے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ پہلا لشکر یہ تھا اور اس میں یزید شامل نہیں تھا، اس کی عمر اس وقت چار پانچ سال کے لگ بھگ تھی۔

علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:

وَ دَخَلَ الْمُسْلِمُوْنَ سَنَةَ اِثْنَتَيْنِ وَ اَرْبَعِيْنَ اِلٰى بِلَادِ الرُّوْمِ فَهَزَمُوْهُمْ وَ قَتَلُوْا جَمَاعَةً مِنَ الْبَطَارِقَةِ وَاَثْخَنُوْا فِيْهَا ثُمَّ دَخَلَ بُسْرُبْنُ أَرْطَاْةَ اَرْضَهُمْ سَنَةَ ثَلَاثٍ وَّاَرْبَعِيْنَ وَ مَشٰى بِهَا وَ بَلَغَ الْقُسطنطينية۔ (ابن خلدون ص ۱۹ ج ۳)

"۴۲ھ میں مسلمان بلاد روم میں داخل ہوئے اور انہیں شکست دی اور بہت سے بطریقوں کو تہ تیغ کیا۔ پھر ۴۳ھ میں بسر بن ارطاط بلاد روم میں داخل ہوئے اور آگے بڑھتے چلے گئے یہاں تک کہ قسطنطنیہ تک جا پہنچے"۔

ابن جریر (1) اور ابن اثیر (2) نے بھی یہ قول نقل کیا ہے اور اسے واقدی کی طرف منسوب کیا ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ چند مؤرخین نے اس بات کو تسلیم نہیں کیا کہ بسر نے

1۔ تاریخ طبری، جلد 3، صفحہ 103
2۔ الکامل فی التاریخ، جلد 3، صفحہ 425

Marfat.com

بلادِ روم پر حملہ کیا ہو، لیکن ابن خلدون جیسے نقاد مؤرخ کا اس قول کو نقل کرنے پر اکتفا کرنا اس بات کی شہادت ہے کہ ابن خلدون کو اس قول کی صحت پر اعتماد ہے، لیکن اگر ان روایات کو قابل اعتنا نہ سمجھا جائے، بلکہ اس پر اصرار ہو کہ پہلا لشکر وہی تھا جس میں یزید شامل تھا۔ تو آیئے! آپ کو ایک عجیب و غریب بات بتائیں جس سے جہاد کے بارے میں یزید کے ذوق و شوق کا آپ باسانی اندازہ لگا سکیں گے۔

علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:

ثُمَّ بَعَثَ مُعَاوِيَةُ سَنَةَ خَمْسِيْنَ جَيْشًا كَثِيفًا اِلٰى بِلَادِ الرُّوْمِ مَعَ سُفْيَانَ بْنِ عَوْفٍ وَ نَدَبَ يَزِيْدَ ابْنَهُ مَعَهُمْ فَتَثَاقَلَ فَتَرَكَهُ۔ (ابن خلدون ص ١٩ ج ٣)

''۵۰ ہجری میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک لشکر جرار سفیان بن عوف کی قیادت میں بلادِ روم پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا اور اپنے بیٹے یزید کو بھی کہا کہ وہ اس میں شریک ہو، لیکن اس نے بڑی گرانی کا اظہار کیا، چنانچہ آپ نے اس کو چھوڑ دیا''۔

اس کے بعد علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:

ثُمَّ بَلَغَ النَّاسَ اَنَّ الْغُزَاةَ اَصَابَهُمْ جُوْعٌ وَ مَرَضٌ وَ بَلَغَ مُعَاوِيَةَ اَنَّ يَزِيْدَ اَنْشَدَ فِيْ ذٰلِكَ:

مَا اَنْ اُبَالِيْ بِمَا لَاقَتْ جُمُوْعُهُمْ
بِالْفَدْ فَدِ الْبِيْدِ مِنْ حُمّٰى وَ مِنْ شُوْمٍ
اِذَا اتَّطَأْتُ عَلَى الْاَنْمَاطِ مُرْتَفِقًا
بِدَيْرِ مرانَ عِنْدِيْ اُمُّ كُلْثُوْمٍ

(هِيَ اِمْرَاَتُهُ) فَحَلَفَ لَيَلْحَقَنَّ بِهِمْ فَسَارَ فِيْ جَمْعٍ كَثِيْرٍ۔

(ص ٢٠ ج ١٣ ابن خلدون)

''پھر لوگوں کو یہ اطلاع ملی کہ اس لشکر میں جو مجاہدین شریک ہوئے تھے انہیں بھوک اور بیماری نے ہلاکا کر دیا ہے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ بھی بتایا گیا کہ جب اس لشکر کی

Marfat.com

خستہ حالی کی اطلاع یزید کو پہنچی تو اس نے یہ رباعی پڑھی:

مجھے اس بات کی قطعاً کوئی پروا نہیں ہے کہ بخار اور بدقسمتی کی وجہ سے اس کھلے صحرا میں ان کے لشکروں پر کیا گزری۔

جب کہ میں نرم و گداز قالینوں پر دیر مران میں بیٹھا ہوا ہوں اور میرے پہلو میں ام کلثوم موجود ہے۔ (یہ یزید کی بیوی تھی)۔

تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کو قسم دے کر اسے مجبور کیا کہ وہ ہر قیمت پر لشکر میں شریک ہو۔ یہی واقعہ بعینہٖ کامل ابن اثیر میں بھی موجود ہے۔ (تاریخ کامل ص ۵۸ ۴ ج ۳)

یہ پڑھنے کے بعد روزِ روشن کی طرح آپ پر عیاں ہو گیا ہوگا کہ یزید کے دل میں جہاد کا کتنا جذبہ تھا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے مجبور کرنے کے باوجود بھی اس نے جانا گوارا نہ کیا۔ صرف یہی نہیں، بلکہ ان مجاہدین کی بھی اس کے دل میں کوئی قدر و منزلت نہ تھی۔ قدر و منزلت تو رہی اپنی جگہ، اس کے ان شعروں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے دل میں ان غازیوں کے لیے ہمدردی کا جذبہ بھی مفقود تھا، بلکہ وہ ان کا مذاق اڑاتا تھا اور اپنی بزم طرب کو اس جہاد پر ترجیح دیتا تھا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اس کی رباعی سن کر بے تاب ہو جاتے ہیں اور اس کو قسم دے کر مجبور کرتے ہیں کہ وہ ضرور اس مہم میں شریک ہو۔

مجاہد وہ نہیں ہوتا جسے زنجیروں میں باندھ کر میدانِ جہاد میں ڈال دیا جائے۔ ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے حضور میں جس قسم کے اجر کا مستحق ہوتا ہے اس کا آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ اس غزوہ میں یزید کی شرکت طوعاً نہ تھی بلکہ کرہاً تھی۔ وہ اللہ تعالیٰ کے نام کو بلند کرنے کی نیت سے گھر سے نہیں نکلا تھا بلکہ اپنے والد بزرگوار کے اصرار نے اس کے لیے فرار کی ساری راہیں بند کر دی تھیں۔ اگر اس قسم کے آدمی کو آپ اس زمرہ میں شمار کرتے ہیں جن کے لیے زبانِ نبوت نے مغفور لھم کا مژدہ سنایا ہے تو ہم آپ کی فراخ دلی کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

نیز حضور کا یہ ارشاد "مغفور لھم" عام ہے، لیکن اگر کوئی خاص دلیل پائی جائے تو اس عموم

Marfat.com

میں داخل افراد کو اس خاص دلیل سے نکالا جا سکتا ہے، جیسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ" (1)

کہ جس شخص نے بھی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا وہ جنت میں داخل ہوگا، لیکن اگر وہ صرف زبان سے کہتا ہے دل سے نہیں کہتا تو وہ اس بشارت کا مستحق نہیں ہوگا اور اگر وہ ایک مرتبہ دل سے بھی کہتا ہے، لیکن بعد میں مرتد ہو جاتا ہے، تو وہ بھی اس بشارت سے خارج ہو جائے گا۔ یہاں بھی اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ یزید اس پہلے لشکر میں جہاد کی نیت سے شریک ہوا، تب بھی اس کے بعد جو سیاہ کاریاں اپنے عہد حکومت میں اس سے سرزد ہوئیں، ان میں سے ہر ایک اس کو اس بشارت سے خارج کرنے کے لیے کافی ہے۔

علامہ بدرالدین عینی اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مہلب اور اس کے دوسرے ہم مشرب لوگوں نے اس حدیث کو یزید کے لیے بطورِ منقبت ذکر کیا ہے۔

قُلْتُ اَیُّ مَنْقَبَةٍ کَانَتْ لِیَزِیْدَ وَ حَالُهٗ مَشْهُوْرٌ۔

"یزید کے لیے اس حدیث میں تعریف کا کون سا پہلو ہے جب کہ اس کی کارستانیاں اظہر من الشمس ہیں"۔ علامہ موصوف اس کے بعد لکھتے ہیں:

لَا یَخْتَلِفُ اَهْلُ الْعِلْمِ اَنَّ قَوْلَهٗ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَغْفُوْرٌ لَهُمْ، مَشْرُوْطٌ بِاَنْ یَکُوْنُوْا مِنْ اَهْلِ الْمَغْفِرَةِ حَتّٰی لَوِ ارْتَدَّ وَاحِدٌ مِّمَّنْ غَزَاهَا بَعْدَ ذٰلِکَ لَمْ یَدْخُلْ فِیْ ذٰلِکَ الْعُمُوْمِ فَدَلَّ عَلٰی اَنَّ الْمُرَادَ مَغْفُوْرٌ لِمَنْ وُجِدَ شَرْطُ الْمَغْفِرَةِ فِیْهِ"۔

"یعنی اہل علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضور کا یہ ارشاد "مغفور لهم" اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ مغفرت کے مستحق ہوں، یہاں تک کہ اگر کوئی شخص ان میں سے مرتد ہو جاتا ہے تو وہ اس عموم میں داخل نہیں ہوگا۔ پس معلوم ہوا کہ مغفور وہی ہوگا جس میں مغفرت کی شرط پائی جائے گی"۔ (عمدۃ القاری، کتاب الجہاد، ج ۱۲، ص ۱۰)

1۔ کنز العمال، باب فی فضل الشہادتین، جلد 1 صفحہ 298، مکتبۃ التراث الاسلامی حلب اقول

Marfat.com

علامہ قسطلانی نے بھی اپنی "ارشاد الساری" شرح بخاری میں یہی عبارت نقل کی ہے اور انہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ (ارشاد الساری ج ۵ ص ۱۲۴)

کیا یزید لعنت کا مستحق ہے؟

یزید کے طرف دار اس سلسلہ میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ پیش کرتے ہیں کہ آپ نے یزید پر لعنت کرنے سے منع کیا ہے۔

گزارش ہے کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اپنی رفعت شان اور علو مقام کے باوجود امامِ مجتہد نہیں، بلکہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مقلد ہیں اور یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ جب امام اور اس کے مقلد کے اقوال میں تعارض آجائے تو ترجیح امام کے قول کو دی جائے گی۔

علامہ ابن خلکان نے اپنی مشہور کتاب "وفیات الاعیان" جلد دوم صفحہ ۴۴۹ میں ابوالحسن علی بن محمد المعروف بالکیا الہراسی الفقیہ الشافعی جو عماد الدین کے لقب سے ملقب تھے، کا فتویٰ نقل کیا ہے جو درج ذیل ہے:

وَ سُئِلَ الْكِيَا الْهِراسِي اَيْضًا عَنْ يَزِيْدَ بْنَ مُعَاوِيَةَ فَقَالَ اِنَّهُ لَمْ يَكُنْ مِنَ الصِّحَابَةِ لِاَنَّهُ وُلِدَ فِيْ اَيَّامِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُ وَ اَمَّا قَوْلُ السَّلَفِ فِيْ لَعْنِهٖ فَفِيْهِ لِاَحْمَدَ قَوْلَانِ تَلْوِيْحٌ وَ تَصْرِيْحٌ وَ لِمَالِكٍ قَوْلَانِ تَلْوِيْحٌ وَ تَصْرِيْحٌ وَ لِاَبِيْ حَنِيْفَةَ قَوْلَانِ تَلْوِيْحٌ وَ تَصْرِيْحٌ وَ لَنَا قَوْلٌ وَاحِدٌ التَّصْرِيْحُ دُوْنَ التَّلْوِيْحِ وَ كَيْفَ لَا يَكُوْنَ كَذٰلِكَ؟ وَهُوَ اللَّاعِبُ بِالنَّرْدِ وَالْمُتَصَيِّدُ بِالفهودِ وَ مُدْمِنُ الْخَمْرِ وَ شِعْرُهٗ فِى الْخَمْرِ مَعْلُوْمٌ ...... الخ (1)

"الکیا الہراسی سے یزید کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے جواب دیا کہ وہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے نہیں تھا، کیونکہ اس کی ولادت عہد فاروقی میں ہوئی اور اس پر لعنت بھیجنے میں سلف صالحین سے یہ منقول ہے۔ اس بارے میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے دو قول ہیں کہ تلویح اور تصریح یعنی کنایۃ لعنت یا صراحۃ لعنت۔ امام مالک کے بھی دو قول

1۔ وفیات الاعیان، جلد 2، صفحہ 49-448، مکتبہ نہضہ مصریہ قاہرہ

Marfat.com

ہیں۔ تلویح اور تصریح۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بھی دو قول ہیں تلویح اور تصریح۔ اور ہمارا (یعنی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ) کا ایک ہی قول ہے یعنی تصریح۔ اس پر صراحۃً لعنت بھیجی جائے اور ایسے کیوں نہ کیا جائے؟ جبکہ وہ شطرنج کھیلتا تھا، لومڑیوں کے لیے شکار کھیلتا تھا، ہمیشہ شراب پیتا تھا اور شراب کی تعریف میں اس کے اشعار مشہور و معروف ہیں''۔

چنانچہ انہوں نے چند اشعار بھی لکھے ہیں۔

گویا ائمہ اربعہ میں سے کوئی بھی یزید پر لعنت نہ بھیجنے کا قائل نہیں تھا۔ فرق صرف صراحۃً اور کنایۃً کا تھا۔ ان کے قول کے مطابق امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ تصریح کے قائل ہیں۔ جب امام غزالی، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مقلد ہیں تو ترجیح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو ہی دی جائے گی۔

ابن جوزی نے قاضی ابویعلیٰ سے روایت کیا ہے کہ امام احمد بن حنبل کے صاحبزادے ''صالح'' نے ان سے عرض کی:

اِنَّ قَوْمًا یَنْسُبُوْنَنَا اِلٰی یَزِیْدَ فَقَالَ یَا بُنَیَّ! وَھَلْ یَتَوَلّٰی یَزِیْدَ اَحَمدٌ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَلَمْ لَا یُلْعَنُ مَنْ لَعَنَہُ اللّٰہُ فِیْ کِتَابِہٖ فَقُلْتُ وَ اَیْنَ لَعَنَ اللّٰہُ یَزِیْدَ فِیْ کِتَابِہٖ فَقَالَ فِیْ قَوْلِہٖ تَعَالٰی فَھَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ تَوَلَّیْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَ تُقَطِّعُوْا اَرْحَامَکُمْ اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ لَعَنَھُمُ اللّٰہُ فَاَصَمَّھُمْ وَ اَعْمٰی اَبْصَارَھُمْ فھل یَکُوْنُ فَسَادٌ اَعْظَمَ مِنْ ھٰذَا الْقَتْلِ۔ (الصواعق المحرقۃ ص ۲۲۲)

''ایک قوم ہماری طرف اس بات کو منسوب کرتی ہے کہ ہم یزید کے دوست اور حمایتی ہیں۔ آپ نے فرمایا: اے بیٹا! جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے وہ یزید کی دوستی کا دم بھر سکتا ہے؟ اور اس پر لعنت کیوں نہ بھیجوں جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں لعنت بھیجی ہے۔ میں نے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے کس جگہ اپنی کتاب میں یزید پر لعنت بھیجی ہے؟ فرمایا: اپنے اس ارشاد میں فَھَلْ عَسَیْتُمْ الآیۃ'' پھر تم سے یہ توقع ہے کہ اگر تم حکمران بنا دیئے جاؤ، تو زمین میں فساد برپا کرو اور قطع رحمی کرو۔ ایسا کرنے والے وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے

Marfat.com

لعنت بھیجی ہے۔ پس بہرہ کر دیا ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں اور اندھا کر دیا ہے ان کی آنکھوں کو' اب بتاؤ کیا قتل حسین رضی اللہ عنہ سے بھی کوئی فساد بڑا ہے؟''۔

احناف کے عقائد کی کتاب شرح عقائد نسفی کے محشی نے ''النبراس'' میں تصریح کی ہے:

وَ بَعْضُهُمْ اَطْلَقَ اللَّعْنَ عَلَيْهِ مِنْهُمْ اِبْنُ الْجَوْزِيّ الْمُحَدِّثُ وَ صَنَّفَ كِتَابًا سَمَّاهُ الرَّدُّ عَلَى الْمُتَعَصِّبِ الْعَنِيْدِ الْمَانِعِ عَنْ ذَمِّ يَزِيْدَ، وَ مِنْهُمُ الْاِمَامُ اَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ وَ مِنْهُمُ الْقَاضِيْ اَبُوْ يَعْلٰى۔ (نبراس شرح، شرح عقائد ص ۵۵۳)

ترجمہ: بعض نے یزید پر مطلقاً لعنت کو جائز قرار دیا ہے۔ ان میں سے محدث ابن جوزی ہیں، انہوں نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی ہے جس کا نام الرد علی المتعصب العنید المانع عن ذم یزید۔ رکھا ہے انہی میں سے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور قاضی ابویعلی وغیرہ حضرات ہیں۔

علامہ قسطلانی اپنی ارشاد الساری شرح صحیح بخاری میں رقم طراز ہیں:

وَقَدْ اَطْلَقَ بَعْضُهُمْ فِيْمَا نَقَلَهُ الْمَوْلٰى سَعْدُ الدِّيْنِ اللَّعْنَ عَلٰى يَزِيْدَ لِمَا اَنَّهُ كَفَرَ حِيْنَ اَمَرَ بِقَتْلِ حُسَيْنٍ وَ اتَّفَقُوْا عَلٰى جَوَازِ اللَّعْنِ عَلٰى مَنْ قَتَلَهُ اَوْ امر به اَوْ اَجَازَهُ وَ رَضِيَ بِهِ وَالْحَقُّ اَنَّ رِضَا يَزِيْدَ بِقَتْلِ الْحُسَيْنِ وَ اسْتِبْشَارُهُ بِذٰلِكَ وَاِهَانَتَهُ اَهْلَ بَيْتِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِمَّا تُوَاتَرَ مَعْنَاهُ وَ اِنْ كَانَ تَفَاصِيْلُهَا اُحَادًا فَنَحْنُ لَا نَتَوَقَّفُ فِيْ شَانِهٖ بَلْ فِيْ اِيْمَانِهٖ لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَعَلٰى اَنْصَارِهٖ وَ اَعْوَانِهٖ۔ (ارشاد الساری ص ۱۲۴ ج ۵)

''جس طرح علامہ سعد الدین تفتازائی نے نقل کیا ہے۔ بہت سے علماء نے یزید پر لعنت بھیجنے کا قول کیا ہے، کیونکہ وہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے قتل سے دائرۂ اسلام سے خارج ہو گیا اور سب علماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ جس نے آپ کو قتل کیا، جس نے آپ کے قتل کا حکم دیا، جس نے آپ کو قتل کرنے کی اجازت دی اور جو اس قتل پر راضی ہوا، اس پر لعنت بھیجنا جائز ہے اور حق یہ ہے کہ یزید امام حسین رضی اللہ عنہ کے قتل پر راضی ہوا اور اس پر

بہت خوش ہوا اور اہل بیت کی اس نے اہانت کی۔ یہ ایسی باتیں ہیں جو معناً متواتر ہیں۔ اگر چہ ان کی تفاصیل احاد ہیں اور ہم اس کے بارے میں اور اس کے کفر کے بارے میں ذرا شک نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ اس پر، اس کے دوستوں پر، اس کے مددگاروں پر لعنت بھیجے۔

سر دست ان چند حوالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ یہ علمائے کرام اس بات پر متفق ہیں کہ یزید لعنت کا مستحق ہے۔ البتہ اس کا مستحق لعنت ہونا اور بات ہے اور سارے کام چھوڑ کر اس پر لعنت بھیجنے کو اپنا معمول اور وظیفہ بنا لینا اور بات ہے۔ ہم اس کام میں وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ اس سے بہتر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر، اس کے رسول کریم ﷺ اور آپ کی آلِ اطہار پر صلوٰۃ وسلام پڑھا جائے۔

مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ

Marfat.com

ایک شیعہ
کے جواب میں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرصہ ہوا جہلم سے ایک دوست نے ہمیں خط لکھا کہ کسی ہوٹل میں انہوں نے ایک اشتہار آویزاں دیکھا ہے، جس میں کوئی صاحب لکھتے ہیں کہ میرے ذہن میں شبہات پیدا ہوئے، میں دو سال تک علمائے اہل سنت کے پاس جاتا رہا تاکہ وہ میری تسلی کر دیں، لیکن کوئی مجھے مطمئن نہ کر سکا، اس لیے میں نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا ہے۔

ہمارے اس دوست نے خواہش کی ہے کہ ان سوالات کے تسلی بخش جوابات شائع کیے جائیں تاکہ اگر کسی کے دل میں یہ خدشات ہوں تو وہ دور ہو جائیں۔

عدیم الفرصتی کے باوجود میں نے اپنا فرض خیال کیا کہ ان شبہات کا جواب تحریر کروں، معترض کے اعتراضات میں نے پڑھے ہیں۔ ان کے بیان میں کہاں تک صداقت ہے اسے اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، ہمیں اس میں الجھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ البتہ اعتراضات کے جوابات پیش خدمت ہیں۔

و ما توفیقی الا باللہ

اعتراض نمبر ا

حضرتِ خاتونِ جنت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو روضۂ مبارکہ میں کیوں دفن نہیں کیا گیا؟

معلوم ہوتا ہے کہ جناب معترض نے شیعہ صاحبان کی کتابوں کا مطالعہ بھی نہیں کیا، ورنہ وہ اس ذہنی خلفشار کا شکار نہ ہوتے۔ ان لوگوں نے حسب عادت اس واقعہ کو بھی افسانوی رنگ دیا ہے اور اس المناک سانحہ کو بھی اپنی عبارت آرائی اور اپنے راہوارِ قلم کی ترک تازیوں کا میدان بنایا ہے۔ میں ان کی تاریخ کی معتبر کتاب ''ناسخ التواریخ'' کے حوالے سے کچھ چیزیں پیش کرتا ہوں۔

وہ لکھتے ہیں کہ حضرت خاتونِ جنت کے وصال کی خبر جب اہل مدینہ کو پہنچی تو سب نے

Marfat.com

گریہ وفریاد شروع کر دی اور عورتیں گھر میں جمع ہو گئیں جن کے شور وفغاں سے مدینہ میں زلزلہ محسوس ہونے لگا۔ مدینہ طیبہ کے سارے باشندے اس انتظار میں جمع ہو گئے کہ جنازہ میں شرکت کریں گے، لیکن اس وقت ابوذر باہر آئے اور کہا اے لوگو! اپنے گھروں کو واپس چلے جاؤ۔ اس وقت تجہیز وتکفین کا کوئی ارادہ نہیں۔ سب لوگ واپس چلے گئے۔ صرف اسماء بنت عمیس (زوجہ محترمہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ) سرہانے بیٹھی روتی رہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور آپ کے چہرۂ مبارک سے کپڑا اٹھایا۔ اب اس کے بعد ناسخ التواریخ کی عبارت پیش کرتا ہوں تاکہ کسی کو کوئی اشتباہ نہ رہے۔

فَاِذَا فِیْھَا بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ھٰذَا مَا اَوْصَتْ بِہٖ فَاطِمَۃُ بِنْتُ رَسُوْلِ اللّٰہِ اَوْصَتْ وَ ھِیَ تَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ وَ اَنَّ الْجَنَّۃَ حَقٌّ، وَالنَّارَ حَقٌّ وَ اَنَّ السَّاعَۃَ آتِیَۃٌ لَا رَیْبَ فِیْھَا وَ اَنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ مَنْ فِی الْقُبُوْرِ یَا عَلِیُّ! اَنَا فَاطِمَۃُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ زَوَّجَنِیَ اللّٰہُ مِنْکَ لِاَکُوْنَ لَکَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃَ اَنْتَ اَوْلٰی بِیْ مِنْ غَیْرِیْ حَنِّطْنِیْ وَ غَسِّلْنِیْ وَ کَفِّنِّیْ بِاللَّیْلِ وَ صَلِّ عَلَیَّ وَادْفِنِّیْ بِاللَّیْلِ وَلَا تُعْلِمْ اَحَدًا اَوْ اِسْتَوْدَعَکَ اللّٰہُ وَ اقْرَأْ عَلٰی وَلَدِیْ السَّلَامَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ۔

(ناسخ التواریخ جلد سوم جز واول ص ۲۵۔ ۲۲۴ مطبوعہ تہران)

"حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے آپ کے چہرۂ مبارک سے پردہ اٹھایا، وہاں ایک رقعہ دیکھا جس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ "بسم اللہ الرحمن الرحیم یہ وصیت کی کہ وہ گواہی دیتی ہیں کہ لا الہ الا اللہ و ان محمدا عبدہ و رسولہ جنت حق ہے، دوزخ حق ہے۔ قیامت ضرور آئے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں، اللہ تعالیٰ مردوں کو پھر اٹھائے گا۔ اے علی! رضی اللہ عنہ میں فاطمہ بنت محمد (ﷺ) ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے میرا نکاح آپ کے ساتھ کیا تاکہ دنیا وآخرت میں آپ کی زوجہ رہوں۔ دوسروں سے آپ میرے زیادہ مستحق ہیں، مجھے خوشبو لگائیے، غسل دیجئے اور رات کو ہی مجھے کفن دیجئے اور میری نماز جنازہ پڑھیے اور رات

کو ہی مجھے دفن کر دیجئے اور کسی کو اطلاع نہ دیجئے۔ میں آپ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کرتی ہوں، میری طرف سے میرے بچوں کو تا قیامت سلام"۔

اس سے ثابت ہوا کہ حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا نے روضۂ مبارک میں دفن ہونے کی نہ وصیت کی اور نہ اس خواہش کا اظہار کیا، نہ آپ کی قبر مبارک کے لیے کسی سے مشورہ کیا گیا، بلکہ آپ کی وصیت کے مطابق رات کی تاریکی میں آپ کی نمازِ جنازہ پڑھی گئی اور آپ کو دفن کیا گیا۔

ایک انصاف پسند آدمی یہ وصیت نامہ پڑھنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ جنت البقیع میں مزار پر انوار بنانے میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا کوئی عمل دخل نہیں۔ حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے خود اپنی مرضی سے آپ کو دفن فرمایا۔ اس وصیت سے ایک اور بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جس کلمے پر حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا نے اس عالم فانی کو الوداع کہا وہ وہی کلمہ ہے جو اہل سنت و جماعت کا ہے۔ اگر کوئی دوسرا کلمہ ہوتا تو آپ اسی کلمہ پر دنیا سے رخصت ہوتیں۔ اگر **علی ولی اللہ و خلیفتہ بلا فصل** بھی جزو ایمان ہوتا تو حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا اس کا ذکر بھی اپنی وصیت میں فرماتیں۔ یہ شرف اہل سنت ہی کو حاصل ہے کہ ان کا کلمہ، ان کے معتقدات بعینہٖ وہی ہیں جو خاندان اہل بیت پاک کے تھے۔ مزار پر انوار کے بارے میں اسی کتاب کے صفحہ ۲۳۲ کی روایت ملاحظہ فرمائیں، لکھتے ہیں:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کی نمازِ جنازہ پڑھی، پھر دو رکعتیں ادا کیں، پھر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور عرض کی: یارب العالمین! یہ تیرے نبی پاک ﷺ کی لخت جگر ہے۔(1)

جب انہوں نے دفن کرنے کا ارادہ فرمایا تو پھر کیا ہوا؟ اس کی تفصیل انہی کی عبارت میں ملاحظہ فرمائیے:

1۔ ناسخ التواریخ، جلد 3، صفحہ 232

Marfat.com

نُوْدُوْا مِنْ بُقْعَةٍ مِنَ الْبَقِيْعِ اِلَيَّ اِلَيَّ فَقَدْ رُفِعَ تُرْبَتُهَا مِنِّيْ فَنَظَرَ فَاِذَا هِيَ بِقَبْرٍ مَحْفُوْرٍ فَحَمَلُوا السَّرِيْرَ اِلَيْهَا فَدَفَنُوْهَا۔ (1)

''تو جنت البقیع کے ایک گوشہ سے آواز آئی: میری طرف لے آؤ۔ ان کا جسد اطہر میری مٹی سے اٹھایا گیا ہے۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے جب اس گوشہ کی طرف دیکھا تو وہاں ایک کھدی ہوئی قبر تیار تھی۔ چنانچہ حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کی چارپائی کو اٹھا کر وہاں لے آئے اور اس قبر میں آپ کو دفن کیا''۔

اس سے بھی صراحۃً پتہ چلتا ہے کہ آپ کے جسد اطہر کی مٹی اس جگہ سے لی گئی تھی۔ لامحالہ آپ کو وہیں دفن ہونا تھا، کوئی کتنی ہی کوشش کرتا اس جگہ کے علاوہ انہیں دفن نہ کیا جا سکتا تھا۔ نیز جس قبر میں آپ کو دفن کیا گیا وہ نوری فرشتوں کی تیار کردہ تھی۔ گویا مشیت الٰہی بھی یہی تھی کہ آپ اس قطعہ مبارکہ میں دفن ہوں، ورنہ جن فرشتوں نے یہاں قبر تیار کی تھی وہ روضہ حنیفہ میں بھی تیار کر سکتے تھے اور کوئی کتنی رکاوٹ پیدا کرتا آپ کو وہاں دفن ہونے سے نہ روک سکتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا نے نہ یہ وصیت کی، نہ اس بات کی خواہش کا اظہار کیا کہ آپ کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلو میں دفن کیا جائے۔ نہ علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے، نہ حسنین کریمین میں سے کسی نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کو وہاں دفن کرنے کا اذن طلب کیا۔ اگر سیدۃ النساء ایسی وصیت کرتیں یا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اذن طلب کرتے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اذن نہ دیتے یا مزاحمت کرتے تو پھر معترض کے اعتراض میں کچھ وزن ہوتا۔ جب ان میں سے کوئی صورت بھی موجود نہیں تو پھر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی مقدس ذات پر کیچڑ اچھالنا محض اپنی کور باطنی کا اظہار ہے۔

ہم معترض صاحب سے عرض کرتے ہیں کہ اگر کوئی بدزبان حضرت امام حسن مجتبیٰ پر

1۔ ناسخ التواریخ، جلد 3، صفحہ 232

Marfat.com

اعتراض کرے کہ روضۂ مبارکہ میں جب چوتھی قبر کی جگہ موجود تھی تو آپ نے امیر المومنین علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کو وہاں کیوں دفن نہ کیا؟ اس وقت تو شیخین موجود نہ تھے، مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ بلکہ سارے حجاز پر آپ کا کامل تسلط تھا۔ کیا ہمارے یہ معترض صاحب اس دوسرے بدزبان کی یاوہ گوئی کو تسلیم کرتے ہوئے سبط النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ریحانۃ الرسول حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کو موردالزام ٹھہرائیں گے؟

اعتراض نمبر ۲

ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر کی مثال دے کر ثابت کریں کہ ان کے وارثوں کو ان کی وراثت سے محروم رکھا گیا ہے؟

جواب

اس اعتراض کا جواب اگر ہم آپ کو اہل سنت و جماعت کی کتابوں کے حوالے سے دیں گے تو جناب معترض شاید اس کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوں۔ آیئے! دنیائے شیعیت کی سب سے معتبر کتاب ''اصول کافی'' کی حدیث ملاحظہ فرمائیں جو امام معصوم حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

عَنْ اَبِیْ عَبْدِ اللّٰہِ عَلَیْہِ السَّلَامُ قَالَ: اِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَۃُ الْاَنْبِیَاءِ وَ ذَاکَ اَنَّ الْاَنْبِیَاءَ لَمْ یُوَرِّثُوْا دِرْھَمًا وَّلَا دِیْنَارًا وَّ اِنَّمَا اَوْرَثُوْا اَحَادِیْثَ مِنْ اَحَادِیْثِھِمْ۔

(اصولِ کافی جلد اول باب صفۃ العلم وفضلہ ص ۲۴۔۲۵)

''حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ علماء انبیاء کے وارث ہیں، کیونکہ وہ انبیاء درہم اور دنانیر کا وارث نہیں بناتے بلکہ اپنے علمی معارف کا وارث بناتے ہیں''۔

اسی کتاب کے صفحہ ۲۷ پر حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ گرامی نقل کیا ہے:

عَنْ اَبِیْ عَبْدِ اللّٰہِ عَلَیْہِ السَّلَامُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

Marfat.com

اِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ اِنَّ الْاَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوْا دِيْنَارًا وَّلَا دِرْهَمًا وَّلٰكِنْ وَّرَّثُوا الْعِلْمَ فَمَنْ اَخَذَ مِنْهُ اَخَذَ بِحَظٍّ وَّافِرٍ۔ (1)

’’حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ انبیاء علماء کے وارث ہیں۔ انبیاء دینار اور درہم ورثہ میں نہیں دیتے، بلکہ اپنا علم خداداد ورثہ میں دیتے ہیں۔ جس نے اس علم سے کچھ حاصل کیا اس کو بڑا حصہ نصیب ہوا‘‘۔

دوسری روایت میں ارشاد حضور نبی کریم ﷺ کا ہے اور راوی حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ ہیں اور پہلی روایت میں حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا عقیدہ اور نظریہ بیان ہے جو فرمانِ مصطفوی ﷺ کے عین مطابق ہے۔ جب حضور کا بھی یہ ارشاد ہو اور حضرتِ جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا بھی یہ عقیدہ ہو تو پھر اس کے خلاف کوئی بات کرنا ایمان کے سراسر منافی ہے۔

بڑی حیرت ہوتی ہے کہ ویسے تو اصولِ کافی کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ امام مہدی، جو کہ ابھی تک غار میں چھپے ہوئے ہیں، جب کلینی نے یہ کتاب تصنیف کی تو غار میں اپنے سفراء کے ساتھ حضرت امام غائب کی خدمت میں پیش کیا گیا اور آپ نے اسے پڑھ کر پسند کیا اور فرمایا ھٰذَا کَافٍ لِشِیْعَتِنَا یعنی ہمارے شیعہ کے لیے یہ کتاب کافی ہے۔ عام طور پر ہندوستانی مطبوعہ نسخوں کے سرورق پر یہ ارشاد مرقوم ہوتا ہے، لیکن اگر اسی معتبر کتاب میں حضور کا ارشاد یا کسی امام معصوم کا فرمان اپنے عقیدہ کے خلاف ہوتا ہے تو اس کو اٹھا کر پرے رکھ دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ روایات جو ابھی آپ پڑھ چکے ہیں جب کہ ان کے عقائد کے خلاف ہیں تو ان کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ کیونکہ یہ آیاتِ قرآنی کے خلاف ہیں، اس لیے ہم ان کو نہیں مانتے۔ ان بھلے مانسوں سے کوئی پوچھے کہ امام غائب نے ایسی کتاب کے بارے میں یہ فرمایا ہوگا کہ یہ ہمارے شیعہ کے لیے کافی ہے؟ جس میں ایسی روایتیں موجود ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں۔ کوئی عقل سلیم اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ بہر حال ان حضرات

1۔ اصول کافی، جلد 1، صفحہ 27

Marfat.com

نے ان احادیث کو ماننے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ یہ قرآن کے خلاف ہیں اس لیے ہم ان کو حجت تسلیم نہیں کرتے۔ فرماتے ہیں: قرآن مجید میں ہے:

وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ (النمل۔۱۶)

''کہ حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کے وارث بنے''۔ نیز حضرت زکریا علیہ السلام نے بچے کے لیے دعا کی تو عرض کیا:

يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ (مریم۔۶)

''یعنی مجھے ایسا بچہ عطا فرما جو میرا وارث بنے اور آلِ یعقوب کا وارث بنے''۔

جب حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے باپ داؤد علیہ السلام کے، حضرت یحییٰ علیہ السلام اپنے باپ زکریا علیہ السلام اور آلِ یعقوب علیہ السلام کے وارث ہو سکتے ہیں تو سیدۃ النساء رضی اللہ عنہا حضور نبی کریم ﷺ کی وارث کیوں نہیں بن سکتیں؟

اس کے بارے میں گزارش ہے کہ قرآنِ کریم میں مال کی وراثت کا ذکر نہیں بلکہ علم اور نبوت کی وراثت مذکور ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے اٹھارہ بیٹے تھے، بیٹیاں بھی تھیں اور بہت سی ازواج بھی تھیں۔ اگر آیت میں مال کی وراثت کا ذکر ہوتا تو سب بیٹے بیٹیاں اور بیویاں وارث ٹھہرتیں۔ صرف حضرت سلیمان علیہ السلام کی تخصیص کا کوئی مقصد نہ ہوتا۔ صرف حضرتِ سلیمان علیہ السلام کا ذکر اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ورثہ سے مراد علم اور نبوت کی وراثت ہے۔ اسی طرح زکریا علیہ السلام متمول لوگوں میں سے نہ تھے جن کے پاس لاکھوں کروڑوں کی جائیداد ہو اور اس کے لیے وہ کوئی وارث مانگ رہے ہوں۔ آپ بڑھئی کا کام کرتے تھے، مشکل سے بسر اوقات ہوتی تھی۔ نیز آلِ یعقوب علیہ السلام کے کون سے خزانے اب تک محفوظ تھے؟ جن کے لیے وارث کی فکر حضرت زکریا علیہ السلام کو دامن گیر تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ اپنی قوم سے مایوس تھے۔ ان میں انہیں کوئی ایسا مردِ صالح نظر نہیں آتا تھا جو ان کے بعد توحید کی تبلیغ کا فریضہ ادا کر سکے۔ آپ کو یہ خیال رہ رہ کر پریشان کر رہا تھا کہ میرے اس دنیا سے رحلت فرمانے کے بعد کہیں میری گدی پر ایسے لوگ

Marfat.com

متمکن نہ ہو جائیں جو نبوت کی ذمہ داریاں اور تبلیغ کے فرائض کی ادائیگی سے قاصر ہوں اور میرے بعد ہدایت کی روشنی بجھ جائے اور گمراہی کا اندھیرا چارسو پھیل جائے۔ اس کے لیے آپ ایک ایسے وارث کے لیے دست بدعا رہتے جو اس بارِ گراں کا متحمل ہو سکے۔

اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لیے ضیائے حرم کا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نمبر مطالعہ فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے شکوک و شبہات کی گرد و غبار دور فرما دے تو کچھ بعید نہیں۔

اعتراض نمبر ۳

کسی نبی کی شریعت میں کسی امتی کو رد و بدل کرنے کی اجازت نہیں۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے الصلوٰۃ خیر من النوم کا جملہ صبح کی اذان میں کیوں بڑھایا؟ ماہِ رمضان میں نمازِ تراویح کا اضافہ کیوں کیا اور متعہ کو حرام کیوں قرار دیا؟

جواب

کسی نبی کی شریعت میں کسی امتی کو رد و بدل کی ہرگز اجازت نہیں۔ یہود و نصاریٰ نے اپنی شریعتوں میں ہوائے نفس کے مطابق تحریف و تبدل کو اپنا شعار بنایا۔ اس وجہ سے قرآنِ کریم میں جا بجا ان کی مذمت کی گئی ہے۔ جب سابقہ انبیائے کرام علیہم السلام کی شرائع میں کسی قسم کا رد و بدل ناقابل برداشت اور لائق صد مذمت ہے تو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت میں، جو آخری نبی کی آخری شریعت ہے تغیر و تبدل کیسے روا رکھا جا سکتا ہے؟

لیکن آپ نے جن چیزوں کو تغیر و تبدل کہا ہے یہ آپ کی سینہ زوری اور تاسف ہے۔ ان امور کا احکامِ شریعت میں تحریف سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ آپ نے الزام لگایا ہے کہ حضرتِ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ اذان میں اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کے کلمات بڑھا دیے ہیں۔ یہ الزام سراسر باطل ہے، یہ اضافہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ فقہ حنفی کی مستند کتاب الهدایہ میں موجود ہے (اسی طرح متعدد کتب احادیث میں بھی) کہ ایک روز حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم استراحت فرما تھے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ حاضر خدمت ہوئے اور

Marfat.com

اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کہہ کر حضور ﷺ کو بیدار کیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ کلمات بہت پسند آئے۔ ارشاد فرمایا:

مَا اَحْسَنَ ھٰذَا یَا بِلَالُ! اِجْعَلْهُ فِیْ اَذَانِکَ۔ (1)

"اے بلال! یہ کتنا پیارا جملہ ہے، اس کو اذان میں داخل کر دو"۔

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی طرف یہ بات جو منسوب کی جاتی ہے کہ آپ کے حکم سے اسے اذان کا جزو بنایا گیا، یہ قطعاً درست نہیں۔ صورتِ حال یہ تھی کہ بسا اوقات مؤذن اذان کے بعد جب امیر المومنین کو بیدار کرنے کے لیے ان کے پاس آتا تو جگانے کے لیے اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کا جملہ دہراتا۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا کہ یہ جملہ اذان کا جزو ہے اور اذان میں ہی اس کا اعادہ مناسب ہے۔ کسی کے دروازہ پر جا کر ان الفاظ سے اس کو جگانا درست نہیں۔ (2)

تعجب تو اس بات پر ہے کہ اذان میں اس کا غلط الزام وہ لگا رہے ہیں جو بڑے دھڑلے سے اذان میں اضافہ کرتے ہیں اور اتنا طویل اضافہ کہ کلمات اذان سے بھی وہ طویل ہے اور یہ ایسا اضافہ ہے کہ جس کا سراغ نہ عہد رسالت ﷺ میں، نہ عہد خلفائے راشدین میں، نہ ائمہ اہل بیت کے زمانہ مبارک میں ملتا ہے، لیکن جناب معترض اور ان کے ہمنوا اذان میں اس اضافہ پر مصر ہیں اور ان کی ہٹ دھرمی کا یہ حال ہے کہ ان کے اکابر علماء ان کی اس زیادتی کے باعث انہیں لائق ملامت قرار نہیں دیتے۔ اسی کو کہتے ہیں:

غیراں را نصیحت خود میاں فضیحت

مَنْ لَا یَحْضُرُہُ الْفَقِیْهُ میں ہے:

ھٰذَا ھُوَ الْاَذَانُ الصَّحِیْحُ لَایُزَادُ فِیْهِ وَ لَایُنْقَصُ مِنْهُ

"یہ صحیح اذان ہے نہ اس میں کوئی زیادتی کی جا سکتی ہے اور نہ کمی کی جا سکتی ہے"۔ اس

1۔ الہدایۃ، جلد 1، صفحہ 87

2۔ حاشیہ، مؤطا امام مالک از مولانا محمد اشفاق، صفحہ 57، مطبوعہ مطبع مجتبائی پاکستان لاہور

Marfat.com

کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ مفوضہ (شیعہ کا ایک ٹولہ ہے) ان پر خدا کی لعنت ہے، انہوں نے کئی حدیثیں گھڑ لی ہیں اور اس اذان میں نئے نئے اضافے کر لیے ہیں۔ بعض اشهد ان محمد رسول الله کے بعد اشهد ان عليا ولی الله کہتے ہیں اور بعض اشهد ان عليا امير المومنين حقا دو بار کہتے ہیں:

وَلٰكِنْ لَيْسَ ذٰلِكَ فِي أَصْلِ الْأَذَانِ

اصل اذان میں یہ الفاظ نہیں ہیں۔ من لا يحضره الفقيه کی عبارت بھی ملاحظہ کریں:

وَالْمُفَوَّضَةُ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ قَدْ وَضَعُوْا اَخْبَارًا وَ زَادُوْا فِي الْاَذَانِ مُحَمَّد وال مُحَمَّد وَ فِي بَعْضِ رِوَايَاتِهِمْ اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا وَلِيُّ اللّٰهِ مَرَّتَيْنِ وَ مِنْهُمْ مَنْ رَوٰى بَدَلَ ذٰلِكَ اَشْهَدُ اَنَّ عَلِيًّا اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ حَقًّا مَرَّتَيْنِ...... وَ لٰكِنْ لَيْسَ ذٰلِكَ فِي اَصْلِ الْاَذَانِ۔ (من لا یحضرہ الفقیہ ص ۱۸۸۔۱۸۹، دار الکتب اسلامیہ تہران)

قارئین کرام خود فیصلہ کریں کہ اذان میں اضافہ اور تحریف کا مرتکب کون ہے؟

جناب معترض کا یہ کہنا بھی سراسر کذب وافترا ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے تراویح کی نماز جاری کی جو عہد رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نہیں تھی۔ گزارش ہے کہ اہل سنت کی کتاب میں بہت سی روایات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ تراویح کا آغاز حضور کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود کیا۔ تین رات تراویح پڑھانے کے بعد محض اس اندیشہ سے ان کا التزام نہ کیا کہ یہ نماز فرض نہ ہو جائے، لیکن علمائے اہل سنت کی کتابوں کے علاوہ شیعہ کی کتابوں میں بھی ایسی روایات موجود ہیں جن سے ان کی تصدیق ہوتی ہے۔ سردست ایک ہی روایت پر اکتفا کرتا ہوں۔ کتاب الوافی جلد دوم ص ٦٦ پر حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد منقول ہے:

قَالَ كَتَبْتُ اِلٰى اَبِيْ مُحَمَّدٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ اَنَّ رَجُلًا رَوٰى عَنْ آبَاءِكَ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم مَا كَانَ يَزِيْدُ مِنَ الصَّلٰوةِ

Marfat.com

فِیْ شَهْرِ رَمَضَانَ عَلٰی مَا کَانَ یُصَلِّیْهِ فِیْ سَائِرِ الْاَیَّامِ فَوَقَعَ عَلَیْهِ السَّلَامُ کَذِبٌ۔ فَضَّ اللّٰهُ فَاهُ صَلِّ فِیْ کُلِّ لَیْلَةٍ مِّنْ شَهْرِ رَمَضَانَ عِشْرِیْنَ رَکْعَةً اِلٰی عِشْرِیْنَ مِنَ الشَّهْرِ۔ (1)

''یعنی میں نے امام ابو محمد زین العابدین کی طرف لکھا کہ ایک شخص آپ کے آباء سے یہ روایت نقل کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ماہِ رمضان میں اتنی ہی نماز پڑھا کرتے تھے جتنی دوسرے مہینوں میں، اس پر زیادتی نہ کرتے۔ حضرت سجاد نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا، اس راوی نے جھوٹ بکا ہے، اللہ اس کا منہ پھوڑے اور اس کے دانت توڑے تو رمضان کی ہر رات میں بیس رکعت نماز ادا کیا کر اور بیس تاریخ تک ایسا ہی پڑھتا رہ''۔ (مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو ضیائے حرم کا فاروقِ اعظم نمبر)

جنابِ معترض نے تیسرا الزام یہ لگایا ہے کہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے متعہ کو حرام کیا۔ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے تو حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ صد تحسین اور ہزار تبریک کے مستحق ہیں کہ آپ نے دینِ فطرت کو فسق و فجور کا بازار گرم کرنے کے الزام سے بچا لیا۔ قرآن، جو عفتِ قلب و نگاہ کا درس دیتا ہے، اس پر یہ الزام کہ اس نے متعہ کی اجازت دی، سراسر ظلم اور زیادتی ہے۔ لیکن جن لوگوں کے نزدیک ایک مرتبہ یہ فعلِ شنیع کرنے سے شہیدِ کربلا کا مقام حاصل ہو جاتا ہے اور دو مرتبہ ایسا کرنے سے مقامِ امام حسن رضی اللہ عنہ نصیب ہوتا ہے اور تین مرتبہ ایسا کرنے سے مقامِ مرتضوی تک رسائی ہو جاتی ہے۔ (1) آپ ہزار کوشش کریں، آپ ان کو متعہ کی حرمت کا قائل نہیں کر سکتے، متعہ کے جواز کا قول اسلام کی روشن پیشانی پر ایک بدنما داغ ہے۔ میری زبان قلم اس کو بیان کرنے سے قاصر ہے۔ اگر آپ کے دل میں تحقیق کا شوق ہو تو ضیائے حرم کا فاروقِ اعظم نمبر ملاحظہ فرمالیں۔

1۔ کتاب الوافی از محمد حسن بن شاہ الکاشانی، جلد 2، صفحہ 66، مکتبہ اسلامیہ تہران

2۔ تفسیر منہج الصادقین از ملا فتح اللہ کاشانی، جلد 2، جز 4، صفحہ 493، کتاب فروشی اسلامیہ تہران

اعتراض نمبر ۴

شعب ابی طالب میں حضور ﷺ بنو ہاشم کو لے کر تین سال تک مقیم رہے اس وقت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کہاں تھے؟

جواب

آپ قبائلی زندگی کی خصوصیات سے بالکل ناواقف معلوم ہوتے ہیں۔ عرب میں خاندانی عصبیت اوج کمال پر تھی۔ خاندان کا کوئی فرد غلط بات کہتا یا کوئی غلط کام کرتا تو اس کی تائید خاندان کے ہر فرد کی عزتِ نفس کا مسئلہ بن جاتی۔ حضور ﷺ جس عہد میں تشریف فرما ہوئے وہ عہد قبائلی عصبیتوں کے شباب کا دور تھا۔ آپ نے دعوتِ اسلام کا آغاز کیا تو کئی دوسرے قبیلوں نے ہاشمی سمجھ کر آپ کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جب مشرکین مکہ نے حضور ﷺ پر جور وستم کی حد کر دی تو بنو ہاشم کی قومی عصبیت بھڑک اٹھی اور انہوں نے ہر قیمت پر حضور ﷺ کے دفاع کا عزم کر لیا۔ کفارِ مکہ اسلام کی روز افزوں ترقی سے نعل در آتش تھے۔ جب ان کی ساری کوششیں ناکام ہو گئیں تو انہوں نے سوشل بائیکاٹ کا حربہ استعمال کیا اور ایک حلفیہ تحریر لکھی کہ وہ بنو ہاشم اور بنو مطلب سے نہ لین دین کریں گے، نہ آپس میں شادیاں کریں گے، نہ ان سے گفتگو کریں گے اور نہ ان کے پاس بیٹھیں گے، جب تک کہ وہ حضور نبی کریم ﷺ کو ان کے حوالے نہ کر دیں۔ اس صحیفہ کو بڑی حفاظت سے سربمہر کر کے چھت کے ساتھ آویزاں کر دیا۔ علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ حضرت ابو طالب نے جب کفار کے ظلم وتشدد کو دیکھا تو آپ نے قبیلۂ عبد المطلب کو جمع کیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ حضور نبی کریم ﷺ کو اپنی گھاٹی میں پناہ دیں اور حضور ﷺ کا دفاع کریں۔ اس کے بعد علامہ موصوف لکھتے ہیں:

فَاجْتَمَعَ عَلٰی ذٰلِکَ مُسْلِمُهُمْ وَ کَافِرُهُمْ وَ مِنْهُمْ مَنْ فَعَلَهٗ حَمِیَّةً وَّ مِنْهُمْ مَنْ فَعَلَهٗ اِیْمَانًا وَّ یَقِیْنًا۔ (تاریخ ابن کثیر جلد ۳ ص ۸۴)

یعنی قبیلہ عبد المطلب کے تمام افراد مسلمان اور کافر سب جمع ہو کر حضور ﷺ کا دفاع

کرنے پر متحد ہو گئے۔ بعض نے یہ قدم قبیلہ کی غیرت وحمیت کے باعث اٹھایا اور بعض نے ایمان ویقین سے۔ اسی طرح علامہ ابن خلدون اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَ انحازَ بَنُوْ هَاشِمٍ وَ بَنُوْ عَبْدِالْمُطَّلِبِ كُلُّهُمْ. كَافِرُهُمْ وَمُؤمِنُهُمْ فَصَارُوْا فِيْ شِعْبِ اَبِيْ طَالِبٍ مَحْصُوْرِيْنَ مُجْتَنِبِيْنَ۔

(تاریخ ابن خلدون جلد ۲ ص ۲۴۷ مطبوعہ لبنان)

یعنی سارے بنوہاشم، مطلب کے سارے بیٹے، کافر اور مسلمان سب حضور ﷺ کے ساتھ شعب ابی طالب میں محصور ہو گئے۔ ان میں سے صرف ابولہب اپنے خاندان سے الگ رہا اور کفار کی سنگت اختیار کی۔

تین سال تک یہ مقاطعہ جاری رہا۔ محصورین پر بڑے بڑے مشکل وقت بھی آئے۔ تین سال یہ عرصہ بغیر کچھ کھائے پیے گزارنا ممکن نہیں۔ کفار نے تو بالکل لین دین بند کر دیا تھا۔ اب وہ کون لوگ تھے جو چوری چھپے ان محصورین کو خوراک اور دیگر ضروریات بہم پہنچایا کرتے تھے؟ ان میں سرفہرست حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے جنہوں نے اپنی ساری دولت اسلام کے لیے وقف کر دی تھی اور اپنا تن من دھن پیغمبر اسلام کی خوشی پر قربان کر دیا تھا۔ اگر شعب ابی طالب میں محصور ہونے کی دعوت سارے مسلمانوں کو دی جاتی اور صدیق اکبر اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہم اس میں شامل نہ ہوتے تو آپ کا اعتراض بجا تھا، لیکن یہاں تو معاملہ صرف خاندانِ عبدالمطلب تک محدود تھا۔ یہ حضرات پروانہ وار شمع رسالت ﷺ پر قربان ہوتے رہے اور ساری ضروریات کی کفالت کرتے رہے۔

اعتراض نمبر ۵

کیا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو قتل کیا گیا اور ان کے قاتل کو رضی اللہ عنہ کہنا جائز ہے؟

جواب

جنابِ معترض تاریخ کی ابجد سے بھی ناواقف ہیں۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ

Marfat.com

رضی اللہ عنہا کو نہ قتل کیا گیا، نہ زہر دیا گیا، نہ آپ کسی سازش کا شکار ہوئیں، بلکہ ۵۸ ھ ماہِ رمضان میں بیمار ہوئیں۔ چند روز تک علیل رہیں پھر وفات پائی اس وقت آپ کی عمر ٦٨ برس تھی جس پر کتب تاریخ شواہد ہیں۔

اعتراض نمبر ٦

اہل سنت و جماعت عموماً حضرت ابو ہریرہ، سعد، عبد اللہ، زبیر رضی اللہ عنہم سے زیادہ روایت کرتے ہیں تو کیا حضرت علی، حسن، حسین رضی اللہ عنہم کسی سے کم عالم تھے؟ ان سے حدیثیں کیوں مروی نہیں ہیں؟ خاص کر اس حدیث کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جواب دیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَ عَلِیٌّ بَابُھَا۔ (1)

جواب

جنابِ معترض کے لیے اختیار کردہ مذہب کی کتابوں میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی احادیث موجود نہ ہوں تو اور بات ہے۔

اہل سنت کی کتابیں آپ کی روایات سے بھری پڑی ہیں۔ خصوصاً فقہ حنفی کے بیشتر احکام باب مدینۃ العلم کے فیض نگاہ سے ہی مستنبط کیے گئے ہیں۔ ویسے مرویات کی کثرت سے افضلیت ثابت نہیں ہوتی، ورنہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی مرویات کی تعداد ان حضرات کی مرویات سے بھی کہیں کم ہے کیا کوئی اہل سنت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو خلفائے راشدین سے افضل سمجھتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

قلت روایات کی اصل وجہ یہ ہے کہ خلفائے راشدین کے گوناگوں فرائض تھے۔ وسیع و عریض مملکت کا انتظام، رعایا کے ہر فرد کی خبر گیری، نظامِ عدل کا اجراء، فوجوں کی تیاری، جنگی سکیمیں، دشمن سے لڑائیاں، مفتوحہ ممالک کے انتظامات وغیرہ، بے شمار مسائل تھے جن میں وہ منہمک رہا کرتے تھے۔ ان کے برعکس حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ کا دن رات یہ مشغلہ تھا کہ مملکت اسلامیہ کے گوشہ گوشہ سے آنے

1۔ مجمع الزوائد، جلد 9، صفحہ 148، دار الفکر بیروت

Marfat.com

والے لوگوں کو اپنے آقا و مولیٰ ﷺ کے ارشادات سناتے اور انہیں دین کی تفصیلات سے آگاہ کرتے، ان کے ذمہ کیونکہ یہ فریضہ تھا، ان کے دن رات اسی فریضہ کی ادائیگی میں صرف ہوتے تھے، اس لیے طبعاً ان حضرات سے روایات زیادہ ہیں اور خلفائے راشدین سے روایات کم۔

اعتراض نمبر ۷

حضور اکرم ﷺ کے بعد ثابت کریں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کسی لڑائی میں حصہ لیا؟ جب کہ اس سے پیشتر ہر لڑائی میں پیش پیش ہوتے تھے۔ اگر آپ کا یہ جواب ہے کہ لڑائی چھوڑ چکے تھے یا ضعیف ہو چکے تھے تو جنگ جمل وغیرہ میں کیوں تلوار اٹھائی؟

جواب

عہد نبوت میں حضور نبی کریم ﷺ خود سپہ سالار ہوتے تھے۔ حضور ﷺ کا ارشاد جنگ کے تمام معاملات میں قول فیصل ہوتا تھا۔ نیز اس زمانے میں جنگ کے میدان عموماً ملک کے اندر تھے اور چیدہ چیدہ صحابہ کرام ہر جنگ میں شریک ہوا کرتے تھے۔ جب بھی ضرورت پڑتی، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مجلس مشاورت کا انعقاد فرماتے اور صحابہ کرام سے صورتِ حال کے متعلق تبادلہ خیال کرتے۔ حضور ﷺ کے بعد صورتِ حال یکسر بدل گئی۔ اسلام کی روز افزوں ترقی کے باعث مملکت اسلامیہ کا حدود اربعہ روز بروز وسیع ہونے لگا۔ مختلف محاذوں پر کفار کے ساتھ جنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مسلمان مجاہدین مغرب میں قیصر روم کی فوجوں سے نبرد آزما تھے اور مشرق میں ایران کے بادشاہ کسریٰ سے برسر پیکار تھے۔ دارالخلافہ سے جنگوں کے میدان سینکڑوں بلکہ ہزاروں میل دور تھے۔ اس وقت عملی طور پر یہ ممکن نہ رہا کہ خلفائے راشدین ہر میدانِ جنگ میں خود سالارِ اعلیٰ کے فرائض انجام دیں۔ اگر وہ ایسا کرتے تو دوسرے محاذوں سے توجہ ہٹ جاتی اور دشمن کو پیش قدمی کا موقع مل جاتا۔ ان جدید حالات کے پیش نظر یہ ضروری ہو گیا کہ خلیفۃ المسلمین خود مرکز میں رہے اور وہاں سے تمام محاذوں پر یکساں توجہ دے۔

Marfat.com

وہ شخص جس نے خواب میں بھی میدانِ جنگ کا نظارہ نہ کیا ہو اسے کیا علم کہ جنگ لڑنا اور بیک وقت مختلف محاذوں پر جنگ لڑنا اور اس وقت کی دنیا کی دو بڑی طاقتوں سے جنگ لڑنا کتنی ذمہ داری کا کام ہے؟ فوجوں کا فراہم کرنا، اسلحہ مہیا کرنا، بار برداری کا انتظام کرنا، خوراک اور دوائیں میدانِ جنگ تک پہنچانا۔ ان امور کے علاوہ ہر وقت کمک کا تیار رکھنا، کتنی بڑی اہم ذمہ داریاں ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ میدانِ جنگ کا نقشہ تیار کرنا اور جنگی کارروائیوں اور اقدامات کا پروگرام بنانا کتنا کٹھن اور دشوار کام ہے؟ فردِ واحد ان تمام کاموں سے کیونکر عہدہ برآ ہو سکتا ہے؟ لازمی طور پر خلیفہ کو ایسے تجربہ کار، جہاں دیدہ مخلص اور دانش مند مشیروں کی ضرورت ہے اور ان کا ہر وقت خلیفۃ المسلمین کے پاس ہونا از بس ضروری ہے تاکہ جب کوئی نازک صورتِ حال ہو، فوراً مجلس شوریٰ کا اجلاس طلب کر کے بروقت اور مناسب فیصلہ کیا جائے۔

میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دینا بے شک بڑا کام ہے، لیکن جنگی منصوبہ بندی اور دیگر متعلقہ امور سے بروقت اور عمدگی سے عہدہ برآ ہونا اس سے کہیں اہم ہے۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک جنگی کونسل (کونسل آف وار) مقرر تھی۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اس کے رکن رکین تھے۔ جب کوئی سنگین واقعہ رونما ہوتا تو حضرتِ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ آپ کو مشورہ کے لیے یاد فرماتے اور آپ ہر دفعہ بہترین مشورہ دیتے۔ جنابِ معترض کو اگر علم نہ ہو تو وہ نہج البلاغۃ کا مطالعہ کرے۔ اسے معلوم ہو جائے گا کہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ رومیوں اور دو مرتبہ ایرانیوں کے ساتھ بنفس نفیس جنگ کرنے کا ارادہ کیا، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہی مشورہ دیا کہ سارے عالم اسلام کے لیے آپ کا مدینہ منورہ میں قیام فرما رہنا ہی باعث فلاح و کامرانی ہے۔ ایرانیوں سے مقابلہ کرنے کے وقت آپ نے جو ارشاد فرمایا اس کا مطالعہ ایمان کو تازہ کر دیتا ہے۔ ارشاد ہے:

اِنَّ هٰذَا الْاَمْرَ لَمْ يَكُنْ نَصْرُهٗ وَلَا خِذْلَانُهٗ بِكَثْرَةٍ وَلَا بِقِلَّةٍ وَ هُوَ دِيْنُ اللّٰهِ الَّذِيْ اَظْهَرَهٗ وَ جُنْدُهُ الَّذِيْ اَعَدَّهٗ وَ اَمَدَّهٗ حَتّٰى بَلَغَ مَا بَلَغَ وَ طَلَعَ حَيْثُمَا طَلَعَ

وَ نَحۡنُ عَلٰى مَوۡعُوۡدٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ مُنۡجِزٌ وَعۡدَهٗ وَ نَاصِرٌ جُنۡدَهٗ۔ ...... الخ

(نہج البلاغۃ ج اول ص ۲۸۳)

یعنی اس دین کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار فوج کی کثرت وقلت پر نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا دین ہے جسے اس نے غالب کر دیا ہے۔ یہ لشکر اللہ تعالیٰ کا ہے جس کو اس نے تیار کرایا ہے، جس کی اس نے امداد کی ہے، یہاں تک کہ وہ اس منزل تک پہنچا ہے۔ ہمارے ساتھ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کو ضرور پورا کرے گا اور اپنے لشکر کی مدد فرماتا رہے گا۔

پھر آپ نے فرمایا:

فَكُنۡ قُطۡبًا وَ اسۡتَدِرِ الرَّحٰى۔

آپ قطب کی طرح ایک جگہ ٹھہرے رہیں اور جنگ کی چکی کو چلاتے رہیں۔

آپ کے ان کلمات سے تھوڑی سی عقل وفہم رکھنے والا آدمی بھی یہ نتیجہ اخذ کرسکتا ہے کہ آپ کی نگاہوں میں فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا دین اللہ کا دین ہے۔ آپ کا لشکر اللہ تعالیٰ کا لشکر تھا جس کو کامیاب وکامران کرنے کا اللہ تعالیٰ نے پکا وعدہ کیا ہوا تھا، پھر آپ کا حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو یہ مشورہ دینا کہ آپ دار الخلافہ میں ہی ٹھہرے رہیں اور جنگ کی نگرانی کرتے رہیں، ایک مخلص اور خیر خواہ دوست کا مشورہ ہے۔

خلافت صدیقی میں بھی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ذو القصہ کی جنگ کے لیے بنفس نفیس جانے لگے تو حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے آپ کی اونٹنی کی نکیل پکڑ لی اور میدان میں جانے سے منع فرمایا۔(1)

خلفائے راشدین کے زمانہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حیثیت ایک سپاہی یا ایک فوج کے سپہ سالار کی نہ تھی کہ وہ خود شمشیر زنی کرتے، تیر افگنی اور نیزہ بازی میں مصروف رہتے، بلکہ آپ کا مقام ان چوٹی کے جرنیلوں کا تھا جن کے ذمے جنگی تدبیریں کرنا اور ان

1۔ البدایۃ والنہایۃ، جلد 6، صفحہ 15-314 (ملخصاً)

Marfat.com

تدبیروں کو عملی جامہ پہنانا ہوا کرتا ہے۔

اعتراض نمبر ۸

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو کہا کہ اس بڈھے سے واسطہ پڑ گیا ہے۔ اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لڑائی کی جس سے عثمان رضی اللہ عنہ کی دوستی اور علی رضی اللہ عنہ کا بغض ظاہر ہوتا ہے۔

جواب

جنابِ معترض کا یہ سوال اس کے خبث باطن کی دلیل ہے کہ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض تھا یا آپ نے حضرتِ علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کی تھی۔ یہ درست ہے کہ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو سزا دینے کا مطالبہ کیا۔ اس قسم کا مطالبہ سربراہِ مملکت سے ہی کیا جاتا ہے۔ دنیا بھر کے قوانین میں اس قسم کا مطالبہ درست تسلیم کیا گیا ہے۔ امیر المومنین سے یہ مطالبہ کر کے حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کوئی جرم نہیں کیا، بلکہ ایک جائز مطالبہ کیا ہے۔

جنگ جمل کی تفصیلات کا اگر آپ مطالعہ کریں تو آپ کو پتہ چل جائے گا کہ نہ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے جنگ کرنا چاہتی تھیں اور نہ ہی علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ، ام المومنین کے ساتھ جنگ کرنے کے حق میں تھے۔

جانبین سے سفراء نے گفتگو کی۔ اس کے باعث غلط فہمیاں دور ہو چکی تھیں۔ صبح سویرے صلح کا اعلان ہونے والا تھا کہ چند قاتلانِ عثمان رضی اللہ عنہ نے سازش کی اور رات کے دھندلکے میں تیری اندازی شروع کر دی۔ دونوں لشکر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ دوسرے لشکر نے عہد شکنی کی ہے۔ چنانچہ خون کے دریا بہہ گئے اور اسلام کے کئی جیالے جانباز سازشیوں کی تیغ جفا کی نذر ہو گئے۔ اس کا صدمہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا دونوں کو ہوا۔ اس خونریز اور جانکاہ حادثہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نہایت ادب واحترام کے ساتھ ام المومنین کو آپ کے بھائی محمد بن ابی بکر کی معیت میں

Marfat.com

مدینہ طیبہ روانہ کیا۔ بصرہ کی معزز خواتین کو بھی آپ کے ہمراہ بھیجا۔ میدانِ جنگ میں فریقین کے جو لوگ جاں بحق ہوئے تھے ان کی نمازِ جنازہ علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ نے خود پڑھائی اور بڑے اہتمام سے ان کی تجہیز و تکفین و تدفین کی۔

اعتراض نمبر ۹

اہل سنت کے عقائد کے مطابق فقہ کے امام، امام اعظم، امام احمد بن حنبل اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہم اور شافعی ہیں۔ پھر بتائیں ان کے بارہ امام کون سے ہیں؟ یزید کو تو وہ امام نہیں مانتے؟

جواب

اعتراض کے سیاق و سباق میں کوئی مناسبت نہیں، بہر حال معترض نے ہم سے دریافت کیا ہے کہ کیا یزید اہل سنت کے اماموں میں ہے یا نہیں؟ صرف اسی کے بتانے پر اکتفا کروں گا۔

ہمارے ائمہ میں یزید پلید کا نام ہرگز نہیں۔ اس کی بدکرداریوں اور زشت اعمالیوں کے باعث ہمارے عقائد کی کتابوں میں یہ صراحت مذکور ہے۔ شرح عقائد نسفی میں علامہ تفتازانی لکھتے ہیں:

لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ عَلٰى اَنْصَارِهٖ وَ اَعْوَانِهٖ۔ (1)

اللہ کی پھٹکار یزید پر، اس کے سارے یاروں اور مددگاروں پر۔

اسی طرح علامہ محمود آلوسی تفسیر روح المعانی میں رقمطراز ہیں:

لَا تَوَقُّفَ فِيْ لَعْنِ يَزِيْدَ لِكَثْرَةِ اَوْصَافِهِ الْخَبِيْثَةِ وَارْتِكَابِهِ الْكَبَائِرِ فِيْ جَمِيْعِ اَيَّامِ تَكْلِيْفِهٖ۔ (2)

یزید کے اوصاف خبیثہ اور اپنے عہد حکومت میں اس کی بداعمالیوں کے باعث اس پر

1۔ شرح عقائد نسفی، صفحہ 117، مطبوعہ کتب خانہ مجیدیہ ملتان

2۔ روح المعانی، جلد 26، صفحہ 77، داراحیاء التراث العربی بیروت

Marfat.com

لعنت بھیجنے پر ذرا توقف و تامل نہیں کیا جائے گا۔

اعتراض نمبر ۱۰

اہل سنت و جماعت کثرتی جماعت اور سنت کے پابند ہیں۔ پھر امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت کثرتی جماعت کہاں تھی اور وہ کون ہیں؟

جواب

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اہل سنت و جماعت ابتدا سے آج تک ملت اسلامیہ کا سوادِ اعظم رہے ہیں۔ انہی کے طفیل دین کی عظمت قائم ہے۔ یہی شریعت اسلامیہ کے تقدس کے پاسبان ہیں۔ انہی کی کوششوں سے قرآنِ کریم محفوظ ہے۔ انہی کی عرق ریزیوں نے احادیث نبوی ﷺ کو زمانہ کی دستبرد سے بچایا ہوا ہے اور جب تک چرخ نیلوفری پر مہر وماہ ضوفشاں ہیں، اہل سنت دین محمدی ﷺ کا پرچم اٹھائے رہیں گے۔

حضرتِ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ میں امن وسکون سے اپنا وقت بسر کر رہے تھے۔ حکومت کی مخالفت کے باوجود کسی کو ہمت نہ تھی کہ آپ پر دست تعدی دراز کرتا۔ یہاں تک کہ کوفہ کے شیعوں نے پے در پے خطوط کا تانتا باندھ دیا۔ ان خطوط میں منتیں اور التجائیں کیں کہ آپ حرم مکہ کو چھوڑ کر ان کے پاس کوفہ تشریف لائیے اور یقین دلایا کہ ہم سب خورد وکلاں، مرد وزن آپ کے اشارۂ ابرو پر سب کچھ نثار کر دیں گے۔ حضرت امام مسلم نے بھی شیعان کوفہ کی عقیدت مندیوں کے بارے میں تفصیل سے لکھا۔ جب آپ مکہ مکرمہ سے روانہ ہوئے تو آپ کے پیش نظر کسی سے جنگ کرنا نہ تھا اور نہ آپ نے ملت کے سوادِ اعظم اہل سنت کو اپنے ساتھ چلنے اور آپ کے ساتھ مل کر دشمن سے جنگ کرنے کی دعوت دی۔ جب آپ کوفہ کے قریب پہنچے تو شیعانِ کوفہ نے ابن زیاد کے دھمکانے سے نواسۂ رسول ﷺ کے ساتھ باندھا ہوا عہد وفا توڑ دیا اور میدانِ کربلا میں آپ کے ساتھ ان لوگوں نے وہ سلوک کیا جو محبت کے جھوٹے مدعی اپنے محبوبوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں، جو دنیا کے پرستار اللہ کے پیاروں سے کیا کرتے ہیں، جن کی تفصیلات ہم اس وقت بیان نہیں

Marfat.com

کر سکتے۔ حضرت امام اگر مکہ مکرمہ میں قیام فرما رہتے تو یزید کی مجال ہی نہ تھی کہ آنکھ اٹھا کر آپ کی طرف دیکھ سکتا اور اگر کوئی یہ حماقت کرتا تو چشم آفتاب دیکھتی کہ مصطفیٰ ﷺ کے غلام آپ کے پیارے نواسے کے قدموں پر کس طرح بے دریغ اپنی جانیں نچھاور کرتے ہیں۔ اہل سنت پر الزام لگانے سے پہلے سوچو کہ تاریخ کی عدالت میں قصوروار کون ہے؟ اہل بیت پاک کے خونِ ناب سے کس کے ہاتھ رنگین اور کس کے دامن تر ہیں؟ افسوس تم الزام لگاتے ہو اہل سنت پر، جن کا بچہ بچہ اہل بیت کی عظمت پر قربان ہونے کے لیے بے چین ہے۔

اعتراض نمبر ۱۱

حضور نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ میں منافقین کا ٹولہ بھی تھا، آپ کی وفات کے بعد وہ کہاں گئے؟ کیا مر گئے یا وہ کسی جماعت میں شریک ہو گئے؟ جس جماعت میں شامل ہوئے وہ کون سی جماعت ہے؟

جواب

جنابِ معترض! منافقین کے بارے میں بڑے مضطرب اور بے چین ہیں۔ پہلے تو انہیں یہ غلط فہمی دور کرنی چاہیے کہ مکہ میں بھی منافقین کا ٹولہ تھا مکہ میں تو اسلام لانا مصائب و آلام کو دعوت دینا تھا، لوگوں کو کیا پڑی تھی کہ وہ ایسے دین کے لیے اپنے آپ کو عذاب میں مبتلا کرتے جن کی صداقت پر ان کا ایمان نہیں تھا۔ البتہ مدینہ طیبہ میں جب مسلمان ہونے سے چند فائدے بھی وابستہ ہو گئے تو مطلب پرست گروہ نمودار ہوا اور اپنی دسیسہ کاریوں سے اسلام کی ترقی کی راہ میں روڑے اٹکانے لگا، ان کا رئیس عبداللہ بن ابی بن سلول تھا۔ ۹ ھ میں حضور ﷺ تیس ہزار جانبازوں کے ساتھ غزوۂ تبوک کے لیے روانہ ہوئے، سخت گرمی کا موسم تھا اور گرم لو اور تیز دھوپ نے جزیرۂ عرب کو آتش کدہ بنا رکھا تھا اور دور دراز کا سفر تھا، منافقین حیلے بہانے کر کے غزوۂ تبوک میں شریک نہ ہوئے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کا پردہ چاک کر دیا، اس کے بعد جلد ہی ان کا رئیس عبداللہ بن ابی مرض موت میں مبتلا ہو گیا۔ جب

Marfat.com

اسے اپنے بچنے کی امید نہ رہی تو اس نے اپنے بیٹے کو بارگاہِ رسالت ﷺ میں بھیجا تا کہ کفن کے لیے حضور ﷺ سے اپنی وہ قمیص لے جو حضور ﷺ کے جسم مبارک کو چھورہی ہے۔ منافقین کا انبوہِ کثیر ہر وقت اس کے پاس جمع رہتا، انہوں نے جب ملاحظہ کیا کہ خبیث اپنی بخشش کے لیے دامن مصطفوی ﷺ میں پناہ لے رہا ہے تو ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس روز ایک ہزار منافق مشرف بہ اسلام ہوئے۔(1) امام رازی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"اس روز ان میں سے ایک ہزار مسلمان ہوئے۔ اس طرح ان کی قوت ٹوٹ گئی اور بجز چند ازلی بدبختوں کے سب نے راہِ ہدایت اختیار کر لی جو ابھی تک مشرف بہ اسلام نہ ہوئے تھے، ان کو ایک روز نام لے لے کر حضور کریم ﷺ نے مجمع عام میں بے نقاب کر دیا۔ حضور فرماتے:

قُمْ يَا فُلَانُ فَاخْرُجْ فَإِنَّكَ مُنَافِقٌ۔ (2)

اے فلاں اٹھو! مسجد سے نکل جاؤ تم منافق ہو۔ اس طرح حضور ﷺ کے وصال سے پہلے منافقوں کا قلع قمع ہو گیا اور گنتی کے چند بدبخت باقی رہ گئے۔ وہ مدینہ طیبہ سے بھاگ گئے، ان کا نام ونشان یوں مٹ گیا کہ کسی کو یاد بھی نہ رہی۔

ارشادِ خداوندی ہے:

لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ (احزاب)

اے حبیب! اب یہ جتھ بند ہو کر مدینہ میں اقامت گزیں نہیں رہیں گے، بہت جلد ان کو یہاں سے نکال دیا جائے گا۔

اگر آپ کو منافقین کا سراغ لگانے کی اتنی ہی بے چینی ہے تو اللہ تعالیٰ سے پوچھئے وہ تمہیں بتائے گا:

اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝ (کوثر)

میرے محبوب کے دشمن مٹ جایا کرتے ہیں، ان کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہتا۔

1۔ تفسیر کبیر، جلد 8، صفحہ 155 2۔ ایضاً، جلد 8، صفحہ 177۔ روح المعانی، جلد 11، صفحہ 11

پیمانِ سرفروشی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نَحۡمَدُکَ اَللّٰھُمَّ عَلٰی نِعۡمَائِکَ الۡمُتَوَاصِلَۃِ کَمَا حَمِدَکَ الۡاَنۡبِیَاءُ وَ الۡمُرۡسَلُوۡنَ وَ نَشۡکُرُکَ عَلٰی اٰلَائِکَ الۡمُتَتَالِیَۃِ کَمَا شَکَرَکَ الصِّدِّیۡقُوۡنَ وَالۡمُقَرَّبُوۡنَ وَ نُثۡنِیۡ عَلَیۡکَ کَمَا اَثۡنَیۡتَ عَلٰی نَفۡسِکَ یَا حَیُّ یَا قَیُّوۡمُ۔

اَللّٰھُمَّ اَنۡتَ الۡعَلِیُّ الۡقَدِیۡرُ اَللّٰھُمَّ اَنۡتَ الۡوَلِیُّ النَّصِیۡرُ نَسۡأَلُکَ اَنۡ تُوَفِّقَنَا لِنَقۡتَبِسَ مِنَ الۡاَنۡوَارِ الۡمُحَمَّدِیَّۃِ السَّاطِعَۃِ وَ نَسۡتَنِیۡرَ قُلُوۡبَنَا بِالشَّمۡسِ الۡاَحۡمَدِیَّۃِ الۡبَازِغَۃِ۔ اَللّٰھُمَّ اَنۡتَ ذُوالۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ۔

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡکَ یَا صَاحِبَ الۡوَجۡہِ الۡجَمِیۡلِ وَ الطَّرۡفِ الۡکَحِیۡلِ وَسَلَّمَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡکَ یَا نُوۡرَ الۡھُدٰی کَھۡفَ الۡوَرٰی وَ عَلٰی اٰلِکَ الۡکِرَامِ الۡبَرَرَۃِ وَاَصۡحَابِکَ النُّجُوۡمِ النَّیِّرَۃِ وَ عَلٰی اَتۡبَاعِکَ الۡاَوۡفِیَاءِ الۡخِیَرَۃِ نَشۡھَدُ اَنَّکَ عَبۡدُاللّٰہِ وَ سَیِّدُ خَلۡقِ اللّٰہِ فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃِ۔ وَنَشۡھَدُ اَنَّکَ اَشۡرَفُ رُسُلِ اللّٰہِ وَ خَاتَمُ اَنۡبِیَاءِ اللّٰہِ وَ نَشۡھَدُ اَنَّکَ بَلَّغۡتَ مَا اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی عَبۡدِکَ الۡمُصۡطَفٰی مِنَ الصَّلَوٰتِ اَطۡیَبَھَا وَسَلِّمۡ عَلٰی حَبِیۡبِکَ الۡمُرۡتَضٰی مِنَ التَّسۡلِیۡمَاتِ اَزۡکٰھَا وَ بَارِکۡ عَلٰی یٰسٓ و طٰہٰ مِنَ الۡبَرَکَاتِ اَسۡمٰھَا وَ عَلٰی اٰلِہٖ وَ اَصۡحَابِہٖ اِلٰی یَوۡمِ الدِّیۡنِ۔

اَمَّا بَعۡدُ فَقَالَ اللّٰہُ سُبۡحَانَہٗ

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ ؕ یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡھِمۡ ۚ فَمَنۡ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنۡکُثُ عَلٰی نَفۡسِہٖ ۚ وَ مَنۡ اَوۡفٰی بِمَا عٰھَدَ عَلَیۡہُ اللّٰہَ فَسَیُؤۡتِیۡہِ اَجۡرًا عَظِیۡمًا ﴿۱۰﴾ (الفتح)

میر کاروان مشتاقاں، آہووانِ دشت محبت ورضا کارانِ جند اللہ و دیگر حضرات کرام!

السلام وعلیکم ورحمۃ اللہ!

آج جبکہ انسان کو مادہ پرستی سے ایک لمحہ کی فرصت نہیں۔ آج جبکہ بڑے بڑے مفکر اور فلسفی دجل وفریب اور مکر وخداع کے فلک بوس ایوانوں کے طواف میں مصروف ہیں۔ آج جب کہ سچ کو ابلہی اور جھوٹ کو فرزانگی کہا جاتا ہے۔ آج جبکہ شرم وحیا اور اخلاص ووفا کو جہالت اور وحشت، بے حیائی اور عریانی، گستاخی اور طوطہ چشمی کو تہذیب وتمدن کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ آج جب کہ اخلاق کا معیار ہی بدل چکا ہے اور خیر وشر کی اقدار ہی انوکھی ہو چکی ہیں، آپ حضرات کا اپنے کاروبار چھوڑ کر، سفر کی صعوبتیں جھیل کر، سردی کے موسم میں صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے پیارے رسول ﷺ کی خوشنودی کے لیے یہاں جمع ہونا ایک حیرت انگیز چیز ہے۔

ایسی انجمنیں اور محفلیں دیکھ کر ابلیس فرطِ ندامت سے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہتا ہے کہ کیا آج بھی ایسے دیوانے موجود ہیں جو میرے نگار خانۂ لذات کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے؟ کیا ساقی بطحا کی شرابِ طہور سے آج بھی یہ ایسے مخمور ہیں کہ میری ترشیاں انہیں ہوش میں نہیں لا سکتیں؟ ہائے میرے کمند شیر افگن کی نارسائیاں! اف! میرے دام تزویر کی ناتوانیاں! وائے میری مسلسل مساعی کا دردناک انجام!

ہاں، تم ہو جنہیں دیکھ کر شیاطین انس وجان کے ہاں صف ماتم بچھتی ہے۔ ہاں، تم ہو جن پر رحمت کے فرشتے اللہ تعالیٰ کی بخششوں کے رنگین پھول برساتے ہیں۔

کیا آپ اپنے ایک دور افتادہ مخلص کو اس پاک بزم میں اذنِ لب کشائی دیتے ہیں؟ کیا آپ اپنے کانوں کو اس نحیف وکمزور آواز کو سننے کے لیے متوجہ کر سکتے ہیں جو چار ہزار میل سے آپ کی طرف لپکی آرہی ہے؟ لیکن کانوں سے میرا مقصد یہ کان نہیں جن سے آپ کوے کی کائیں کائیں، بھیڑ کی میں میں اور مکھی کی بھن بھن سنتے ہیں، بلکہ وہ کان جو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام سننے کے لیے دل کو عطا فرمائے ہیں، جن سے سنی ہوئی بات بھولتی نہیں بلکہ دل پر نقش ہو جاتی ہے۔ اگر آپ اس ناچیز گزارش کو اپنے دل کے کانوں سے سنیں تو آپ کی عنایت اور میری خوش قسمتی ورنہ میں قصوروار اور خفتہ بخت۔ پھر میرے لیے دعا

Marfat.com

فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایسی بات کہنے کی توفیق بخشے جسے آپ کے دل کے کان سن سکیں۔ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيرٌ۔

آپ حضرات میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جنہوں نے اس مردِ خدا، اس درویش خدا مست، اس فقیر امیر نواز کے دست حق پرست پر بیعت کی ہے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ عنا۔ اس لیے میں آج آپ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بیعت کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اس کے فوائد اور اس کے اثرات کیا ہیں؟ یہ کب اور کیوں اور کیسے شروع ہوئی؟

اسلام کا یہ حصار بلند جسے خالق ارض وسما نے قیامت تک تمام دنیائے انسانیت کے لیے ایک پناہ گاہ بنایا، جس کی آغوش حفاظت میں آ کر انسان شیطان کی غارت گریوں، نفس کی شبخونیوں، ظالموں کی ستم رانیوں اور ذلت ورسوائی کی تمام لعنتوں سے محفوظ ہو جاتا ہے، اس قلعہ کی بنیادیں اگر ریت کے ڈھیروں پر اٹھائی جاتیں تو آج تک انقلاباتِ زمانہ کی تیز و تند آندھیاں اس کے آخری نشانات کو بھی نیست و نابود کر چکی ہوتیں۔ آخر وہ کیا بنیاد ہے کہ جس پر یہ قلعہ تعمیر کیا گیا ہے جسے گرانے کے لیے ابلیسی قوتیں بار ہا سر جوڑ جوڑ کر اٹھیں اور ہمیشہ سر پھوڑ پھوڑ کر رہ گئیں؟ جس نے ابتلاء و آزمائش کے تمام خوفناک طوفانوں کو دعوتِ مبارزت دی، جس نے ترکش ظلم وطغیان کے آخری تیر تک کو للکارا، جس نے ہلاکت و بربادی کی بجلیوں کو پکارا، لیکن جسے ہر طوفان نے نئی قوت دی اور جسے ہر آزمائش نے نئی توانائی بخشی۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ وہ بنیاد کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندے کو رسول بنا کر پیغامِ ہدایت پہنچانے کے لیے مبعوث فرمایا تو اس کے پاس اپنے قوی وقادر رب کی قوت کے بغیر کوئی قوت نہ تھی۔ اپنے غنی وحمید رب کے زمین وآسمان کے غیبی خزانوں کے بغیر کوئی دولت نہ تھی۔ یکہ وتنہا مکہ کی گلیوں میں، فاراں کی چوٹیوں اور بطحا کی وادیوں میں دعوت دیتا ہے کہ قُولُوْا! لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوْا! کہ لا الہ الا اللہ کہو نجات پا جاؤ گے۔ اس آواز پر پہلے صرف ایک خاتون حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ایک بوڑھا (حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ) اور ایک کمسن بچہ

Marfat.com

(حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ) لبیک کہتے ہیں۔ ان کے علاوہ سارا مکہ خون کا پیاسا ہو جاتا ہے۔ کانٹے اور پتھر، تیر و سناں، خنجر و شمشیر سب ہی اللہ تعالیٰ کے رسول کو دکھ پہنچانے کے لیے استعمال میں لائے جاتے ہیں، مگر اس کے پاس مدافعت کے لیے حق کی قوت کے علاوہ کوئی ہتھیار نہیں اور اپنا ہم خیال بنانے۔ کے لیے حق کی دلکشی کے بغیر کوئی دولت نہیں۔

اگر کسی دولت مند کو نبی بنایا ہوتا تو وہ اپنے خزانوں کے منہ کھول کر لوگوں کو اس دین کی طرف مائل کرتا۔ اگر کسی جابر بادشاہ کو رسول بنایا ہوتا تو وہ اپنی فوج کی قہرمانیوں سے اس دعوت کی دھاک دلوں پر بٹھا دیتا۔ کفار کا ایک اعتراض یہ بھی تو تھا کہ ایک بے یار و مددگار کو رسول بنانے سے کیا فائدہ؟ اگر اللہ تعالیٰ نے رسول بھیجنا ہی تھا تو کسی صاحب ثروت و سطوت کو منتخب کیا ہوتا، تا کہ کوئی اس کی طرف متوجہ بھی ہوتا۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴿۳۱﴾

(الزخرف)

کفار بولے یہ قرآن مکہ و طائف کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ نازل کیا گیا؟ تو جواب میں ارشاد فرمایا:

اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ (الزخرف: ۳۲)

''کیا تیرے رب کی رحمت وہ تقسیم کرتے ہیں؟''۔

دوسری جگہ فرمایا:

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (انعام: ۱۲۴)

''اللہ تعالیٰ بہت اچھا جانتا ہے اس دل کو جہاں اسے رسالت کا نور رکھنا ہوتا ہے''۔

اس میں حکمت یہ تھی کہ لوگ حق کو صرف حق سمجھ کر قبول کریں۔ کوئی خوف یا کوئی لالچ اسلام کو قبول کرنے کا محرک نہ ہو، ورنہ ان مقاصد جلیلہ کی تکمیل نہ ہو سکتی تھی جن کے باعث قرآن نازل فرمایا گیا تھا اور بادِ مخالف کا کوئی بھی جھونکا اس چراغ کو گل کر سکتا تھا جس کے مقدر میں ظلمت کدہ دنیا کو بقعۂ نور بنانا رقم تھا۔

Marfat.com

اسلام دین توحید ہے۔ صرف ایک خدا کی بندگی، صرف ایک رسول کی اطاعت اور صرف ایک کتابِ مجید کی پابندی۔ یہاں دورنگی کی گنجائش نہیں۔ جب تک دل اور دماغ، فکر اور تخیل، قول اور عمل، صورت اور شکل سب مل کر نہ کہیں: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، اس وقت تک صرف زبان کے کلمہ کا اعتبار نہیں۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں (1)

یہاں ایسے لوگوں کی گنجائش نہیں جن کے ماتھوں پر سجدوں کی کثرت سے گٹے پڑے ہوتے ہوں لیکن، زر و سیم انہیں زکوٰۃ دینے کی اجازت نہ دے، جو ہمیشہ روزہ رکھیں، لیکن جن کی زبان جھوٹ اور غیبت سے آلودہ ہو۔ یہاں تو ایک بات ہے سیدھی اور دوٹوک کہ اگر اس دین میں داخل ہونا ہے، تو نماز پڑھنا ہوگی، اللہ کے دیے ہوئے رزق سے اس کا حصہ نکالنا ہوگا، سچ بولنا ہوگا، حلال کھانا ہوگا، سود، شراب، جوا اور دیگر حرام اشیاء سے کلیۃً اجتناب کرنا ہوگا اور مزید برآں یہ کہ اگر کوئی نگاہِ بد چمن اسلام کی طرف اٹھی تو اس کی حفاظت کے لیے بلا تامل سر بکف میدان میں آنا ہوگا۔ اگر ہمت ہے تو بسم اللہ، ورنہ دوسرا راستہ اختیار کرو۔ کوئی جبر نہیں کوئی تشدد نہیں۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ (البقرہ۔ ۲۵۶)

''دین کے اختیار کرنے میں کوئی جبر و اکراہ نہیں۔ حق باطل سے نکھر کر واضح ہوگیا ہے''

وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۫ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا (الکھف: ۲۹)

''فرماؤ یہ حق ہے اللہ کی طرف سے، جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔ ہم نے ظالموں کے لیے آگ تیار کر رکھی ہے''۔

یہ ہے وہ دین جس کی طرف اللہ تعالیٰ کے محبوب ترین بندے اور بزرگ ترین رسول

1۔ ضرب کلیم، صفحہ 47 (کلیات اقبال اردو، صفحہ 547)

Marfat.com

نے ہر خورد و کلاں، ہر قوی و ضعیف، ہر امیر و فقیر اور ہر مرد و زن کو بلایا۔ یہ ہے وہ بار امانت جسے اٹھانے کی ہمت آسمانوں کو، زمین کو اور پہاڑوں کو نہ ہو سکی۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ (احزاب: ۷۲)

لیکن جن خوش نصیبوں نے اس دعوت کو، جس کو نہ کسی لشکر کی حمایت حاصل تھی اور نہ کسی دولت مند کی دولت کی پشت پناہی میسر تھی، صرف اس کی دلربا حقانیت اور روح افزاء صداقت کی وجہ سے تسلیم کرنے پر اظہار رضا مندی کیا، انہیں بتایا گیا کہ اس حلقۂ جاں فروشاں میں داخل ہونے سے پہلے بیعت کرنی ہو گی۔ اس وقت سے آج تک ہر داخل ہونے والے کو بیعت کرنا پڑتی ہے۔

اب دیکھنا ہے کہ بیعت کا معنی اور اس کا مفہوم کیا ہے۔ لفظ بیعت کا مادہ بَاعَ يَبِيْعُ بَيْعًا کے مادہ سے ماخوذ ہے اور بیع کہتے ہیں کسی چیز کو اپنی خوشی اور رضا سے اس کی قیمت کے عوض فروخت کر دینا۔ تو بیعت کا مفہوم یہ ہوا کہ اپنی خوشی اور رضا سے، بغیر تشدد اور اکراہ اپنا مال، اپنی جان، اپنی آبرو، اپنے افکار اور اپنے ارادے اپنے مالک حقیقی، اپنے رب جل وعلا کی رضا کے عوض فروخت کر دینا۔ اس کے بعد اپنا کچھ نہیں رہتا۔ سب اسی کا ہو جاتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ اسلام کے حصار محکم کی بنیاد خوشی اور رضا سے حق کو حق سمجھ کر اسے قبول کرنا ہے۔

اب ذرا اس نورانی زمانہ کی طرف چلیں جب نور مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نور افشاں اور ضیاء افگن تھا اور جب یہ بیعت کا سلسلہ شروع ہوا، تاکہ بیعت کی حقیقت اور اجاگر ہو جائے اور ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ صحابہ کرام علیہم الرضوان نے اپنے مرشد علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دست مبارک پر کیسے بیعت کی؟

ہجرت سے پہلے کا ذکر ہے۔ حج کا موسم تھا۔ عرب کے گوشہ گوشہ سے لوگ حج بیت اللہ کو آئے ہوئے تھے۔ مکہ مکرمہ سے باہر دور تک وادیوں میں ان کے خیمے نصب تھے۔ حضور کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر ایسے موقع کی انتظار میں رہا کرتے تھے۔ اٹھے اور ریگستانِ عرب کی چلچلاتی

Marfat.com

دھوپ میں خیمہ خیمہ میں جا کر اسلام کی دعوت دی، لیکن لوگوں کی بے رخی اور احسان ناشناسی کا یہ عالم ہے کہ کوئی بات سننا تک گوارا نہیں کرتا۔ خضر آبِ حیات لیے ہر ایک کے پاس جاتے ہیں اور کوئی پیتا نہیں۔ مسیحا اپنے لب ہائے جاں بخش سے حیات نو ارزانی فرماتے ہیں اور مریض ہیں کہ پہچانتے نہیں۔ خفتہ بخت انسانیت کا سہاگ خود چل کر اس کے پاس آیا ہے، لیکن انسان ہے کہ آغوشِ نحوست میں لپٹے رہنے پر بضد ہے۔ دور وادی کے ایک کونے میں یثرب سے آئے ہوئے چند لوگ مصروفِ گفتگو ہیں۔ ان کے قریب پہنچ کر رحمت عالم اپنے من موہنے انداز سے یوں گویا ہوئے:

مَنْ اَنْتُمْ؟

(تم کون ہو؟)

قَالُوْا نفرٌ مِّنَ الْخزرَجِ۔

(کہنے لگے: ہم قبیلہ خزرج کے چند آدمی ہیں)

اَفَلَا تَجْلِسُوْنَ اُکَلِّمُکُمْ؟

(کیا تم بیٹھتے نہیں کہ تم سے ایک بات کرلوں؟)

قَالُوْا بَلٰی (1)

(انہوں نے کہا: ہاں، بیٹھ جاتے ہیں۔ آپ فرمائیے!)

چنانچہ وہ بیٹھ گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا، اسلام کی دعوت دی اور اپنی بے حد شیریں اور بے حد میٹھی آواز سے قرآنِ مجید کی تلاوت فرمائی جوان کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی اور ان کی روحوں کو مخمور بنا گئی۔ چنانچہ آئندہ سال پھر حاضر ہونے کا وعدہ کر کے وہ یثرب لوٹ گئے۔ ان کی تعداد چھ تھی۔ ایک سال کے بعد اسی موسم میں بارہ آدمی آئے اور انہوں نے دست ہدایت بخش نبوی پر بیعت کی (2)۔ حضرت عبادۃ بن الصامت نے جوان سعادت مندانِ ازلی میں سے ایک تھے، اس بیعت کا یوں ذکر فرمایا:

1۔ البدایہ والنہایہ، جلد 3، صفحہ 148 2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 50-149 (ملخصاً)

Marfat.com

قَالَ بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیْلَۃَ الْعَقَبَۃِ الْاُوْلٰی اَنْ لَّا نُشْرِکَ بِاللّٰہِ شَیْئًا وَّلَا نَسْرِقَ وَ لَا نَزْنِیَ وَلَا نَقْتُلَ اَوْلَادَنَا وَلَا نَاْتِیَ بِبُھْتَانٍ نَفْتَرِیْہِ بَیْنَ اَیْدِیْنَا وَ اَرْجُلِنَا وَ لَا نَعْصِیَہٗ فِیْ مَعْرُوْفٍ فَاِنْ وَفَیْتُمْ فَلَکُمُ الْجَنَّۃُ فَاِنْ غَشِیْتُمْ مِنْ ذٰلِکَ شَیْئًا فَاَمْرُکُمْ اِلَی اللّٰہِ اِنْ شَآءَ عَذَّبَ وَ اِنْ شَآءَ غَفَرَ۔ (صحیحین)(1)

''ہم نے عقبۃ الاولیٰ کی رات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ ان امور پر بیعت کی:

۱۔ ہم کسی چیز کو اللہ کا شریک نہیں بنائیں گے۔

۲۔ ہم چوری نہیں کریں گے۔

۳۔ ہم زنا نہیں کریں گے۔

۴۔ ہم اپنی اولاد کو (بھوک کے خوف یا کسی اور وجہ سے) قتل نہیں کریں گے۔

۵۔ اور ہم کسی پر بہتان نہیں لگائیں گے۔

۶۔ اور ہم حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ہر ارشاد اور ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کریں گے (کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ہر حکم معروف ہے)

اس کے بعد نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

اگر تم نے ان شرائط کو پورا کیا اور اس عہد پر ثابت قدم رہے تو تمہارے لیے جنت ہے اور اگر کسی شرط کو توڑا تو پھر تمہارا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ اگر چاہے تو سزا دے اور چاہے تو بخش دے۔ تاریخ اسلام میں اس بیعت کا نام ''بیعۃ العقبۃ الاولیٰ'' ہے۔

سرزمین یثرب (جسے کل مدینۃ الرسول بننا تھا) کے یہ جوان بخت فرزند جب لوٹے تو ایمان کی نورانی شمع بھی اپنے ساتھ لائے، جس کی تجلیوں اور تابانیوں سے یثرب کی تاریک فضا میں روشنی پھیلنے لگی۔ ان کی درخواست پر نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کو ان کی تعلیم اور اسلام کی تبلیغ کے لیے بھیج دیا(2)۔ مصعب رضی اللہ عنہ ماں باپ کا لاڈلا بیٹا، نازونزاکت کا پتلا، راحت وآرام کا پروردہ جو اپنی خوش پوشی اور لطافت

1۔ بحوالہ البدایہ والنہایہ، جلد 3، صفحہ 150 2۔ البدایہ والنہایہ، جلد 3، صفحہ 149

Marfat.com

طبع میں ضرب المثل تھا، اپنے آقا کا ارشاد سن کر ہر چیز کو پائے حقارت سے ٹھکراتا ہوا یثرب پہنچا۔ اپنے اس جسم پر جس پر کبھی ابریشم کی تار بھی بار ہوتی تھی اون کا موٹا سا کھر دار کمبل ڈالے اس سرزمین کی اصلاح میں شب و روز مشغول ہو گیا جسے قسام ازل نے اسلام کی چمن بندی کے لیے چن لیا تھا۔

اسی طرح تھوڑی سی مدت میں اللہ کا نام لینے والوں اور اس کے حبیب کی غلامی پر فخر کرنے والوں کی ایک کافی جمعیت ہو گئی۔ کفار مکہ کے دردناک مظالم، اپنے مسلمان بھائیوں کی روح فرسا مصائب و تکالیف اور اپنے محبوب مرشد علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مشکلات اور آلام کی انہیں اطلاع پہنچتی رہتی تھی۔ انہوں نے بہت برداشت کیا تھا۔ ان کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا اور ان کی قوت برداشت جواب دے رہی تھی، چنانچہ انہوں نے طے کر لیا کہ اس مہر منیر سے درخواست کی جائے کہ وہ اب مکہ کے بجائے افق یثرب سے جلوہ فگن ہو۔ چنانچہ ستر آدمیوں کا وفد اس غرض کے لیے مکہ بھیجا جاتا ہے جو وہاں پہنچ کر بارگاہِ رسالت ﷺ میں شرف نیاز حاصل کرتا ہے۔ حضور ﷺ نے وعدہ فرمایا کہ آج آدھی رات کو تمہاری ملاقات کے لیے تمہاری فرودگاہ میں آؤں گا اور وہاں تفصیل سے گفتگو ہو گی۔

رات کو اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہما جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، کو ہمراہ لے کر نبی کریم ﷺ انصار کے خیموں کا رخ فرماتے ہیں اور وہاں پہنچ کر یہ گفتگو ہوتی ہے جو حضرت جابر سے امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں نقل فرمائی ہے:

فَقُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ عَلَامَ نُبَايِعُکَ؟ قَالَ تُبَايِعُوْنِیْ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِی النَّشَاطِ وَالْکَسَلِ وَالنَّفَقَةِ فِی الْعُسْرِ وَ الْيُسْرِ وَ عَلَی الْاَمْرِ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْیِ عَنِ الْمُنْکَرِ وَ اَنْ تَقُوْلُوْا فِی اللّٰهِ لَا تَخَافُوْا فِی اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ وَ عَلٰی اَنْ تَنْصُرُوْنِیْ فَتَمْنَعُوْنِیْ اِذَا قَدِمْتُ عَلَيْکُمْ مِمَّا تَمْنَعُوْنَ مِنْهُ اَنْفُسَکُمْ وَ اَزْوَاجَکُمْ وَ اَبْنَاءَ کُمْ وَ لَکُمُ الْجَنَّةُ فَقُمْنَا اِلَيْهِ۔ (1)

1۔ بحوالہ البدایہ والنہایہ، جلد 3، صفحہ 159

Marfat.com

''پھر ہم نے عرض کی یا رسول اللہ! ہم کس چیز پر حضور ﷺ کی بیعت کریں، فرمایا: ان امور پر میری بیعت کرو:

ا۔ جوش و نشاط کا عالم ہو یا افسردگی اور کسلمندی کی کیفیت، ہر حالت میں میری اطاعت کرو گے۔

۲۔ تنگ دستی ہو یا خوشحالی، فقر و فاقہ کی شدت ہو یا دولت کی فراوانی، اللہ کے راستہ میں اپنا مال خرچ کرو گے۔

۳۔ لوگوں کو نیکی کا حکم کرو گے اور برائی سے روکو گے۔

۴۔ حق کہتے ہوئے کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خائف نہیں ہو گے۔

۵۔ اور میری مدد کرو گے اور جب میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں تو میری حفاظت کرو گے ہر اس چیز سے، جس سے تم اپنی جانوں کی، اپنی بیویوں کی اور اپنے بچوں کی حفاظت کرتے ہو۔

اور اگر تم نے ایسا کیا تو جنت تمہاری ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ہم اٹھے تاکہ بیعت کریں، لیکن عباس بن عبد المطلب جھٹ بول اٹھے۔

يَا مَعْشَرَ الْخَزْرَجِ هَلْ تَدْرُوْنَ عَلَامَ تُبَايِعُوْنَ هٰذَا الرَّجُلَ؟

قَالُوْا: نَعَمْ۔ قَالَ! اِنَّكُمْ تُبَايِعُوْنَهٗ عَلٰى حَرْبِ الْاَحْمَرِ وَ الْاَسْوَدِ مِنَ النَّاسِ فَاِنْ كُنْتُمْ تَرَوْنَ اَنَّكُمْ اِذَا اَنْهَكَتْ اَمْوَالُكُمْ مُصِيْبَةً وَاَشْرَافُكُمْ قَتْلًا اَسْلَمْتُمُوْهُ فَمِنَ الْاٰنِ فَهُوَ وَاللّٰهِ اِنْ فَعَلْتُمْ خِزْيُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَ اِنْ كُنْتُمْ تَرَوْنَ اَنَّكُمْ وَ اٰفُوْنَ لَهٗ لِمَا دَعَوْتُمُوْهُ اِلَيْهِ عَلٰى نَهْكَةِ الْاَمْوَالِ وَ قَتْلِ الْاَشْرَافِ فَخُذُوْهُ فَهُوَ وَاللّٰهِ خَيْرُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ (1)

''اے قبیلۂ خزرج کے گروہ! کیا اس جلیل القدر ہستی سے بیعت کرنے کے مآل و

1۔ البدایہ والنہایہ، جلد 3، صفحہ 162

انجام پر بھی غور کیا ہے؟ اس سے بیعت کرنے کے بعد سرخ و سیاہ تمام انسانوں سے جنگ کرنی پڑے گی۔ اگر تمہارا خیال ہو کہ جب تمہارے اموال مصیبت سے ختم ہونے لگیں اور تمہارے سرداران قوم کو قتل اور جنگ، فنا کے گھاٹ اتارنے لگے تو تم اس ذاتِ پاک کو اس کے دشمنوں کے سپرد کردو گے، تو آج ہی اس بیعت کے قریب نہ پھٹکو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو بخدا! دنیا و آخرت میں ذلیل و رسوا ہو گے''۔

اگر تمہیں یقین ہے کہ تم اپنے مال و دولت کی بربادی اور اپنے بہادروں اور سرداروں کی ہلاکت کے باوجود اس بیعت پر ثابت قدم رہو، تو بسم اللہ! اس ذاتِ پاک کو اپنے ہاں لے چلو۔ رب ذوالجلال کی قسم! یہ دنیا و آخرت کی سب سے بڑی نعمت ہے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے کتنی دور اندیشی اور کتنی پتے کی بات کہی۔ کس جرأت سے حقائق کے ہولناک چہرہ سے نقاب الٹا۔ بھیانک مستقبل کی کس طرح صحیح تصویر کشی کی کہ صرف ایک شخص سے محبت کرنے کا انجام ساری دنیا سے عداوت تھی۔ اس جرمِ عشق کی سزا یہ تھی کہ اپنی دولت، اپنی ثروت لٹتی ہوئی دیکھ کر خاموش رہنا ضروری تھا اور اپنے نوجوان فرزندوں اور بہادر عزیزوں کو خاک و خون میں مرغ بسمل کی طرح تڑپتے ہوئے دیکھ کر خاموش رہنا شرطِ اخلاص تھی۔ کیا یہ سودا سود مند تھا اور کیا یہ تجارت نفع بخش تھی؟ بے شک یہ بہت غور طلب بات تھی، لیکن خاندانِ خزرج کے بلند اقبال فرزند یہ پہلے ہی طے کر کے آئے تھے۔ انہوں نے جان و مال، دل و دماغ نثار ابروئے جاناں کرنے کا عزم کرنے کے بعد ادھر کا رخ کیا تھا۔ وہ اللہ کے حبیب کی حفاظت کے لیے اپنی روحوں کا قلعہ بنانے کے بعد دعوت دینے آئے تھے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی بات سن کر سب بیک زبان پکار اٹھے:

فَاِنَّا نَاْخُذُهٗ عَلٰی مُصِیْبَةِ الْاَمْوَالِ وَ قَتْلِ الْاَشْرَافِ۔ (1)

''ہاں، ہم حضور کو لے جاتے ہیں۔ خواہ ہمارے اموال برباد ہو جائیں اور خواہ ہمارے سرداروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے''۔

1۔ البدایہ والنہایہ، جلد 3، صفحہ 162

Marfat.com

گویا وہ کہہ رہے تھے۔

کروں تیرے نام پہ جاں فدا نہ بس ایک جاں دو جہاں فدا

دو جہاں سے بھی نہیں جی بھرا کروں کیا کروڑوں جہاں نہیں (1)

عاشق مسکیں سب کچھ کر سکتا ہے، لیکن ایک چیز اس کے بس کی نہیں۔ اس سے ہجر کے صدمے اور جدائی کی بے تابیاں برداشت نہیں ہو سکتیں۔ وہ فراق کے تصور سے ہی بے چین ہو جاتا ہے۔ جب یہ گفتگو ہو رہی تھی تو حضرت ابوالہیثم بن التیہان کچھ سوچ کر تڑپ اٹھے اور تاب ضبط نہ لا کر عرض کرنے لگے:

يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ...... فَهَلْ عَسَيْتَ اِنْ فَعَلْنَا ذٰلِکَ ثُمَّ اَظْهَرَکَ اللّٰهُ اَنْ تَرْجِعَ اِلٰى قَوْمٍ وَ تَدَعَنَا۔ قَالَ فَتَبَسَّمَ رَسُوْلُ اللّٰه صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ اَنَا مِنْكُمْ وَ اَنْتُمْ مِنِّىْ۔ (2)

''اے اللہ کے رسول! اگر ہم اس بیعت پر ثابت قدم رہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ حضور ﷺ کو سب پر غالب کر دے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ حضور ﷺ اپنی قوم کی طرف لوٹ جائیں اور ہمیں چھوڑ جائیں۔

یہ سن کر لب جاں بخش مصطفیٰ ﷺ پر ہلکی سی دلنواز مسکراہٹ آ گئی اور پھر فرمایا: اے میرے جانثار انصار! میں تمہارا ہوں اور تم میرے ہو''۔

یہ الفاظ سن کر انصار کے کیف و مستی کا کیا عالم ہوا ہوگا۔ یہ ان کے دل جانیں یا ان کا رحیم و کریم رب جس نے اپنے کرم سے ان کو اس بے نظیر عزت اور اس بے مثل نعمت سے سرفراز فرمایا۔ اس کے بعد:

قَالُوْا اُبْسُطْ يَدَکَ فَبَسَطَ يَدَهٗ فَبَايَعُوْهُ۔ (البداية والنهاية، ج ۳، ص ۱۶۲)

انہوں نے عرض کی کہ اپنا دست مبارک پھیلائیں، چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے دست

1۔ حدائق بخشش، جلد 1، صفحہ 72، مطبوعہ اشتیاق مشتاق پرنٹرز لاہور

3۔ البدایہ والنہایہ، جلد 3، صفحہ 161

مبارک پھیلایا اور ان تمام نے ان شرطوں پر بیعت کی جن کا ذکر قبل ازیں گزر چکا ہے۔ شمع اسلام کے ان پروانوں سے ان سخت شرائط پر بیعت کرنے کا اس وقت مطالبہ کیا جبکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ابھی مکہ میں تھے اور طائف کے اوباشوں نے جو پتھروں کی بارش کی تھی ان نورانی پنڈلیوں پر ان کے زخموں کے نشان ابھی تازہ تھے جبکہ اسلام انتہائی بے بسی اور بے کسی کے دور سے گزر رہا تھا۔ کیا کوئی شخص، جسے عقل سے دور کا بھی واسطہ ہو، کہہ سکتا ہے کہ صحابہ نے کسی کے خوف سے یا کسی لالچ سے اس دین کو قبول کیا تھا؟

اس تفصیل کے بعد بیعت کا مفہوم واضح ہو گیا کہ بیعت پیمان سرفروشی ہے اور عہد جانبازی ہے اور جو بیعت کا مفہوم اس کے علاوہ کچھ اور سمجھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں اور انہیں اس غلطی کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

آیئے! ذرا حال کی بلندیوں سے ماضی کے دامن میں چھپی ہوئی اس دنیا کو تو دیکھیں جہاں یہ سرفروشی کا عہد اور جانثاری کا پیمان کرنے والے بسا کرتے ہیں۔ کچھ ہمیں بھی معلوم تو ہو کہ انہوں نے اس بیعت کی کہاں تک لاج رکھی اور اپنے قول کا کہاں تک احترام کیا۔

مشرکین مکہ بدر اور احد کے میدانوں میں دیکھ چکے تھے کہ ان کی خارا گداز شمشیریں، زہر میں بجھے ہوئے تیر اور جگر دوز نیزے ان مٹھی بھر نہتے مسلمانوں کے ایمان کو متزلزل نہیں کر سکے۔ اب وہ ایک خوفناک سازش کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ مدینہ کے یہودی انہیں اپنی امداد کا یقین دلا چکے تھے۔ عرب کے دوسرے قبائل کو وہ لات و ہبل کی عزت کی قسمیں دے کر مسلمانوں کے خلاف بھڑکا رہے تھے۔ جب عرب قبائل اپنے بتوں کی ناموس پر کٹ مرنے کی قسمیں کھا کر قریش کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے اور یہود کا بھی پیغام آ گیا کہ تم باہر سے مدینہ پر حملہ کرو، ہم پیچھے سے مسلمانوں کی پشت میں خنجر گھونپ دیں گے تو یہ ٹڈی دل لشکر چمن اسلام کو برباد کر دینے کے عزم سے طوفان کی سی تندی اور تیزی کے ساتھ روانہ ہوا۔

مشرکین کی اس متفقہ یلغار کو روکنے کے لیے مدینہ طیبہ کے ارد گرد خندق کھودنے کی تجویز کی گئی۔ اللہ اللہ! وہ بھی کیا سہانا منظر تھا، جسے دیکھ دیکھ کر فرشتے بھی دم بخود ہوئے

Marfat.com

جاتے تھے۔ سردی کا موسم تھا، بلا کی سردی تھی، ٹھنڈی ہوا کے تیز جھونکے فراٹے بھرتے ہوئے ادھر سے ادھر نکل جاتے تھے اور قدسیوں کا ایک گروہ ہاتھ میں کدالیں لیے مدینہ کی پتھریلی زمین میں خندق کھود رہا تھا۔ کئی دن سے فاقہ تھا۔ مسلسل جاں گسل کام کے باوجود وجد و مستی کی کیفیت طاری تھی۔ اللہ کے نام کو بلند کرنے کا ولولہ، حق کی حفاظت کا جوش، اپنے مرشد کی ناموس پر کٹ مرنے کی بے چین تمنائیں اور اس بیعت یعنی پیمانِ سرفروشی کا پاس یوں بے خود کیے تھا کہ نہ بھوک ستاتی تھی اور نہ تھکاوٹ کا احساس تھا۔ یہ تسلیم و رضا کے پیکر تکالیف و مصائب کے ہجوم میں صرف مسکرانا جانتے تھے۔ ان صبر و سکون کی چٹانوں نے تو خطرات کے طوفانوں کو صرف للکارنا سیکھا تھا۔

اور ان کی تسلی کے لیے یہ کیا کم تھا کہ اللہ کا محبوب اور ان کا ہادی ان کی طرح ہاتھ میں کدال لیے ہوئے ان کے ساتھ خندق کھود رہا تھا۔ درختوں کا پتہ پتہ اور زمین کا ذرہ ذرہ اس منظر کو دیکھ کر اشھد ان محمد رسول اللہ ﷺ کا نعرہ لگا رہا تھا۔

چشم فلک پیر نے کئی شہنشاہ اور کئی پر ہیبت سپہ سالار دیکھے ہیں۔ اس خاکدان میں تربیت اخلاق کے ان گنت معلم پیدا ہوئے۔ یہ فضا سحر بیان مقررین کی ساحرانہ تقریروں سے معمور ہے۔ انسانیت نے مساوات و حریت کے بے شمار ثنا خواں اور بندہ و آقا، حاکم و محکوم، امیر و فقیر کے امتیازات باطلہ کو مٹانے والے لاتعداد مدعی دیکھے ہیں، لیکن اس نبی امی فداہ ابی و امی ﷺ کی شان ہی نرالی ہے۔ کیا کسی نے ایسی ہستی بھی دیکھی جو سلطانِ عالم ہونے کے باوجود بھوک کے باعث پیٹ پر پتھر باندھے ہو، جو اپنی فوج کا محبوب سالار ہونے کے باوجود اپنے سپاہیوں کے ساتھ مل کر خندق کھود رہا ہو؟ کیا کسی کان نے ایسی آواز بھی سنی جس میں کوثر و سلسبیل کی مٹھاس گھل کر آئی ہو؟ کیا اس کے بغیر اس جیسا کوئی مساوات و حریت کا حامی پیدا ہوا؟ جس کا ہر قول اور ہر عمل ان غیر طبعی امتیازات کے خرمن پر بجلی بن کر کوندا ہو اور انہیں راکھ کا ڈھیر بنا گیا ہو۔ ہاں، اے چشم فلک! دیکھ اور بار بار دیکھ، تجھے اس کملی والے کی نظیر نہیں ملے گی۔ اے مؤرخ کی دور بین نگاہ! تاریخ عالم کی بار بار

ورق گردانی کر تجھے اس رسول عربی کا مثیل نہیں ملے گا۔

کڑاکے کی سردی پڑ رہی ہے، ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں اور پاکبازوں کا یہ گروہ خندق کھود رہا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ دل فریب منظر دیکھ کر فرماتے ہیں:

اَللّٰھُمَّ اِنَّ الْعَیْشَ عَیْشُ الْاٰخِرَۃِ فَاغْفِرِ الْاَنْصَارَ وَالْمُھَاجِرَۃَ۔

"اے اللہ! زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔ اپنے فضل وکرم سے انصار اور مہاجرین کو بخش دے"۔

یہ دل آویز اور رسیلی آواز سن کر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور سب مل کر اپنا عہد جانبازی بلند آواز سے یوں دہرانے لگتے ہیں کہ فضا میں تھرتھری آجاتی ہے

نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا مُحَمَّدًا

عَلٰی الْجِھَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدًا (1)

ہم وہ وفا شعار ہیں جنہوں نے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ مبارک پر زندگی کے آخری سانس تک جہاد کرنے کی بیعت کی ہے۔

جب انہوں نے اپنی ثابت قدمی کا ثبوت پیش کر دیا تو پھر نصرتِ خداوندی ان کی دستگیری کو آئی۔ آندھی اور بارش کے طوفانوں نے کفار کے خیمے اکھیڑ کر پھینک دیے۔ ان کے جانور رسے تڑا تڑا کر بھاگ رہے تھے۔ ان کی صفوں میں کھلبلی مچ گئی۔ دل ان کے سینوں میں خوف وہراس سے بیٹھے جاتے تھے۔ ابر آلود رات کے اندھیروں میں وہ سب سامان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ جب صبح طلوع ہوئی تو مسلمانوں نے دیکھا کہ خیمے اکھڑے پڑے ہیں۔ سامان بکھرا پڑا ہے اور کفار کے لشکر جرار کا نشان تک باقی نہیں، تو اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کے ترانے گاتے ہوئے مظفر ومنصور اپنے گھروں کو لوٹے۔

صحابہ کرام کی زندگی کا ہر لمحہ شہادت دیتا ہے کہ انہوں نے اسلام کی بیعت سچے دل سے

1۔ البدایہ والنہایہ، جلد 4، صفحہ 95

Marfat.com

کی تھی اور بیعت کرتے وقت اور اس کے بعد انہوں نے نہ اپنے رب سے، نہ اس کے رسول سے دھوکہ کیا تھا اور نہ اپنے آپ کو فریب دیا تھا۔ طوالت کا خوف ہے اور اسی ایک واقعہ پر اکتفا کرتا ہوں۔

دامانِ نگاہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گل چیں تو از تنگی داماں گلہ دارد

کہیں میری مائیں اور بہنیں یہ خیال نہ کریں کہ یہ پابندیاں اور یہ شرطیں فقط مردوں کے لیے ہیں اور ہم تو بغیر کسی قید و شرط کے امت محمدیہ میں داخل ہو سکتی ہیں۔ نہیں یہ خیال غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ کا پاک رسول مردوں اور عورتوں کو برابر طور پر ہدایت کا پیغام دینے کے لیے بھیجا گیا تھا، جس طرح یہ بیعت ہر مرد سے اسلام قبول کرتے وقت لی جاتی تھی اسی طرح عورتوں سے بھی لی جاتی تھی۔ جیسے حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے:

قَالَتْ لَمَّا قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم الْمَدِیْنَةَ جَمَعَ بَیْنَ نِسَاءِ الْاَنْصَارِ فِیْ بَیْتٍ ثُمَّ اَرْسَلَ اِلَیْنَا عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ فَقَامَ عَلَی الْبَابِ فَسَلَّمَ عَلَیْنَا فَرَدَدْنَا عَلَیْهِ ثُمَّ قَالَ اَنَا رَسُوْلُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم اِلَیْكُنَّ۔ قَالَتْ فَقُلْنَا! مَرْحَبًا بِرَسُوْلِ اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم وَ بِرَسُوْلِ رَسُوْلِ اللّٰہِ۔ فَقَالَ! تُبَایِعْنَ عَلٰی اَنْ لَّا تُشْرِكْنَ بِاللّٰہِ شَیْئًا وَّلَا تَسْرِقْنَ وَلَا تَزْنِیْنَ قَالَتْ قُلْنَا: نَعَمْ۔ قَالَ! فَمَدَّ یَدَهٗ مِنْ خَارِجِ الْبَیْتِ وَ مَدَدْنَا اَیْدِیَنَا مِنْ دَاخِلِ الْبَیْتِ ثُمَّ قَالَ: اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ۔ (1)

''حضرت ام عطیہ نے کہا کہ جب رسول کریم ﷺ مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو انصار کی تمام عورتوں کو ایک مکان میں جمع کیا، پھر ہماری طرف حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ آپ دروازے پر آ کر کھڑے ہوئے اور ہمیں سلام کیا۔ ہم سب نے اس سلام کا جواب دیا، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے مدینہ کی خواتین! میں تمہاری

1۔ تفسیر طبری، جلد 28، صفحہ 53، مطبوعہ مطبعۃ الکبریٰ الامیریہ مصر

Marfat.com

طرف اللہ کے رسول کا قاصد بن کر آیا ہوں تو ہم سب عورتوں نے کہا: اللہ کے رسول علیہ السلام کو بھی مرحبا اور اس کے قاصد کو بھی مرحبا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کیا تم ان شرائط پر اللہ کے رسول کی بیعت کرتی ہو کہ:

۱۔ اللہ تعالیٰ کو وحدہٗ لاشریک مانو گی اور اس کا کسی کو شریک نہیں بناؤ گی۔

۲۔ چوری نہیں کرو گی۔

۳۔ اور بدکاری نہیں کرو گی۔

ہم سب نے کہا کہ ہم ان شرائط پر بیعت کرنے کے لیے بسر وچشم حاضر ہیں۔ پھر آپ نے اپنا ہاتھ گھر کے باہر سے بڑھایا اور ہم نے اپنے ہاتھ اندر سے بڑھائے اور بیعت کی، پھر فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے کہا: اے ہمارے رب! اس بیعت پر گواہ تو ہے"۔

عورتوں کی بیعت کا ذکر تو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نہایت وضاحت سے فرمایا ہے جس کے بعد کسی شبہ کی گنجائش تک نہیں رہتی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَكَ عَلٰۤى اَنْ لَّا یُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَیْـٴًـا وَّ لَا یَسْرِقْنَ وَ لَا یَزْنِیْنَ وَ لَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَ لَا یَاْتِیْنَ بِبُهْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَهٗ بَیْنَ اَیْدِیْهِنَّ وَ اَرْجُلِهِنَّ وَ لَا یَعْصِیْنَكَ فِیْ مَعْرُوْفٍ فَبَایِعْهُنَّ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۲﴾ (الممتحنہ)

"اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم! جب مومن عورتیں (ان شرطوں پر) بیعت کرنے کے لیے آئیں کہ:

۱۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گی۔

۲۔ چوری نہیں کریں گی۔

۳۔ بدکاری نہیں کریں گی۔

۴۔ اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی۔

۵۔ کسی پر جھوٹی تہمت نہیں لگائیں گی۔

Marfat.com

٦۔ اور کسی نیک کام میں آپ کی نافرمانی نہیں کریں گی۔

اگر ان شرائط پر وہ بیعت کرنے پر رضامند ہوں، تو ان کو بیعت کا شرف بخشیے اور اللہ تعالیٰ سے ان کی بخشش اور مغفرت طلب کیجئے۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہت ہی بخشنے والا اور بہت ہی رحم کرنے والا ہے''۔

آیت کریمہ کے اس حصہ پر وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ۖ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وہ حضرات بھی ذرا غور فرماویں جو نبی اکرم ﷺ سے توسل کرنے والوں کو مشرک اور معلوم نہیں کیا کیا کہہ جانے کے عادی ہیں۔ کیا یہ آیت پاک شاہد نہیں کہ حضور کریم ﷺ کے دست دعا اٹھانے سے

اجابت از درِ حق بہرِ استقبال مے آید

(کہ مقبولیت بارگاہِ الٰہی سے استقبال کرنے آتی ہے) ان کی مغفرت طلبی سے گناہ بخش دیے جاتے ہیں، دوزخ کا عذاب حرام کر دیا جاتا ہے اور جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور فردوس کی دائمی نعمتیں عطا کی جاتی ہیں۔ کچھ سوچو تو، جس کی زبانِ پاک سے نکلی ہوئی درخواست سے آخرت کا عذاب الیم ٹل سکتا ہے، آتش جہنم سرد ہو سکتی ہے تو کیا اگر اس کے ہاتھ اٹھیں تو یہ دنیا کی مصیبتیں نہیں ٹل سکتیں؟ جس کے قلب رحمت پناہ سے نکلی ہوئی دعا سے اللہ تعالیٰ جنت کی نعیم مقیم بخش دیتا ہے کیا اگر وہ بارگاہِ ذوالجلال والاکرام میں کسی دنیاوی نعمت کے لیے التجاء کرے تو کیا وہ التجاء مقبول نہیں ہوگی؟ اس کے دامانِ رحمت میں پناہ لینے سے ضرور مصائب کی ڈراونی گھٹائیں چھٹ جائیں گی اور یقیناً ابر کرم گوہر بار ہوگا۔

وہی رب ہے جس نے تجھ کو ہمہ تن کرم بنایا
ہمیں بھیک مانگنے کو تیرا آستاں بتایا تجھے حمد ہے خدایا (1)

اے رضا کارانِ جند اللہ! اے نیاز مندانِ خواجگان چشت! اس تفصیل سے میرا مقصد یہ ہے کہ بیعت کی حقیقت اور اس کی ماہیت آپ کے ذہن نشین کرادوں۔

1۔ حدائق بخشش، جلد 2، صفحہ 254

Marfat.com

یہ بیعت جو آج ہم اپنے پیر و مرشد کے ہاتھ پر کرتے ہیں یہ صحابہ کرام کی سنت ہے۔ یہ وہی بیعت ہے جو صحابہ نے دست ہدایت بخش مصطفوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کی تھی، یعنی اس کی وہی شرطیں ہیں، اس کی وہی قیود ہیں اور اس کی وہی ذمہ داریاں ہیں۔ بیعت کرنے کے بعد انسان اپنا سب کچھ فروخت کر دیتا ہے۔ اب اسے یہ اختیار نہیں رہتا کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے مال یا اپنی جان میں تصرف کرے۔ اب اس کی نگاہ کی حرکت اور دل کے ارادے اور دماغ کی تفکیر سب اپنے مالک حقیقی کی رضا کے لیے وقف ہوتے ہیں۔ مبارک ہیں وہ لوگ جنہیں یہ شرف بخشا جائے۔ بلند اقبال ہیں وہ روحیں جنہیں یہ سعادت نصیب ہو، لیکن مجھے نہایت افسوس سے عرض کرنا پڑتا ہے کہ ہم میں بہت سے لوگ بیعت کرتے ہیں، لیکن اس نعمت عظمٰی اور شرفِ جلیل کی قدر نہیں کرتے اور بدقسمتی سے بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اس غلط فہمی میں ہیں کہ کسی کے ساتھ بیعت کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اب نماز و روزہ کی پابندی سے بھی آزاد ہو گئے۔ اگر کوئی شخص اپنے ساتھ بیعت کرنے والوں سے ایسا کہتا ہے تو سن لو کہ وہ جھوٹا ہے اور اگر کوئی مرید ایسا سمجھتا ہے تو سن لو! کہ وہ ناسمجھ ہے۔ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑا کوئی پیر نہیں اور صحابہ کرام سے زیادہ مخلص کوئی مرید نہیں۔ نہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ سے ایسا کہا اور نہ صحابہ نے ایسا سمجھا، بلکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی نورِ نظر لخت جگر فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کو یہ وصیت فرمائی تھی:

اے میری لخت جگر! ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن سب لوگ تو اپنے ساتھ نیک عمل لے کر آئیں اور تو یہ کہتی ہوئی آئے کہ میں رسول کی بیٹی ہوں۔ (1)

اے اللہ کے بندو! اے اس کے رسول کے غلامو!! اور اے اس مردِ باخدا کے دست مبارک پر بیعت کرنے والو!!! اگر دنیا و آخرت کی کامرانی اور فلاح چاہتے ہو تو اس بیعت کا مطلب سمجھو، اسے ایک کھیل اور ایک بے جان رسم نہ بناؤ۔ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے باز آجاؤ اور اس کی اور اس کے رسول کی اطاعت میں کوشاں رہو۔ اس کی رحمت کے خزانے اپنا

1۔ تفسیر در منثور، سورۂ شعراء، زیر آیت وانذر عشیرتک الاقربین، جلد 5، صفحہ 80-179، دار الکتب العلمیہ بیروت

Marfat.com

منہ کھول دیں گے اور اس کی نوازشیں تم پر سایہ فگن رہیں گی اور اگر بیعت کر کے اس کو توڑ دیا اور اس پر ثابت قدم نہ رہے یعنی بیعت کرنے کے بعد بھی نفس کے غلام اور شیطان کے فرمانبردار بنے رہے تو سن لو اللہ کا عذاب بہت دردناک ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۰﴾ (الفتح)

"اے اللہ کے محبوب! جو لوگ تجھ سے بیعت کرتے ہیں وہ حقیقت میں اللہ سے بیعت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔ جس نے اس بیعت کو توڑ دیا تو اس کا وبال اس کے نفس پر ہے اور جس نے اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کیا تو اللہ تعالیٰ اسے بہت جلد اجر عظیم عطا فرمائے گا"۔

اس گزارش کو ختم کرنے سے پہلے ایک خصوصی درخواست جند اللہ کے ان مجاہدین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے آج پورے دو سال پہلے ٹھیک اسی تاریخ کو بالکل اسی جگہ پر اسلام کی عزت پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کی قسم اٹھائی تھی، وہ اپنے گریبان میں سر جھکا کر سوچنے کے بعد بتائیں کہ کیا وہ اس دن کے بعد اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کریم ﷺ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں ثابت قدم رہے ہیں یا نہیں۔ اگر جواب اثبات میں ہے تو انہیں لاکھ لاکھ مبارک ہو، لیکن اگر شیطان کے وسوسوں نے ثابت قدم نہیں رہنے دیا اور نفس کی فریب دہی سے وہ کسی نافرمانی کے مرتکب ہوئے ہیں تو بہت افسوس اور شرم کی بات ہے۔ ہمیں پھر توبہ کرنی چاہیے اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا مانگنی چاہیے۔ ابھی وقت ہے۔ اگر یہ فرصت بھی ہم نے کھو دی تو پھر کیا ہوگا؟ اگر آپ کو شوق ہے کہ آپ کا مال اللہ تعالیٰ اپنے دین کے لیے قبول فرمائے تو اس کی زکوٰۃ نکالا کرو اور حرام مال اپنی پاک کمائی میں نہ ملایا کرو۔ اگر تمہاری یہ تمنا سچی ہے کہ تمہاری جان اللہ تعالیٰ کے راستہ میں نثار ہو تو اسے گناہوں سے پلید نہ کیا کرو بلکہ ندامت کے آنسوؤں سے اسے دھو کر اللہ

Marfat.com

تعالیٰ کی یاد اور ذکر سے اسے پاک بناؤ۔ تب تمہارا مال اور تمہاری جان بارگاہِ الٰہی میں شرفِ قبولیت حاصل کر سکے گی۔ حدیث شریف میں ہے:

إِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ وَّلَا يَقْبَلُ اِلَّا طَيِّبًا۔ (1)

اللہ تعالیٰ خود پاک ہے اور صرف پاک چیز کو قبول فرماتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق بخشے کہ ہم اپنے مال اور اپنی جان کو ایسا پاک بنا سکیں کہ اس کی بارگاہِ اقدس میں وہ قبول ہو جائیں۔

اَللّٰهُمَّ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ بِجَاهِ حَبِيْبِكَ رَحْمَةٍ لِّلْعَالَمِيْنَ وَ عَلٰى آلِهِ الطَّيِّبِيْنَ وَ اَصْحَابِهِ الْاَكْرَمِيْنَ۔

يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا
عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

محمد کرم شاہ

۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۲ھ

۴۹ باب الوزیر۔ درب الاحمر۔ القاہرہ

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ بقرہ، جلد 2، صفحہ 123

Marfat.com

ثانی لاثانی حضرت خواجہ محمد دین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سپہر ولایت کے آفتاب عالم تاب کی کرنوں سے کئی سنگ خارا، رشک لعل و گوہر بن گئے۔ برصغیر کے متعدد گوشوں میں بے شمار چراغ نور افشانی کرنے لگے، جن کو اس شمس نورانی نے ضیاء بار کیا تھا۔ آپ کے خلفاء کا شمار بہت مشکل ہے۔ ہر ایک خصوصی شان اور منفرد آن بان کا مالک تھا، لیکن ان تمام خلفائے گرامی کے سردار اور اس گلدستۂ معرفت کے گل سر سبز حضرت خواجہ دلنواز، مولانا محمد دین المعروف بحضرت ثانی لاثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔

حضرت خواجہ شمس العارفین قدس سرہٗ کے تین فرزند تھے۔ حضرت مولانا محمد دین صاحب، حضرت صاحبزادہ فضل الدین صاحب، حضرت صاحبزادہ شعاع الدین صاحب(1) ان میں سے سب سے بڑے حضرت خواجہ محمد دین صاحب تھے۔ ان کی بیعت اپنے والد بزرگوار حضرت خواجہ شمس العارفین سے تھی اور آپ نے ہی ان کو خلافت بھی مرحمت فرمائی تھی اور اپنی زندگی میں اپنے آستانہ عالیہ کی سجادگی کے لیے منتخب فرما دیا تھا اور حضرت پیر پٹھان کے جانشین حضرت خواجہ کریم نے بھی اس انتخاب کی توثیق فرما دی تھی۔

اعلیٰ حضرت نے ۲۴ صفر ۱۳۰۰ ہجری کو دارِ فانی سے دارالبقاء کی طرف رحلت فرمائی(2) اور حضرت کے ارشاد کے مطابق خواجہ محمد دین صاحب مسند آرائے سیال شریف ہوئے۔ جب آپ تونسہ شریف حاضر ہوئے تو حضرت خواجہ کریم نے، حضرت کو خلعت خلافت بھی مرحمت کی اور دستار فقر و درویشی سے بھی سرفراز فرمایا۔

آپ شکل و صورت میں اور خلق و سیرت میں اپنے والد ماجد کا عکس جمیل تھے۔ آپ کی ولادت ۱۲۵۳ھ (3) بمطابق ۱۸۳۷ء میں سیال شریف میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی

1۔ انوار شمسیہ، تالیف مولانا امیر بخش، صفحہ 67-16، مکتبہ ضیاء شمس الاسلام سیال شریف

2۔ مرآۃ العاشقین، صفحہ 12-229، مطبوع مصطفائی لاہور 3۔ انوار شمسیہ، صفحہ 76

ہوئی۔ اس کے بعد اعلیٰ حضرت کے ارشاد کے مطابق موضع سلیانہ ضلع جھنگ میں تحصیل علم کے لیے تشریف لے گئے۔ وہاں حضرت مولانا فتح محمد صاحب کا درس تھا، ان کے علاوہ دیگر علماء بھی وہاں تدریس کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ وہاں سے تکمیل علم کے بعد واپس تشریف لے آئے اور بعض کتب توحید و تصوف حضرت مولانا معظم الدین مرولوی سے پڑھیں اور مقامات سلوک اپنے والد بزرگوار کی زیر تربیت طے فرمائے اور آنجناب کی خصوصی توجہ کے باعث عشق و محبت اور ذوق وشوق کے اس اعلیٰ وارفع مقام پر خیمہ زن ہوئے کہ جہاں پر کسی کو نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت بھی نہیں ہوئی۔ آپ کا عہد ہمایوں ذوق و شوق اور کیف و مستی کا عہد تھا۔ ہزاروں با کمال بزرگ جنہوں نے حضرت سیالوی کے دست مبارک سے جام محبت پیا تھا، موجود تھے اور ہر وقت اپنے شیخ کے تصور میں مستغرق رہتے تھے۔ محبت الٰہی اور عشق مصطفوی ﷺ کا ایک ایسا درد تھا کہ ہر کہ ومہ پر بے خودی کا عالم طاری تھا۔ آستانہ عالیہ پر ایک بہت بڑا باغ تھا۔ اس باغ کے ہر پودے کے نیچے کوئی نہ کوئی درویش مصلیٰ بچھائے مصروف ذکر وفکر رہا کرتا تھا۔ کہیں ''اللہ ہو'' کی صدا بلند ہو رہی تھی، کہیں کلمۂ شہادت کا ورد ہو رہا تھا، کہیں دلائل الخیرات شریف کی منزل پڑھی جا رہی تھی اور کہیں قرآنِ کریم کی تلاوت ہو رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ پتہ پتہ ذکر الٰہی میں محو ہے اور ساری فضا تجلیات الٰہی کی جلوہ گاہ بنی ہوئی ہے۔

آپ کے عہد میں سلسلہ چشتیہ کو بڑی ترقی ہوئی۔ ملک کے دور دراز گوشوں سے بندگانِ خدا فقیر کے آستانہ عالیہ کی طرف کھچے چلے آرہے تھے۔ قافلوں کے قافلے حاضر خدمت ہوتے اور مئے محبت سے مخمور وسرشار ہو کر اپنے گھروں کو واپس لوٹتے۔ اس جاہ و جلال شاہی کے باوجود تواضع وانکسار کی کوئی انتہا نہ تھی اور شان دل نوازی کی جلوہ سامانیاں ہر دیکھنے والے کو محو حیرت کر دیا کرتی تھیں۔ آستانہ عالیہ کے ادنیٰ سے ادنیٰ نیاز مند کے ساتھ بھی وہ لطف وکرم فرماتے کہ وہ نیاز مند اپنی خاکساری پر ناز کرنے لگتا۔ اعلیٰ حضرت کے خلفاء کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے اور ان کی روحانی تربیت اور ظاہری سرپرستی

Marfat.com

میں کمال فیاضی فرماتے۔ دیکھنے والے شمس العارفین کے عہد میں اور حضرت ثانی کے عہد میں بڑی مشکل سے تمیز کر سکتے تھے۔

اپنے پیر خانہ کے ساتھ عقیدت کی انتہا نہ تھی۔ حسب معمول ہر عرس مبارک پر حاضر ہوتے اور جملہ صاحبزادگان کی خدمت میں اظہارِ عقیدت کے لیے حاضری دیتے اور یہ سلسلہ اس وقت بھی جاری رہا جب پیرانہ سالی کی وجہ سے طبیعت میں ضعف و نقاہت آ گئی اور ظاہری آنکھوں کی بینائی میں فرق آ گیا۔ سواری پر جانا ممکن نہ رہا تو اپنی چارپائی اٹھوا کر طوافِ کوئے جاناں کے لیے عازمِ سفر ہوا کرتے۔

حضرت خواجہ محمد موسیٰ تونسوی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد حضرت خواجہ حامد صاحب اور حضرت خواجہ محمود صاحب میں کچھ اختلاف رونما ہو گیا۔ حضرت خواجہ حامد آپ کے فرزند تھے اور حضرت خواجہ محمود آنجناب کے بھائی تھے اور بڑے جاہ و جلال کے مالک تھے۔ بڑے بڑے خلفاء اور عالی مرتبت رؤسا کی اکثریت حضرت خواجہ محمود صاحب کی ہمنوا تھی، لیکن حضرت ثانی لاثانی سیالوی، حضرت خواجہ حامد صاحب کو سجادہ نشینی کا حقدار سمجھتے تھے۔ آپ فرماتے کہ میں نے ان آنکھوں سے حضرت خواجہ حامد صاحب کو حضرت خواجہ کریم کا عصا پکڑے ہوئے دیکھا ہے، وہی آپ کو اندر اور باہر لے آتے تھے اور حضرت خواجہ کریم فرماتے: ''حامد میرا اسہارا ہے، حامد میری ڈنگوری (عصائے پیری) ہے''۔ تو جب میرے مرشد برحق خواجہ کریم نے خواجہ حامد صاحب کو ان القاب سے نوازا ہے تو ان کی موجودگی میں کسی اور کو سجادہ نشینی کا حقدار کیسے کہہ سکتا ہوں؟ اس بات سے حضرت خواجہ محمود رحمۃ اللہ علیہ کے خاطر عاطر میں آپ کے بارے میں کچھ رنجش پیدا ہو گئی اور آپ اپنے اندازِ شاہانہ میں اکثر مرتبہ تلخ نوائی فرمایا کرتے۔ اس کے باوجود آپ کے جذبۂ نیاز مندی میں قطعاً فرق نہ آیا۔ جب بھی تونسہ شریف کی حاضری کی سعادت حاصل کرتے، حضرت خواجہ محمود صاحب کی خدمت میں بھی حاضری دیتے اور مجلس میں جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتے اور قطعاً ان باتوں سے رنجیدہ نہ ہوتے جو ان کے شیخ کے چہیتے فرزند کی زبان سے صادر ہوتیں۔

Marfat.com

جب آپ پیرانہ سالی کے باعث بہت ضعیف ہو گئے اور چل کر حاضر ہونے کی طاقت نہ رہی تو اپنی چارپائی اٹھوا کر حضرت خواجہ محمود رحمۃ اللہ علیہ کو سلام عرض کرنے کے لیے گئے۔ آپ اس وقت بالاخانہ پر تشریف فرما تھے۔ حضرت ثانی چلنے سے معذور تھے۔ اس لیے اپنے خادم کو نذرانہ دے کر بارگاہِ محمودی میں بھیجا اور یہ درخواست بھی کی کہ خادم بڑھاپے اور کمزوری کے باعث اوپر آنے سے قاصر ہے اور بینائی سے محروم ہے، درِ اقدس پر حاضر ہے از راہِ کرم نذر قبول کی جائے۔ خادم نے جب حضرت خواجہ محمود رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آپ کا پیغامِ نیاز پیش کیا تو آپ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، مجلس سے اٹھ کھڑے ہوئے اور نیچے آپ کے پاس تشریف لائے اور آپ کو اپنے سینے سے لگالیا۔ آپ نے پھر پہلی بات دہرائی، حضرت خواجہ محمود صاحب نے فرمایا: ''سائیں تو عاجز نہیں ہے سارے سلسلہ کی عزت اور لاج تیرے ہاتھ میں ہے۔ آپ ہمارے حق میں دعا فرمایا کریں''۔(1)

تصوف کے اسرار و معارف کے بیان کرنے میں جو مہارت کاملہ آپ کو تھی اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ بات بات سے نکتہ آفرینی اور پنجابی کے اشعار کو معانی کا وہ لباس پہناتے کہ سننے والوں پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی۔

اس سلسلہ کا ایک واقعہ تو آپ حضرت صاحبزادہ عبداللہ کے مضمون میں ملاحظہ فرمائیں گے اور ایک واقعہ یہاں پیش خدمت کرتا ہوں۔

ڈاکٹر تسخیر احمد صاحب کے والد بزرگوار مولوی محمد سعید صاحب مرحوم اپنی کتاب جذبات سعید میں لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت مولانا محمد ذاکر صاحب بگوی رحمۃ اللہ علیہ بھیروی آستانہ عالیہ سیال شریف حاضر ہوئے، میں ہمرکاب تھا۔ مولانا نوافل اشراق کے بعد وظائف پڑھنے لگے۔ اسی اثناء میں میاں احمد خوشابی (مائی بانو کا شوہر) وہاں آ گئے اور کہنے لگے کہ کیا پیر کے مکان پر آ کر بھی وظائف وغیرہ پڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے؟ آپ نے کہا میاں صاحب! آپ جیسے منتہی درویشوں کا تو یہی مقام ہے، لیکن ہم ابھی مبتدی ہیں،

1۔ جذبات سعید از مولوی محمد سعید، صفحہ 14-113

ہمیں کچھ نہ کچھ اوراد پڑھنے پڑتے ہیں۔ یہ سن کر میاں صاحب پر رقت طاری ہوگئی اور ان کی مخمور آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی ٹپکنے لگے، جوش میں آ کر کہنے لگے: اس وقت میرے حضرت یہاں موجود ہوتے، میں دیکھتا کہ آپ یہاں بیٹھ کر کس طرح وظائف پڑھتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں: حضرت شمس العارفین کے عہد مبارک کی یاد تازہ ہوگئی اور دل میں ایک حسرت سی اٹھی کہ کاش! ہمیں بھی اعلیٰ حضرت کا زمانہ نصیب ہوتا۔ ہم نے بھی اس ماہ چہاردہم کا دیدار کیا ہوتا۔ اس اثناء میں ہم کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت کریم ثانی لاثانی ہمارے کمرے کے سامنے سے مشرق کی طرف خراماں خراماں تشریف لے جا رہے ہیں۔ فوراً یہ شعر وردِ زبان ہوگیا۔

دیدہ صد شکر بجا آورد از دیدن تو
سر کند سجدہ باین طرز خرامیدن تو

آپ کو دیکھتے ہی ہم تعظیماً کھڑے ہوگئے۔ حضرت غریب نواز نے نگاہِ التفات فرمائی اور ہماری طرف تشریف لائے اور بچھی ہوئی جائے نماز پر جلوہ افروز ہوئے اور یوں گویا ہوئے: "مولانا! ایک بزرگ تھے جن کا نام شاہ مراد تھا۔ اہل دل، صوفی اور پنجابی زبان کے مستند شاعر تھے۔ ان کے زمانہ میں ایک شاعر کے دماغ میں ایک مصرع آیا، لیکن بڑی کوشش اور سوچ بچار کے بعد وہ دوسرا مصرع نہ لکھ سکا۔ کئی باکمال شعراء کی خدمت میں حاضر ہوا، لیکن کسی نے یہ مشکل حل نہ کی۔ اسے معلوم ہوا کہ حضرت شاہ مراد صوفی بھی ہیں اور باکمال شاعر بھی۔ چنانچہ اس گرہ کو کھولنے کے لیے وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ قبلہ میں نے ایک مصرع موزوں کیا ہے، لیکن دوسرا مصرع موزوں نہیں ہو رہا۔ میں کئی لوگوں کے پاس گیا ہوں، لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ آپ کی شہرت سن کر آیا ہوں اور ازراہِ کرم میری یہ مشکل آسان کر دیجیے۔ آپ نے پوچھا: تو نے کون سا مصرع موزوں کیا ہے؟ تو اس شاعر نے کہا:

ہیر رانجھن نوں مل کے یار ودسو کھاں پچھوتانی کیوں؟

Marfat.com

یعنی ہیر نے جب اپنے محبوب رانجھا سے ملاقات کی تو وہ کف افسوس کیوں ملنے لگی؟

آپ نے سن کر فی البدیہہ فرمایا کہ دوسرا مصرع یوں ہونا چاہیے:

گزری دا ارمان لگیوسو، اس رانجھن باجھ دہانی کیوں؟

یعنی اسے گزری ہوئی زندگی پر افسوس ہوا کہ اس نے اسے رانجھن کے بغیر کیوں گزارا ہے۔

یہ قصہ سنانے کے بعد آپ نے مولانا کی تشفی کر دی کہ آپ کا پہلے زمانہ سے مستفیض نہ ہو سکنے پر افسوس کرنا اس ہیر و رانجھا کی ملاقات کی طرح ہے جو معشوق کے دیدار سے خوش ہو کر اپنے جامہ میں پھولی نہیں سماتی تھی، لیکن گزشتہ زمانہ کی محرومی پر ارمان بھی کرتی تھی (1) اس مضمون کو ایک فارسی شاعر نے خوب بیان کیا۔

نالہ از بہر رہائی نکند مرغِ اسیر

خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نبود

الحاج صاحبزادہ محمد رب نواز صاحب سیالوی مدظلہ نے بیان فرمایا کہ حضرت ثانی لاثانی کا عہد نورانی تھا۔ ایک عرس شریف کے موقع پر حضرت پیر صاحب گولڑوی بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ عرس کے اختتام پر آپ سے رخصت لے کر سرائے کی جانب (جہاں اس زمانہ میں مہمان ٹھہرا کرتے تھے) چلے آئے۔ حضرت ثانی غریب نواز کا پلنگ تالاب کے قریب بچھا ہوا تھا۔ آپ نے اپنے منجھلے صاحبزادے حافظ محمد عبداللہ صاحب کو بلایا اور فرمایا کہ پیر صاحب اجازت لے کر ابھی یہاں سے گئے ہیں اور وہ اس وقت سرائے میں ہوں گے۔ تم وہاں جاؤ اور پیر صاحب کے سامنے کھڑے ہو کر یہ شعر ترنم سے پڑھو۔

مائیم چشم وقف رہ انتظار دوست

بنشستہ ایم ما بسر رہ گزار دوست

یعنی ہم دوست کے انتظار کے راستہ میں سرتاپا آنکھ بن گئے ہیں اور دوست کی راہ گزر

1۔ جذبات سعید از مولوی محمد سعید، صفحہ 83-82

Marfat.com

میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ صاحبزادہ صاحب تعمیل ارشاد کے لیے سرائے میں پہنچے۔ حضرت پیر صاحب گولڑوی نفل پڑھ رہے تھے، جب آپ نفلوں سے فارغ ہوئے تو صاحبزادہ صاحب نے حسب ہدایت یہ شعر بڑے ذوق وترنم سے پڑھا۔ حضرت پیر صاحب نے جب سنا تو بے تاب ہو گئے اور ننگے پاؤں وہاں سے دوڑ پڑے۔ آپ بڑے وجد وشوق کے ساتھ جا رہے تھے کہ راستہ میں حضرت ثانی غریب نواز کو بیٹھے ہوئے دیکھا، دونوں بغلگیر ہو گئے اور دیر تک اشک افشانی ہوتی رہی۔ حضرت ثانی کی شانِ دلنوازی کا یہ ایک کرشمہ تھا اور اس وجہ سے آپ نیازمندانِ آستانہ شمس العارفین کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بن گئے تھے۔

حضرت کا لنگر بڑا وسیع تھا۔ سینکڑوں درویش جو ذکر الٰہی سیکھنے کے لیے یہاں فروکش ہوئے، ان کی خاطر مدارت میں پوری کوشش کی جاتی۔ آستانہ عالیہ پر حاضر ہونے والے مہمانوں کی آرام وآسائش کے لیے آپ ہر ممکن اہتمام فرماتے اور کوئی بعد از وقت آنے والا مہمان اور مسافر بھی بھوکا نہ رہتا۔ حضرت کا معمول تھا کہ رات کا کھانا نمازِ عشاء ادا کرنے کے بعد تناول فرماتے اور اس میں حکمت یہ تھی کہ اگر کوئی مہمان تاخیر سے آئے اور لنگر میں کھانا ختم ہو گیا ہو تو حضرت اپنا کھانا اس کو پیش کر دیتے۔ وسیع لنگر کے ساتھ ساتھ دار العلوم کی ترقی کے لیے بھی خصوصی توجہ فرماتے۔ سینکڑوں کی تعداد میں طلباء اکتسابِ علم کے لیے موجود رہتے۔ ان کی رہائش، خوراک اور تعلیم کا مفت انتظام کیا جاتا۔

آستانہ عالیہ پر جو عظیم الشان عمارات نظر آ رہی ہیں ان میں سے بیشتر حضرت کے ذوقِ لطیف اور ہمت بلند کا شاہکار ہیں۔ روضہ مقدسہ معنوی حسن وخوبی کے علاوہ صوری جاہ وجلال میں بھی عدیم النظر ہے۔ اس کی بلندی، اس کی پختگی اور اس کے اندر ماہر کاریگروں نے جو نقش ونگار اور گلکاری کی ہے، اسے دیکھ کر ایک عجیب قسم کی روحانی آسودگی محسوس ہونے لگتی ہے۔ اس کو تعمیر ہوئے ایک سو سال کا عرصہ گزرنے والا ہے، لیکن نقش ونگار کی تابنا کی میں ذرا فرق نہ آیا۔ روضہ شریف کی شرقی جانب مجلس خانہ ہے۔ اتنی وسیع، مضبوط اور خوبصورت عمارت دیکھنے میں نہیں آئی، اس کی زیبائی اور رعنائی کے پہلو بہ پہلو اس کی

Marfat.com

پختگی کو دیکھ کر دیدہ و دل منور ہو جاتے ہیں۔ الغرض حضرت کی ذات ستودہ صفات سراپا یمن و برکت اور خیر و سعادت کا منبع فیض تھی۔ کوئی آنے والا تشنہ کام واپس نہیں گیا۔ حضرت نے اپنے کارہائے نمایاں سے یہ ثابت کر دیا کہ حضرت شمس العارفین نے اپنے جانشین کا جو انتخاب فرمایا تھا وہ کتنا درست تھا۔ آپ کے کمالات، آپ کی کرامات حد شمار سے باہر ہیں۔ آپ کے اخلاقِ حسنہ، صاحب خلق عظیم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دلکش نمونہ تھے۔ آپ نے ۲ رجب المرجب ۱۳۲۷ ہجری کو دارِ فانی سے دار البقاء کی طرف رحلت فرمائی اور اپنے گرامی منزلت والد بزرگوار کے پہلو میں مدفون ہوئے۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ رحمۃ واسعۃ۔

مولوی محمد سعید صاحب نے آپ کی تاریخ وصال یوں رقم کی ہے:

ملاد دین و ملت قطب عالم شاہ محمد دین	پناہ بے پناہاں غوث اعظم شاہ محمد دین
چورخ پوشید از عالم نیاز بے نیازی اش	جہاں برہم زداز گیسوئے پرخم شاہ محمد دین
سعید زار گفتہ سال آں با سالہائے زار	بہ ہجر جان عالم فخر آدم شاہ محمد دین
''باوج چشت آمد آفتاب'' سال پیدائش	وصالش رحمت دین مجسم شاہ محمد دین
۱۲۵۴ھ	۱۳۲۷ھ (1)

حضرت کے چار صاحبزادے تھے:

۱۔ صاحبزادہ محمد امین صاحب جنہوں نے آپ کے بعد جلدی ہی ۴ رمضان ۱۳۳۰ھ کو انتقال فرمایا۔ (2)

۲۔ حضرت خواجہ ضیاء الحق والدین قدس سرہ جنہوں نے حضرت کے بعد مسند سجادگی کو زینت اور عظمت بخشی (3)، جن کا ذکر خیر آپ اس رسالہ میں ملاحظہ کریں گے۔

۳۔ حضرت صاحبزادہ حافظ محمد عبداللہ صاحب۔ ولادت ۱۳۰۷ ہجری میں، وفات ۲۶ رمضان شریف ۱۳۸۲ ہجری بروز جمعرات، تدفین جمعۃ الوداع۔ آپ بہترین حافظ تھے۔ چار گھنٹوں میں بڑی آسانی سے از اول تا آخر سارا قرآن شریف ختم کر لیا کرتے

1۔ جذبات سعید، صفحہ 158، 2۔ انوار شمسیہ، صفحہ 78 3۔ ایضاً

Marfat.com

تھے۔اس کے ساتھ ساتھ فارسی، پنجابی کے قادر الکلام اور نغز گو شاعر تھے۔آپ کا ایک مقالہ جو آپ کی بیاض سے نقل کیا گیا ہے، اس نمبر کی زینت ہے۔اس کے علاوہ گونا گوں کمالات سے اللہ تعالیٰ نے بہرہ ور فرمایا تھا۔آپ کے ایک صاحبزادے جناب مظہر الحق صاحب جواں سالی میں انتقال فرما گئے۔دوسرے صاحبزادے جناب منظور الحق صاحب اپنے خاندان کے سربراہ اور ان کے لیے سرمایہ افتخار ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز فرمائے۔آمین

۴۔حضرت صاحبزادہ حافظ محمد سعد اللہ صاحب۔آپ کے چہرہ کے خدوخال اور نقش و نگار میں دیکھنے والوں کو جمال شمس العارفین کا پرتو نظر آتا تھا۔علم مجلسی میں آپ کو کمال مہارت حاصل تھی۔روساء کی محفل ہو، علماء کی مجلس ہو یا صوفیاء کی بزم ہو، آپ کا مقام منفرد نظر آتا تھا۔آپ تمام محفل پر چھائے رہتے تھے۔ظرافت اور لطافت آپ کے کلام کی جان تھی۔تنقید فرماتے تو چیز کی تہہ تک پہنچ جاتے۔حقیقت کو بیان کرتے، لیکن اس انداز میں کہ سننے والا محظوظ ہوتا۔آستانہ عالیہ کی ناموس اور وقار کا از حد پاس تھا۔آپ کو عام پیر صاحبان میں جو بدنظمی اور فرض ناشناسی پائی جاتی ہے اس سے بڑا دکھ ہوتا اور اس کا اکثر ذکر فرمایا کرتے۔وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔

آپ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی پیدائش ۱۳۱۰ھ میں اور وصال ۵ صفر ۱۳۹۷ھ میں ہوا۔ آپ کے چار صاحبزادے ہیں۔سب سے بڑے صاحبزادہ عنایت اللہ جو صاحبزادہ خاں صاحب کے نام سے مشہور ہیں، حکومت کے ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز ہیں۔

دوسرے الحاج صاحبزادہ محمد رب نواز صاحب، یہ اپنی شکل وصورت اور عادات و اطوار میں اپنے اسلاف کا بہترین نمونہ ہیں۔دین وملت کے لیے دل میں بڑا درد رکھتے ہیں اور ہر قومی سانحہ پر پریشان و مضطرب ہو جاتے ہیں۔بظاہر آپ خاموش طبع ہیں، لیکن آپ کے نہاں خانۂ دل میں جذبات و افکار کا تلاطم برپا رہتا ہے۔گفتگو کرتے ہیں تو بڑی متانت اور وقار کے ساتھ، جس میں بڑی گہرائی اور سنجیدگی ہوتی ہے۔اوراد و وظائف کی ادائیگی

Marfat.com

بڑی پابندی سے کرتے ہیں۔ ان کی خدمت میں بیٹھنے سے قلب اور ذہن دونوں شاد کام ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس گوہر آبدار کو ہمیشہ سلامت با کرامت رکھے اور ان کے نور دیدہ حضرت صاحبزادہ حبیب نواز صاحب کو درجاتِ عالیہ پر فائز فرمائے۔ تیسرے صاحبزادہ افتخار احمد صاحب نوجوان ہیں، کام کرنے کا از حد جذبہ ہے۔ پاک دلی جو اس خاندان کی قدر مشترک ہے، سے آپ کو حظ وافر ارزانی ہوا ہے۔ زراعت میں خوب دلچسپی لیتے ہیں اور جدید بنیادوں پر زرعی فارم بنایا ہوا ہے۔ چوتھے صاحبزادہ غیاث الدین صاحب جو سب سے چھوٹے ہیں اور خدام آستانہ کے ساتھ بڑی شفقت و محبت سے پیش آتے ہیں اور دنیاوی کاموں کی انجام دہی کا بارِ گراں انہوں نے اٹھایا ہوا ہے۔

شیخ الاسلام حضرت خواجہ
محمد قمر الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ

Marfat.com

برصغیر پاک و ہند میں بسنے والے فرزندانِ اسلام کے لیے انیسویں صدی بڑے درد و کرب کی صدی تھی۔ ہندوستان کی وسیع وعریض مسلم مملکت بیسیوں چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ چکی تھی۔ ہر ریاست کا حکمران اپنی ذاتی وجاہت کے لیے یوں ازخود رفتہ ہو چکا تھا کہ اسے نہ ملت کا غم تھا، نہ ہی قوم کے آفتابِ اقبال کے غروب ہونے کا کوئی دکھ تھا۔ مسلمان اب آپس میں دست و گریبان تھے۔ دہلی شہر جو صدیوں سے ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا مرکز رہا تھا، اپنے فرمانرواؤں کی نااہلی کے باعث اپنا اثر و رسوخ کھوتا جا رہا تھا۔ اس سے بھی زیادہ المناک بات یہ تھی کہ بندۂ مومن کا رشتہ اپنے کریم رب اور اپنے رؤف و رحیم مرشد سے کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ عقیدے اور عمل کی مختلف بدعتوں نے اسلامی معاشرہ کو نڈھال کر دیا تھا۔ مسجدیں ویران تھیں، مدرسے بے چراغ تھے، خانقاہیں، جہاں کبھی اللہ کے شیر تشریف فرما ہوا کرتے تھے، اب روباہ کیش اور حقیقت اسلام سے بالکل بے بہرہ ملنگوں اور قلندروں کے تصرف میں تھیں۔

نورِ معرفت سے منور چہرے اور سجدوں کے نشانوں سے تابندہ پیشانیاں خال خال نظر آ جاتی تھیں۔ وہ چشمے خشک ہوتے جا رہے تھے جو قوموں کی کشت حیات کو سیراب کرتے ہیں۔ وہ تارے یکے بعد دیگرے ڈوبتے چلے جا رہے تھے جو زندگی کے صحراؤں میں بھٹکنے والے راہروؤں کو اپنی منزل کا نشان بتاتے ہیں۔

آپ خود سوچئے۔ جہاں امراء ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی سازشوں میں رات دن سرگرم ہوں، جہاں عوام اپنے منبع حیات سے روز بروز دور ہوتے جا رہے ہوں، وہاں عوام کی ذلت و نکبت، زوال و ادبار کے علاوہ اور کس چیز کی توقع کی جا سکتی ہے؟ وہ قوم جو اپنی تعداد کی قلت کے باوجود محض اپنے حسن عمل کے بل بوتے پر اتنے بڑے ملک پر صدیوں سے حکمرانی کرتی رہی تھی، آج اس قوم میں وہ خوبیاں قصۂ ماضی بن چکی تھیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی حکومت کا آفتاب ۱۸۵۷ء کی ایک شام کو غروب ہو گیا۔ ان محلات کی اینٹ

سے اینٹ بجا دی گئی جن میں بسنے والے اپنے خالق کو بھول چکے تھے، جن کے رات دن عیش وعشرت میں بسر ہوتے تھے، جن کے ایوانوں میں ہر لحہ ناؤ ونوش اور رقص وموسیقی کی محفلیں بپا رہتی تھیں۔ چھ ہزار میل دور سے آئے ہوئے انگریز نے اپنے خالق کے باغیوں کو بھیڑ بکری کی طرح ذبح کر دیا۔ علمائے کرام کو تختہ دار پر لٹکا دیا۔ مدرسوں کو مقفل کر دیا گیا۔ علم وحکمت کے قیمتی نوادرات کو نذرِ آتش کر دیا گیا اور عام مسلمان، انگریز اور ہندو کی دوہری غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔

ہر طرف مایوسی کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ امید کی کوئی کرن کسی گوشہ سے بھی جھانکتی نظر نہیں آتی تھی۔ لوگوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اب اسلام کا چراغ اس ملک میں دوبارہ روشن نہیں ہوگا۔ مسلمانوں کا وجود حرفِ غلط کی طرح اس ملک کی تاریخ سے محو کر دیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بھی بڑے نرالے انداز ہیں۔ جب مایوسیاں چاروں طرف سے گھیرا تنگ کر لیتی ہیں، جب محرومیاں زندہ رہنے کی حسرت بھی دل سے چھین لیتی ہیں، عین اس وقت رحمت الٰہی ایک ایسے آفتاب کے طلوع ہونے کا اہتمام فرماتی ہے جو اس شب دیجور کو صبح سعید سے بہرہ ور کرنے کا باعث بن جاتی ہے۔ اس کی شعاعوں کو وہ تابشیں مرحمت فرماتی ہے جس کی شوخیوں کو دیکھ کر سارا عالم تصویر حیرت بن کر رہ جاتا ہے۔

پنجاب کے ضلع شاہ پور کے ایک گاؤں کو جس کا نام بھی کسی کو معلوم نہ تھا، قدرت نے اپنے ایک مقبول بندے کی پیدائش کے لیے پسند فرمایا۔ ''سیال'' کی چھوٹی سی بستی میں حضرت میاں محمد یار رحمۃ اللہ علیہ کے گھر میں ایک ایسا چراغ معرفت روشن ہوا جس نے غم و حرماں کی اس تاریک رات میں چراغاں کر دیا۔ گھنے درختوں کے جھرمٹ میں چند کچے کوٹھے تھے۔ اس میں ایک ایسا مردِ سعید پیدا ہوا جس نے ایک عالم کے سوئے ہوئے بخت کو بیدار کر دیا اور لاکھوں کی بگڑی ہوئی تقدیروں کو سنوار دیا۔ ماں باپ نے اس فرزند ارجمند کا نام شمس الدین تجویز کیا۔ رحمت خداوندی نے اس کو شمس العارفین کے منصب جلیل پر فائز کیا۔ اس کے آستانہ عالیہ پر حاضر ہونے والے، ذکر الٰہی اور سنت نبوی ﷺ کی

Marfat.com

پیروی کا ذوق فراواں اور اسلام کے پرچم کو پھر اونچا لہرانے کا عزمِ جوان لے کر واپس لوٹتے۔ چند سالوں میں ملک کے طول وعرض میں ایسی خانقاہوں کا ایک جال بچھ گیا جہاں خود فراموش انسانوں کو خود شناسی اور خدا شناسی کی منزل تک پہنچانے کا اہتمام کیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پاک ہستی سے احیائے دین اور ملت کی شیرازہ بندی کا جو کام لیا اس کو دیکھ کر زمانہ ماضی کے اولوالعزم اولیائے کرام کے کارناموں کی یاد تازہ ہوگئی۔

حضرت خواجہ شمس العارفین قدس سرہٗ کے بعد آپ کے فرزند جلیل حضرت خواجہ محمد دین اپنے والد بزرگوار کی خوبیوں کا پیکر جمیل بن کر زینت بخش سجادۂ فقر ہوئے۔ آپ نے اپنے پدرِ بزرگوار کی اس تحریک کو مزید پختگی اور توانائی بخشی۔ یہ سلسلۂ فقر و درویشی رفتہ رفتہ بڑے بڑے شہروں سے گزر کر ان دور افتادہ دیہات تک پھیل گیا جو پہاڑوں اور صحراؤں میں گھرے ہوئے تھے۔

حضرت ثانی غریب نواز کے بعد آپ کے فرزند ارجمند حضرت خواجہ ضیاء الملت والدین قدس سرہٗ نے صرف آستانہ عالیہ سیال شریف کو ہی نہیں، صرف سلسلہ چشتیہ نظامیہ کو ہی نہیں بلکہ جملہ سلاسل فقر و درویشی کو چار چاند لگا دیے اور انگریز کے تسلط اور کفر کے تغلب کے خلاف اجتماعی جدوجہد کا آغاز ہوا۔ اسلام کا یہ شیر دل مجاہد، جس نے تمام عمر انگریز کے اقتدار کو ہر میدان میں للکارا تھا، صرف پینتالیس سال کی عمر میں فردوسِ بریں کو سدھارا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے خلوص کو اس طرح نوازا کہ حضرت شیخ الاسلام خواجہ محمد قمر الدین سیالوی قدس سرہٗ جیسا فرزند عظیم مرحمت فرمایا۔ پون صدی تک آپ زندگی کے افق پر چودھویں کا چاند بن کر چمکتے رہے، نور بکھیرتے رہے، ہر قسم کی ظلمتوں کو شکست پر شکست دیتے رہے اور آج آپ کے وصال پر ساری ملت اشکبار ہے۔ آپ کے نیاز مند مختلف انداز سے اپنی نیاز مندیوں کا اظہار کر رہے ہیں۔ ضیائے حرم کا یہ نمبر بھی اسی سلسلۂ نیاز و عقیدت کی ایک حقیر کڑی ہے۔

آپ کی ہمہ صفت موصوف شخصیت کے کس پہلو کا ذکر کیا جائے اور کس کا ذکر نہ کرنے پر

Marfat.com

قناعت کی جائے؟ اس گلستان جمال وکمال کے گل چینوں کے لیے یہ مرحلہ بڑا صبر آزما ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو ظاہری حسن عطا فرمایا تھا اس کی ہمیں تو کہیں نظیر نہیں ملتی۔ روشن چہرہ، اونچی بینی، چمکتی ہوئی غزالی آنکھیں، جبین سعادت کی کشادگی، ڈاڑھی مبارک کا بانکپن، قلب ونظر کو اسیر کر لینے والی تابدار زلفیں۔ جمال کی رعنائیوں کے باوجود جلالِ الٰہی کا ایسا پرتو چہرے پر ضوفگن رہتا تھا کہ بارگاہِ اقدس میں لب کشائی کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

جذبۂ جہاد رگ وپے میں ہر لحظہ موجزن رہتا تھا۔ جہاد کی تیاری کے لیے جسمانی ورزش اور شکار آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔ آپ کو قیمتی اور خوب صورت گھوڑوں سے بڑی محبت تھی۔ انمول نسل کی اپنی پسندیدہ گھوڑی کی پشت پر بیٹھ کر صبح سے شام تک ہرنوں کے تعاقب میں صحرا نوردی آپ کی بہترین تفریح تھی۔ کچھ عرصہ بازوں کے شکار کا بڑا شوق رہا۔ ان تمام مشاغل کے پیچھے حظ نفس نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ محض جہاد کی تیاری کے لیے جسمانی ریاضت مقصد اولین تھا۔ گھوڑوں سے محبت بھی صرف اس لیے تھی کہ یہ جہاد فی سبیل اللہ کا ذریعہ ہے۔ بہترین بندوق، بہترین رائفل اور بہترین ریوالور سے آپ کا شوق دیدنی تھا۔ بھاگتے ہوئے ہرنوں کو، اڑتے پرندوں کو گولی کا نشانہ بنانا، آپ کے نزدیک ایک معمولی بات تھی۔ آپ کا نشانہ خطا ہو جائے، یہ ممکن ہی نہ تھا۔

میں یقین سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان تمام سرگرمیوں کی روح کفار اور انگریز کے خلاف جذبۂ جہاد تھا جو آخر وقت تک آپ کے دل میں چٹکیاں لیتا رہا۔ اپنے رب کریم کی بارگاہ میں آپ شہادت کے لیے ہمیشہ دست بدعا رہا کرتے۔ جب کشمیر کو آزاد کرانے کے لیے جہاد شروع ہوا تو آپ نے اپنے عقیدت مندوں کو اس جہاد میں حصہ لینے کی ترغیب دی، جو سینکڑوں کی تعداد میں سب سے اگلے مورچوں پر بھارت کی فوجوں سے برسر پیکار رہے اور ان کے چھکے چھڑا دیے۔ مجاہدین کشمیر کی مالی خدمت کرنے کے علاوہ آپ نے بے شمار سپاہیوں کو اسلحہ اور بارود اپنی گرہ سے خرید کر مہیا کیا اور اس کی کبھی نمائش نہ کی۔ جب ۱۹۶۵ء کی جنگ شروع ہوئی تو آپ نے اپنے کاشانۂ اقدس کی تمام خواتین کے تمام زیورات افواجِ

Marfat.com

پاکستان کی خدمت میں پیش کر دیے اور اس بے مثال قربانی کا کبھی اظہار نہ ہونے دیا۔

لنگر شریف میں اللہ تعالیٰ کی بڑی برکت تھی۔ روز و شب سینکڑوں مہمانوں کو کھانا دیا جاتا۔ رقم جمع کرنے کا آپ کو قطعاً کوئی شوق نہ تھا۔ جو آیا خرچ ہو گیا۔ یحییٰ خان دور میں جب کالے دھن پر قابو پانے کے لیے حکومت نے اعلان کیا کہ فلاں تاریخ تک پانچ پانچ سو اور سو سو کے نوٹ واپس کر دیے جائیں تو لوگ اپنے نوٹوں کو تبدیل کرنے کے چکر میں رات دن سرگرداں اور پریشان تھے۔ قبلہ حضرت صاحب نے خود مجھے بتایا کہ میری جیب میں اس وقت صرف آٹھ آنے تھے اس لیے مجھے قطعاً کوئی فکر نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ کے بندے صرف اپنے دلوں کو ہی نہیں، اپنی جیبوں کو بھی دولت سے پاک رکھتے ہیں۔

ملک میں جب کوئی دینی یا ملی تحریک اٹھی اور اس کے لیے جانی و مالی قربانی کی ضرورت محسوس ہوئی تو اللہ تعالیٰ کا یہ بندہ اپنی ساری بے نیازیوں کے باوصف السابقون الاولون کے زمرہ میں ہمیشہ ہمیشہ پیش نظر آتا ہے۔ آپ کا جہاد صرف سیف و سناں کے جہاد تک محدود نہ تھا، بلکہ قلم و زبان سے بھی آپ حق کی سربلندی کے لیے ساری عمر مصروفِ عمل رہے۔ باطل کسی روپ میں اور ملک کے کسی کونہ میں اگر سر اٹھاتا تو حضرت خواجہ قمرالدین کا ڈنڈا اس کی کھوپڑی پر پٹاخ پٹاخ برسنے لگتا۔

انگریز دور میں فتنوں کا سیلاب اُمڈ کر آ گیا۔ کہیں عیسائیت کے نام نہاد مبلغ، اسلام کی حقانیت پر اپنے طعن و تشنیع کے تیر برساتے، کہیں ختم نبوت کے انکار کا فتنہ، کہیں شان رسالت ﷺ میں گستاخی کرنے والوں کی ہرزہ سرائیاں، کہیں صحابہ کرام کی بارگاہِ اقدس میں گستاخی کرنے کے لیے منظم سازشیں، کہیں اہل بیت کرام کی عظمت و ناموس پر زباں درازیاں۔ الغرض اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ رسول ﷺ کا یہ محبوب مجاہد سب سے لڑا، سب کے سامنے سینہ سپر ہوا اور سب کو بتائید الٰہی شکست فاش سے دوچار کر دیا۔

ہندوستان کی آزادی کے لیے جب تحریک چلی تو کانگریس پیش پیش تھی جس کی قیادت متعصب اور تنگ نظر ہندو کے ہاتھ میں تھی، لیکن ہندو مہاشوں کی مکاری نے بہت سے

Marfat.com

مسلمانوں کو اپنا ہمنوا بنالیا تھا۔ بڑے بڑے علماء، زعماء، فضلاء بھی ہندوستانی قومیت کے پرستار اور ہندو لیڈروں کے ہمنوا تھے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ملت مصطفویہ کو انگریز اور ہندو کی غلامی کے شکنجے سے بچانے کے لیے انتظام فرمایا۔ قائداعظم نے پاکستان کا مطالبہ کیا تو آنحضرت نے اپنے نورِ فراست سے قائداعظم کے مؤقف کی حقانیت کو بھانپ لیا اور ملک کے بڑے بڑے دانشور یہ فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ قائداعظم کے دعویٰ میں کوئی مقبولیت ہے یا نہیں، یا یہ قابل عمل بھی ہے یا نہیں۔ آپ نے ڈنکے کی چوٹ پر، پورے عزم و یقین کے ساتھ پاکستان کے حصول کے لیے جہاد میں قائداعظم کی رفاقت اور اعانت کا اعلان کر دیا اور تاریخ کے صفحات اس بات کے گواہ ہیں کہ اس مردِ حق نے جو قدم اٹھایا وہ اس وقت تک نہیں رکا جب تک منزل نے بڑھ کر قدم نہیں چومے۔

صوبہ سرحد میں ریفرنڈم کی مہم ازبس خطرناک تھی۔ خان برادران کا یہاں طوطی بول رہا تھا۔ وہ گاندھی کے اندھے پرستار تھے اور سرخ پوش تحریک کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ صوبہ سرحد کے ہر شہر اور ہر گاؤں میں اس کے سرخ پرچم لہرا رہے تھے۔ اگر اس ریفرنڈم میں مسلم لیگ شکست کھا جاتی تو پاکستان کا خواب تعبیر سے پہلے ہی منتشر ہو جاتا۔ جن لوگوں کی جوانمردی نے ملت مسلمہ کے لیے سرحد میں کامیابی کے راستے ہموار کیے، بلاشبہ ان مجاہدین کی صف اول میں حضرت خواجہ قمر الدین کا چمکتا ہوا چہرہ آپ کو نمایاں نظر آئے گا۔

پاکستان معرضِ وجود میں آنے کے بعد اگرچہ عرصہ دراز تک موت و حیات کی کشمکش میں رہا، جن لوگوں کو اس کی زمامِ اقتدار سونپی گئی انہوں نے اپنی نااہلی یا خیانت مجرمانہ کے باعث اس نوزائیدہ مملکت کی مشکلات میں اضافہ ہی کیا، لیکن ۱۹۷۰ء کا وہ دور ساری ملت کے لیے بے حد تشویشناک تھا۔ اس وقت یہاں ایک ایسی تحریک شروع ہوئی جو اسلام کے بجائے سوشلزم کو ملک کا دستورِ حیات بنانے کا عزم کر کے اٹھی تھی اس سے قبل جو حکمران آئے، انہوں نے بھی اگرچہ نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کے لیے کوئی قابل ذکر خدمت انجام نہیں دی تھی اور اگر کوئی قدم اس سمت میں اٹھایا بھی تو بڑی بے دلی سے، لیکن یہ دور تو

Marfat.com

اپنے دامن میں ہنگامۂ رستاخیز سمیٹ کر لایا تھا۔

بھٹو کی عیاریوں نے قوم کے ذہنوں میں اشتراکیت کا نقش اس طرح ثبت کر دیا کہ اب عام شاہراہوں پر اسلام مردہ باد کے نعرے سنائی دینے لگے۔ اب خوف آنے لگا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جو ملک لاکھوں شہیدوں نے اپنا خون بہا کر اور اپنی رنگ رنگیلی جوانیاں لٹا کر اسلام کی خاطر حاصل کیا تھا، اس میں کہیں مارکس اور لینن وغیرہ یہودیوں کا ابلیسی نظام نافذ نہ ہو جائے۔

بھٹو کے ساتھیوں کے نعرے بڑے گرجدار تھے، ساری فضا سہمی سہمی تھی۔ بڑے بڑے سیاستدان منقار زیر پر تھے۔ کئی علماء بھی بایں جبہ و دستار اسلام کے اس وطن میں سوشلزم کے کانٹے بونے کے لیے بھٹو کا ساتھ دے رہے تھے۔ خوف و ہراس، دہشت و یاس کے اس ماحول میں ایک آواز بلند ہوئی کہ ''پاکستان سوشلزم کا قبرستان بنے گا''۔ ساری قوم چونک اٹھی۔ اپنے اور بیگانے اس نعرہ لگانے والے کی جرأت و بسالت پر انگشت بدنداں رہ گئے۔ وہ آنکھیں مل مل کر اس جوانمرد کا چہرہ دیکھنے کے لیے بے تاب تھے جس نے اپنی صدائے دلنواز سے ملک بھر میں ہلچل پیدا کر دی تھی۔

وہ نعرہ لگانے والا کون تھا؟

وہ ہم سنیوں کا آقا، ہم چشتیوں کا مرشد، حضرت خواجہ محمد قمر الدین سیالوی تھا۔ اس نعرہ نے صورِ اسرافیل کا کام کیا اور سوئی ہوئی ملت بیدار ہو گئی اور اس کے بیدار ہونے کی دیر تھی کہ باطل کے نعروں کی وہ کڑک ختم ہو گئی، وہ طلسم ٹوٹ گیا، جس نے ساری قوم خصوصاً نوجوان نسل کو بری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ ایسے نازک دور میں کالعدم جمعیت علماء پاکستان کی قیادت اور اسلام کی عظمت کا جھنڈا جب حضرت شمس العارفین کے خانوادے کے اس اولوالعزم مردِ حق نے اپنے ہاتھ میں اٹھا لیا تو میدانِ جنگ کا نقشہ پلٹ کر رکھ دیا اور بھٹو اور اس کے حواریوں کے وہ ارادے خاک میں مل گئے جو اس گلشن اسلام کو ویران کر کے اسے اشتراکیت کا مرکز بنانا چاہتے تھے۔

Marfat.com

غلامانِ مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء پہلے انگریز کے خلاف برسرِ پیکار تھے، پھر ہندو سے جنگ آزما ہوئے، پھر داخلی فتنوں نے ان کی ساری توجہ اپنی طرف مبذول رکھی۔ اس عرصہ میں فتنۂ مرزائیت ہر قسم کی مزاحمت سے بے خوف ہو کر اپنے پاؤں پھیلاتا رہا۔ اپنی بنیادیں مضبوط کرتا رہا۔ انہیں اپنے وسائل کو منظم کرنے، اپنی سازشوں کو مرتب کرنے کے لیے طویل فرصت مل گئی۔ سول کے محکموں میں پہلے ہی ان کے لوگ کلیدی اسامیوں پر قابض تھے۔ اس عرصہ میں انہوں نے بری، بحری اور ہوائی فوج میں بھی اپنی پوزیشن مستحکم کر لی، یہاں تک کہ پاکستانی فضائیہ کا سربراہِ اعلیٰ ایک قادیانی (ظفر چوہدری) بننے میں کامیاب ہو گیا اور اس میں اتنی جرأت پیدا ہو گئی کہ ماہِ دسمبر میں ربوہ میں ان کی جو سہ روزہ کانفرنس ہوئی، اس موقع پر اس نے پاکستانی فضائیہ کے طیاروں کو حکم دیا کہ وہ اس کے جھوٹے نبی، جھوٹے خلیفہ کو سلامی دیں۔

انہیں یہ توقع تھی کہ ایک جست میں وہ پاکستان کے اقتدار پر قبضہ کر لیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب مکرم ﷺ کی امت کو انگریزوں کے ان پٹھوؤں، اسلام اور ملت اسلامیہ کے دشمنوں کی خطرناک سازشوں سے بچانے کے لیے ربوہ کے ریلوے سٹیشن پر رونما ہونے والے ایک معمولی سے واقعہ کو ذریعہ بنا دیا، پھر ختم نبوت کی تحریک ملک کے کونہ کونہ میں پھیل گئی، یہاں تک کہ حکومت مجبور ہو گئی کہ وہ مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے۔ اس وقت بھی حضرت شیخ الاسلام نے جو قائدانہ اور مجاہدانہ کردار انجام دیا وہ محتاجِ بیان نہیں۔

تحریک نظامِ مصطفیٰ ﷺ میں بھی آپ کی خدمات تا ابد تابندہ و درخشندہ رہیں گی۔

رمضان المبارک کی چودہ تاریخ تھی، جمعہ کا دن تھا۔ زائرین کے ہجوم سے آستانہ عالیہ کا کونہ کونہ بھرا ہوا تھا۔ یہ جمعہ حضرت غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسجد میں ادا فرمایا اور اپنے خدام کو اور اپنے پروانوں کو دعاؤں کے ساتھ الوداع کیا۔ اس دن خلاف معمول روزہ گھر میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ افطار فرمایا۔ رات سیال شریف میں بسر کی۔ حضرت صاحبزادہ غلام نصیر الدین صاحب کے صاحبزادے علاج کے لیے لاہور گئے ہوئے تھے،

Marfat.com

ان کی مزاج پرسی کے لیے لاہور جانے کا پروگرام بنایا۔ سحری تناول فرمانے کے بعد حضرت غریب نواز نے، حضرت شمس العارفین کے روضہ مقدسہ پر حاضری دی اور دعائے خیر کے بعد اپنی زندگی کے آخری سفر پر روانہ ہوئے۔

سرگودہا لاہور سڑک پر (سرگودہا سے چند میل کے فاصلے پر) چک نمبر ۱۱ کا پل ہے۔ آپ کا عمر بھر کا ڈرائیور غلام حیدر جو پینتالیس سال سے آپ کا ڈرائیور تھا، کار چلا رہا تھا، صبح کے سات بج رہے تھے، سورج طلوع ہو چکا تھا، ہر طرف روشنی ہی روشنی تھی کہ چک نمبر ۱۱ کے پل کے قریب غلام حیدر نے سامنے سے ایک ٹرک آتا ہوا دیکھا۔ وہ غلط سمت سے آرہا تھا۔ محتاط ڈرائیور نے اپنی سابقہ روایات کے مطابق گاڑی کو اور بائیں جانب کر لیا، لیکن ٹرک نے اپنی سمت درست نہ کی تو غلام حیدر نے حضرت کی گاڑی کو کچے راستے پر اتار لیا، لیکن ٹرک کا ڈرائیور معلوم نہیں نشہ میں دھت تھا یا سو رہا تھا، اپنے ٹرک کو کنٹرول نہ کر سکا۔ اچانک ایک دھماکہ ہوا، قیامت خیز دھماکہ، جس نے گاڑی کا کچومر نکال دیا۔ ڈرائیور غلام حیدر اپنے آقا کے قدموں میں نذرانۂ جان پیش کر کے وہیں سرخرو ہوا۔

ایک دوسرا خادم اللہ بخش، جس کی چند روز بعد شادی ہونے والی تھی، وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا، اس کو شہادت کا تاج پہنا دیا گیا۔ شاید ایسے جانثار اور جانباز خدام کے لیے ہی حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

بنا کردند خوش رسمے بہ خون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

باقی دو ساتھی حاجی محمد نواز جو حضرت کا دیرینہ اور راز دار خادم ہے اس کا بازو کئی جگہ سے ٹوٹ گیا۔ چوتھا ساتھی محمد اسلم بری طرح زخمی ہوا۔

حضرت قبلہ غریب نواز ڈرائیور کے ساتھ پہلی نشست پر تشریف فرما تھے۔ دھماکہ سن کر ارد گرد سے لوگ دوڑے ہوئے آئے، حضرت کو باہر نکالا گیا، آپ کی دائیں ٹانگ کی پنڈلی کی ہڈی کریک ہو گئی تھی۔ چہرۂ مبارک اور جسم کے دوسرے حصے بالکل صحیح سلامت تھے۔

Marfat.com

آپ کو کار سے نکال کر جب باہر چارپائی پر ڈالا گیا تو ایک آدمی نے پانی پیش کیا۔ آپ نے پینے سے انکار کر دیا۔ فرمایا: میں روزہ سے ہوں، پھر ٹرک میں چارپائی بچھا کر لٹا دیا گیا اور ڈسٹرکٹ ہسپتال سرگودھا لایا گیا۔

اس المناک حادثہ کی خبر، جنگل کی آگ کی طرح آناً فاناً پھیل گئی۔ لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ ہسپتال میں جمع ہو گئے۔

بھیرہ میں ہمیں شام کے بعد اس حادثہ کی اطلاع ملی، لیکن اطلاع دینے والے نے ساتھ یہ بھی بتایا کہ حضور بخیر و عافیت ہیں۔ دوسری صبح سویرے عیادت اور زیارت کے لیے میں مع اپنے عزیزوں کے سرگودھا پہنچا۔ اس وقت ڈاکٹر صاحبان مرہم پٹی کر رہے تھے۔ ہسپتال کا سارا کھلا میدان نیازمندوں اور عقیدت مندوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سب کی زبان پر کلمات شکر تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے کریم آقا کو اس جانکاہ حادثہ سے بچا لیا ہے۔

ہم لوگ خوش تھے کہ تقدیر کی کمان کا تیر خطا ہوا، لیکن تقدیر ہماری کم نگاہی پر مسکرا رہی تھی۔ دو روز تک آپ ڈسٹرکٹ ہسپتال سرگودھا میں زیر علاج رہے۔ صدر محترم جنرل محمد ضیاء الحق کو جب اس سانحہ کا علم ہوا تو بے چین ہو گئے۔ ہر دس پندرہ منٹ کے بعد حضرت کی خبر گیری کے لیے فون کرتے رہے اور ڈاکٹروں کو تاکید کرتے رہے کہ علاج معالجہ میں کسی قسم کی کوتاہی نہ ہو۔

سترہ رمضان المبارک کو ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ آپ کو علاج کے لیے سی ایم ایچ لاہور لے جایا جائے، چنانچہ آپ کو وہاں سے لے جایا گیا۔ وہاں کے ڈاکٹروں نے جب انگلیوں کے ناخنوں کی رنگت دیکھی تو سراپا یاس بن گئے اور کہا کہ بہت لیٹ آئے ہو۔ سی ایم ایچ کے قابل ڈاکٹروں کی جملہ مساعی کے باوجود حکم الٰہی پورا ہوا اور وہ عظیم ہستی جو پون صدی تک چودھویں کا چاند بن کر زندگی کے افق پر نور افشانیاں کرتی رہی تھی، ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی اور دارِ فانی سے رخت سفر باندھ کر اپنے محبوبِ حقیقی کی بارگاہ صمدیت میں نعمت حضوری سے شرف یاب ہو گئی۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ

Marfat.com

زمانہ اپنی شب غم کو منور کرنے کے لیے ایسے قائد کی تلاش میں سرگرداں رہا، لیکن صد حیف کہ اس کی یہ سعی بارآور نہ ہوئی۔ امت مسلمہ اپنے اس قائد کی یاد کو ہمیشہ سینوں سے لگائے رکھے گی جس نے ہر مشکل مرحلہ پر بڑی جرأت کے ساتھ اس کی رہنمائی فرمائی۔

حلقہ مریدین اپنے شیخ کے نورانی چہرہ کی زیارت کے لیے تڑپتا ہی رہے گا۔ طالب علموں کے ساتھ محبت کرنے والے، علماء کی قدر و منزلت کو پہچاننے والے، اہل بیت نبوت کے ادب و احترام کا حق ادا کرنے والے، صحابہ کرام کی ناموس کا پاسبان اور شمع جمالِ محمدی ﷺ کا ایسا دل سوختہ پروانہ اور ذکر الٰہی سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہ ہونے والا، اہل دل کی آنکھوں کا نور، اہل خرد کا پیشوا اور کاروانِ عشق و مستی کا قافلہ سالار، شیخ الاسلام والمسلمین حضرت خواجہ محمد قمر الدین رضی اللہ عنہ وارضاہ عنا، بظاہر ہماری آنکھوں سے نہاں ہو گئے، لیکن ان کی عقیدت و محبت کے چراغ ہمیشہ جگمگاتے رہیں گے۔

اسلامی نظریاتی کونسل

کے سوالات و جوابات

نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نُصَلِّيْ وَ نُسَلِّمُ عَلٰى حَبِيْبِهٖ مُحَمَّدِنِ الْمَبْعُوْثِ رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ وَ عَلٰى آلِهٖ وَ صَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

اَمَّا بَعْدُ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

آپ کا مراسلہ سوالنامہ موصول ہوا، یادفرمائی کے لیے ممنون ہوں۔ آپ نے بڑا اچھا کیا کہ اہل الرائے علماء کی طرف رجوع کیا تا کہ وہ ان اہم اور پیچیدہ سوالات کے بارے میں اپنے تحقیقی جوابات آپ کی طرف ارسال کریں اور ان کی روشنی میں آپ کسی حتمی نتیجہ تک پہنچیں۔ ان مسائل کے بارے میں ارباب حکومت بھی مضطرب ہیں اور عوام کے اذہان بھی تشویش اور بے چینی کا شکار ہیں۔ ایک غیر یقینی صورتِ حال نے سب کو پریشان کر رکھا ہے۔ اس کا قلع قمع کرنا اور لوگوں کے قلوب و اذہان کو مطمئن کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ آپ کی رپورٹ جتنی مدلل اور جامع ہوگی، حکومت اور عوام کے لیے اس پر عمل کرنا اتنا ہی آسان ہوگا۔

ان سوالات کا جواب لکھنے سے پہلے میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسلام ایک جامع نظامِ حیات ہے، اس کا اپنا تشخص اور اس کی اپنی انفرادیت ہے۔ قومی معیشت بھی اس نظام کا ایک اہم شعبہ ہے۔ اس کا بھی اپنا تشخص اور اپنی انفرادیت ہے جو دوسرے معاشی نظاموں سے صورت و شکل، حقیقت و معنی دونوں میں مختلف ہے۔ اسلام کے اقتصادی نظام میں کسی دوسرے اقتصادی نظام کی پیوند کاری یا کسی دوسرے اقتصادی نظام میں اسلام کی پیوند کاری مضحکہ خیز قسم کی سادہ لوحی ہے۔ اسلام اپنی فطرت اور مزاج کے اعتبار سے کسی غیر اسلامی نظام کے ساتھ مفاہمت اور مصالحت کے لیے تیار نہیں۔ جو لوگ اسلامی اور غیر اسلامی نظریات کی معجون مرکب تیار کرنا چاہتے ہیں ان کی کوششیں نہ اب تک کامیاب ہوئی ہیں اور نہ آئندہ ان کے کامیاب ہونے کا کوئی امکان ہے۔

Marfat.com

یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ اسلام سرمایہ داری کا حقیقی مخالف ہے اور وہ اس مخالفت کا برملا اقرار کرتا ہے کہ وہ مسلم معاشرہ میں اس بات کا ہرگز روادار نہیں کہ قوم کی ساری دولت اور ملکی ثروت سمٹ کر چند ہاتھوں میں جمع ہو جائے۔ چند خاندان تو عیش و عشرت کی زندگیاں بسر کریں اور باقی ساری قوم محرومیوں کا شکار رہے، افلاس و غربت، جہالت و بیماری کی آہنی زنجیروں میں جکڑی رہے اور اپنی بدنصیبی پر خون کے آنسو بہاتی رہے۔ اسلام، دولت کی منصفانہ تقسیم کا علمبردار ہے تاکہ ہر شخص اپنی خداداد صلاحیتوں کو پوری ہمت سے بروئے کار لائے اور خوشحال زندگی بسر کر سکے۔ وہ خوش حال زندگی کا وعدہ کر کے انسان کو اس کی عظمت سے محروم نہیں کرتا، اس کی آزادیٔ عمل سلب نہیں کرتا، اس پر ناروا پابندیاں لگا کر اس کے عزمِ جواں کو مفلوج نہیں کرتا، بلکہ وہ انسان کی عظمت، اس کی حریت کو برقرار رکھتے ہوئے اسے خوشحالی کی راہ پر گامزن کر دیتا ہے۔ اس لیے سرمایہ داری سے اس کی مخاصمت اور اس کی بیخ کنی کے لیے اس کا طرزِ عمل اشتراکیت کے اندازِ فکر اور طریقہ کار سے بہت مختلف ہے۔

اسلام ان راستوں کو بند کرنے کی طرف پوری توجہ دیتا ہے، جن راستوں سے قومی دولت طوفان کی سی تیزی سے چند لوگوں کے پاس جمع ہو جاتی ہے۔ اسلامی فقہ کی اصطلاح میں اس طریقہ کار کو "سد ذرائع" کہا جاتا ہے کہ ایسے ذرائع کو بند کر دو، ایسے ذرائع کا استیصال کر دو، جن کے باعث اسلامی معاشرہ میں فساد اور خرابی اپنے قدم جماتی ہے۔ چنانچہ اکتساب دولت کے وسائل کو اسلام نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ حلال اور حرام۔ وہ تمام وسائل جن میں انسان کی جسمانی یا ذہنی جدوجہد کا دخل نہیں ہوتا یا جس کا دارومدار فقط اتفاق .... یا کسی شخص کی مجبوری، معذوری یا بے خبری اور ناتجربہ کاری سے فائدہ اٹھانے پر ہوتا ہے، ان تمام وسائل کو حرام قرار دیا گیا۔ جوا، شرط لگانا، ذخیرہ اندوزی، بلیک مارکیٹنگ، سمگلنگ، رشوت اور سود، سب قطعاً ممنوع قرار دیے گئے، کیونکہ یہی وہ اسباب ہیں جن کے بل بوتے پر سرمایہ داری کا نظام پھلتا پھولتا ہے اور اپنی تباہ کاریوں سے انسانی

Marfat.com

معاشرہ کو گوناگوں مصائب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ان تمام ممنوعہ ذرائع اکتساب میں سرفہرست سود ہے۔ جب تک اسلامی معاشرہ سود کی لعنت سے پاک رہا، تجارتی، صنعتی، زرعی میدانوں میں بے مثال ترقی کرنے کے باوجود سرمایہ داری کا عفریت وہاں قدم نہ رکھ سکا۔ مغربی استعمار کی بالادستی نے جہاں ہماری ملی اور انفرادی زندگی کے دوسرے شعبوں کو مجروح کیا وہاں ہماری معاشی زندگی بھی اس کی یلغار سے محفوظ نہ رہ سکی۔

بدقسمتی سے جب عالم اسلام پر انحطاط و ادبار کی گھٹائیں چھا رہی تھیں، اس وقت مغرب کی علمی برتری، سائنسی ایجادات اور سیاسی فتوحات کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بج رہا تھا۔ یہ ایک قدرتی امر ہے کہ مغلوب اور کمزور قوموں کی نگاہ میں طاقتور فاتح کی ہر ادا دلآویز، ہر فعل دل پسند اور ہر نظریہ حق دکھائی دیتا ہے۔ ان کے اقوال کی صداقت اور ان کے نظریات کی حقانیت کو پرکھنے کی ضرورت بھی وہ محسوس نہیں کرتے، بغیر دلیل کے ان کی ہر بات مان لی جاتی ہے۔ انہی حالات میں سود جیسی مہلک چیز بھی اسلامی ممالک، خصوصاً ہندوستان میں قابل پذیرائی ہوگئی۔

پاکستان بننے کے بعد علماء نے پرزور مطالبہ کیا کہ سود کو قطعی طور پر ممنوع قرار دیا جائے لیکن وہ ذہن جو مغربی تہذیب سے بری طرح متاثر اور مرعوب تھے، انہوں نے علماء کے اس مطالبہ کو نامعقول، ناقابل عمل اور رجعت پسندانہ قرار دیا اور بینکوں کے سود کو جائز قرار دینے کے لیے تاویلات کے انبار لگا دیے۔ چنانچہ صنعت کاروں نے بینکوں سے سود لے کر بڑی بڑی فیکٹریاں، ملیں اور کارخانے قائم کر لیے۔ بینکوں کو وہ پانچ سات فی صد سود ادا کرتے، لیکن خود ایک صد روپیہ پر کئی گنا منافع کماتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند سالوں میں ملکی ثروت سمٹ کر چند خاندانوں کی تجوریوں میں چلی گئی اور عام پاکستانی، زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے بھی بہرہ ور نہ ہو سکا۔ رفتہ رفتہ حالات ناقابل برداشت ہو گئے اور بائیس خاندانوں کی لوٹ مار اور غارت گری کی خونچکاں داستانیں زبان زد عام ہوگئیں۔

جن لوگوں نے سرمایہ داری کے جور وستم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، صد حیف!

Marfat.com

انہوں نے بھی اسلام کے سرچشمۂ فیض سے استفادہ کی کوشش نہ کی۔ ان کے خادم ذہن اشتراکیت وشیوعیت کی طرف مائل ہو گئے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں کمیونسٹ نظام بڑا فروغ پذیر تھا۔ آئے روز اس کی فتوحات کا دائرہ وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ روس کے علاوہ چین جیسے وسیع وعریض ملک میں اس کا علم لہرا رہا تھا۔ ہماری مشرقی سرحدوں کے ساتھ جو ممالک تھے وہاں بھی اشتراکیت وسرمایہ داری میں گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی۔ مصر، شام، عراق اور یمن میں بھی روس کا اثر ونفوذ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ہمارے پہلے قائدین اگر یورپ کی تہذیب وتمدن سے متاثر تھے تو ہمارے نئے مصلحین لینن اور ماوزے تنگ وغیرہ کمیونسٹوں کا کلمہ پڑھ رہے ہیں۔ ہم اسے شومئ قسمت پر محمول کریں گے کہ دونوں اہم لمحات میں ہمیں اسلامی قیادت نصیب نہ ہوئی، جو ہمیں راہِ راست پر گامزن کر کے منزلِ مراد تک پہنچاتی۔ اس طرح تیس سال کا قیمتی عرصہ مختلف پگڈنڈیوں پر بھٹکتے بھٹکتے ضائع ہو گیا۔

ان ابتدائی گزارشات کے بعد عرض یہ ہے کہ اس قسم کے جدید مسائل کا صحیح اور حتمی حل تلاش کرنے کے لیے ایک ایسا بورڈ بنایا جائے جس کے اراکین میں علماء، محققین، معاشیات اور بینکاری کے ماہرین شامل ہوں۔ یہ سب حضرات سر جوڑ کر بیٹھیں ایک دوسرے کی تحقیقات، معلومات اور مشوروں سے فائدہ اٹھائیں، کتاب وسنت کی تعلیمات کی روشنی میں لوگوں کے سامنے اپنے حتمی فیصلے پیش کریں، جن کے مطابق ہر شخص بغیر کسی خلش کے عمل کرے۔ اس فریضہ کو انجام دینے کے لیے جتنا وقت صرف ہو، جتنی محنت درکار ہو، اس میں بخل سے کام نہ لیا جائے۔ موجودہ حکومت کا یہ ایک ایسا زریں کارنامہ ہوگا جس کے لیے ساری قوم، بلکہ سارا عالم اسلام اور آئندہ آنے والی نسلیں بھی زیر بار احسان رہیں گی۔

اب آپ کی خواہش کے مطابق یہ ناچیز آپ کے سوالات کے جوابات پیش کرتا ہے۔ خداوند کریم میری رہنمائی فرمائے اور صراطِ مستقیم پر ثابت قدمی سے گامزن رہنے کی ہم سب کو توفیق بخشے۔ آمین ثم آمین بجاہ حبیبہ الامین صلی اللہ علیہ وسلم۔

Marfat.com

سوال نمبر ۱ (الف)

قرآن مجید اور سنت کی روشنی میں ربا کا صحیح مفہوم کیا ہے اور قبل از اسلام اس سے کیا مراد لی جاتی تھی؟ تخصیصاً کیا ربا سے مراد ایسا سود ہے جو اصل زر کو دوگنا اور سہ گنا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً کر دیتا ہے یا اس میں قرض خواہ کی طرف سے وصول کیا جانے والا رائج الوقت سود مفرد اور سود مرکب بھی شامل ہے؟

(ب) کیا ظہورِ اسلام کے بعد ہونے والی ترقی اور تبدیلیوں کے پیش نظر ربا کی نئی تشریح کی جا سکتی ہے؟

جواب: (الف)

یہ امر واضح ہے کہ قرآن کریم عربی زبان میں نازل ہوا، جو فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ ترین معیار پر ہے، جس کے سامنے فصحائے عرب کو اپنے سر جھکا دینے پڑے۔ ارشاد ہے: قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ (الزمر۔ ۲۸) یہ ایسا قرآن ہے جو عربی زبان میں ہے، جس میں کوئی کجی نہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۹۲﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹۵﴾ (الشعراء)

"اور بے شک یہ قرآن رب العالمین کا اتارا ہوا ہے، اسے روح الامین لے کر اترے، آپ کے قلب مبارک پر۔ تاکہ آپ لوگوں کو ڈرائیں۔ یہ عربی زبان میں ہے جو بالکل واضح ہے"۔

اس لیے "ربا" کے لفظ کی تحقیق کرنی چاہیے کہ اہل زبان اس لفظ کو کس معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ صاحب قاموس لکھتے ہیں۔ رَبَا۔ يَرْبُوْا: زَادَ وَنَمَا (1) یعنی کسی چیز کا زیادہ ہونا اور بڑھنا لسان العرب میں اس کا مفہوم یوں بیان کیا گیا ہے: ربا الشیء یربو ربوا ورباء: زاد ونما، یعنی کسی چیز کا زیادہ ہونا یا بڑھنا۔ اس کے بعد لکھتے ہیں: وَالْاَصْلُ

1۔ القاموس از علامہ محمد بن یعقوب، صفحہ 877

Marfat.com

فِیْهِ الزِّیَادَۃُ مِنْ رَبَا الْمَالِ اِذَا زَادَ وَ ارْتَفَعَ یعنی اس لفظ کا اصل معنی زیادتی ہے۔ جب مال میں زیادتی اور ارتفاع ہو تو اہل عرب کہتے ہیں: رَبَا الْمَالُ۔ (1)

اس سے معلوم ہوا کہ ہر زیادتی، قلیل ہو یا کثیر، کو لغت عرب میں ''ربا'' کہتے ہیں۔ چنانچہ اسی لغوی مفہوم کو پیش نظر رکھتے ہوئے فقہائے اسلام نے ربا کی شرعی تعریف اس طرح کی ہے: اَلرِّبَا شَرْعًا فَضْلٌ خَالٍ عَنْ عِوَضٍ بِمِعْیَارٍ شَرْعِیٍّ (وَ ھُوَ الْکَیْلُ وَالْوَزْنُ) مَشْرُوْطٌ لِاَحَدِ الْمُتَعَاقِدَیْنِ فِی الْمُعَاوَضَۃِ۔

(تنویر الابصار مع الدر المختار جلد ۴ صفحہ ۱۹۵۔۱۹۶ مطبوعہ ایچ ایم سعید کمپنی کراچی)

''یعنی ہر وہ زیادتی جو کسی عوض کے بغیر ہو اور معاوضہ میں ایک فریق کے لیے مشروط ہو''۔

قرآن کریم کی آیات سے بھی اس مفہوم ہی کی تصدیق ہوتی ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا

(البقرة:۲۷۸)

''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جو ''ربا'' باقی رہ گئی ہے اس کو چھوڑ دو، اگر تم مومن ہو''۔

اس آیت میں مطلق ربا کو چھوڑ دینے کا حکم ہے۔ یہ نہیں فرمایا گیا کہ تھوڑی ربا ہو تو لے لو اور زیادہ ہو تو ترک کر دو یا کاروباری قرضوں پر تو سود لے لو اور نجی ضروریات کے لیے جو قرضے دیے ہیں ان کا سود معاف کر دو، بلکہ حکم مطلق ہے۔ ہم اپنی طرف سے کوئی قید اس میں نہیں بڑھا سکتے۔ اگر خداوند کریم کو مقید کرنا مطلوب ہوتا تو جہاں ربا کے متعلق تفصیل سے ذکر آیا ہے، وہاں اس قید کا ذکر عین مصلحت ہوتا تا کہ ماننے والے کسی ذہنی کشمکش میں مبتلا نہ ہوتے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ دو گنا اور سہ گنا سود تو حرام ہے، لیکن اس سے کم حرام نہیں ہے

1۔ لسان العرب، جلد 14، صفحہ 05-304، دار صادر بیروت

Marfat.com

اور اپنی بے خبری کے باعث اس آیت سے استدلال کرتے ہیں:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (آل عمران: ۱۳۰)

''یعنی اے ایمان والو! کئی گنا سود مت کھاؤ''۔

لیکن ان کا یہ استدلال قطعاً بے بنیاد ہے۔ علمائے کرام نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حرمت ربا کے سلسلہ میں سب سے پہلے یہ آیت نازل ہوئی۔ ابتداء میں ربا کی سب سے بدترین صورت کو اس آیت سے حرام کیا گیا۔ اس کے بعد دوسری آیات نازل ہوئیں جن سے ہر قسم کے ربا کی ممانعت کر دی گئی۔ اصلاحِ احوال میں تدریج کی حکمت عملی قرآنِ کریم کا دستور ہے۔ شراب کی حرمت، میراث کا قانون اور کئی دیگر احکام میں بھی اس حکمت عملی کو اپنایا گیا ہے تاکہ لوگوں کو ان احکام کی بجا آوری میں آسانی ہو۔ نیز علماء نے اس امر کی بھی وضاحت کی ہے کہ یہ قید اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً حکم کی شرعی قید نہیں کہ اگر یہ قید پائی جائے تو سود کی حرمت ثابت ہو اور اگر نہ پائی جائے تو یہ حکم بھی نہ پایا جائے، بلکہ اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً سے امر واقع کی طرف اشارہ ہے اور ربا کی مختلف صورتیں، جو ان کے ہاں رائج تھیں ان میں سے ایک قبیح ترین صورت کا ذکر کر دیا گیا۔ قرآنِ کریم میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں جہاں ان عورتوں کا ذکر کیا ہے جن کے ساتھ نکاح حرام ہے۔ وہاں ارشاد ہے:

وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِكُمْ (النساء: ۲۳) یعنی تمہاری بیویوں کی بیٹیاں جو تمہاری گود میں پرورش پائیں، وہ بھی تم پر حرام ہیں۔ بیوی کی بیٹی کی حرمت کے لیے فِیْ حُجُوْرِكُمْ کا پایا جانا ضروری نہیں۔ اگر وہ گود میں پرورش نہ پائے تب بھی وہ حرام ہے۔ یہاں محض ذکر امر واقع ہے، یہ قید شرعی نہیں کہ اس کے فقدان سے حرمت، حلت میں بدل جائے۔

ایک اور آیت شریفہ ملاحظہ ہو:

لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِیْ ثَمَنًا قَلِيْلًا (المائدہ: ۴۴) یعنی میری آیتوں کو قلیل قیمت پر مت فروخت کرو۔ کوئی شخص بھی یہ آیت پڑھنے کے بعد یہ نہیں کہہ سکتا کہ تھوڑی قیمت پر آیاتِ الٰہیہ کو فروخت کرنا تو منع ہے، لیکن زیادہ قیمت پر اگر انہیں فروخت کر دیا جائے تو کوئی حرج

Marfat.com

نہیں۔ معلوم ہوا کہ ثَمَنًا قَلِيلًا اس حکم کے لیے قید شرعی نہیں۔ اسی طرح اس آیت شریفہ میں بھی اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً کے الفاظ حرمت کے لیے شرعی قید نہیں ہے۔ اس کے باوجود بھی اگر کوئی صاحب اس پر مصر ہوں کہ یہ قید شرعی ہے اور فقط وہی سود حرام ہے جو اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ہو، تو ہم ان کو زحمت دیں گے کہ وہ ان الفاظ کا ترجمہ ہمیں سمجھائیں۔ جہاں تک ہمارا علم ہے اضعاف جمع ہے۔ اس کا واحد ضِعْفٌ ہے۔ ضعف کا معنی دوگنا ہے۔ عربی زبان میں جمع کا اطلاق کم از کم واحد کے تین افراد پر ہوتا ہے تو سو کا ضعف یعنی دوگنا دوصد ہوا۔ اضعاف جمع ہے کم از کم تین دوگنے چھ سو اور مُّضٰعَفَةً اس کا بھی دوگنا بارہ سو۔ اگر ان کی اس توجیہہ کو درست مان لیا جائے تو قرآن کریم کے الفاظ کا یہ معنی ہوگا کہ اصل زر پر چھ سو یا بارہ سو گنا سود حرام ہے۔ اس سے کم مقدار میں سود حرام نہیں، بلکہ شیر ماں کی طرح حلال بھی ہے اور خوشگوار بھی۔ خود انصاف فرمایئے کہ قرآن کریم کے ساتھ اور اسلام کے ساتھ یہ کتنی بڑی زیادتی ہے۔ اتنی شرح سود پر تو کوئی پتھر دل بنیا اور بے رحم مہاجن بھی سود نہیں لیا کرتا۔ اسلام جو رب العالمین کا دین ہے، کیا آپ ایسے دین کو ایک لالچی، سنگدل اور خون آشام بنیے سے بھی زیادہ بے رحم ثابت کرنے کے درپے ہیں؟ کچھ تو غور کیجئے، کچھ تو انصاف سے کام لیجئے۔

قرآن کریم کی متعدد آیات اور بے شمار صحیح احادیث نبویہ ﷺ کی روشنی میں کسی ادنیٰ جھجک کے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر طرح کا سود حرام ہے۔ خواہ سود مفرد ہو یا مرکب۔ اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ہو یا اس سے کم۔ نجی ضروریات کے لیے ہو یا کاروباری مقاصد کے لیے، ان میں کوئی فرق نہیں۔

شریعت اسلامیہ نے کئی اور چیزوں کو بھی حرام قرار دیا ہے، لیکن جس شدت سے قرآنِ کریم نے سود کی حرمت کو بیان کیا ہے اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی ہے۔ فرمانِ خداوندی ہے:

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾ (البقرۃ)

''اگر تم سود کو نہیں چھوڑو گے تو پھر خداوند کریم اور اس کے رسول ﷺ کی طرف

سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے اور اگر تم توبہ کرو تو تمہیں صرف اپنا اصل زر لینے کا حق ہے۔ نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے''۔

آیت کا آخری جملہ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾ اسلامی نظامِ معیشت کی بنیاد ہے۔ وَاِنْ تُبْتُمْ کے جملہ سے ہر قسم کے سود کی حرمت ثابت ہوتی ہے، یعنی وہ توبہ کرنے والا صرف اپنا رأس المال لینے کا حقدار ہے۔ اس سے زیادہ ایک پائی بھی وہ نہیں لے سکتا اور آیت کے ابتدائی جملہ میں جس اعلان جنگ کا ذکر ہے اس کا کون متحمل ہے؟

اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ لغت عرب اور اہل عرب کے نزدیک قرض پر ہر زیادتی کو سود شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی مختلف صورتیں تھیں۔ قرآنِ کریم نے سود کو اپنی تمام صورتوں کے ساتھ قطعاً حرام کر دیا۔

(ب) وہ احکام جو قرآن کریم کی آیات بینات اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہوں، کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کرے۔ سود کی حرمت نصوص قطعیہ سے ثابت ہے۔ جدید معاشی تقاضوں کی آڑ لے کر سود کی تعریف بدلی نہیں جا سکتی۔ اگر یہ دروازہ ایک مرتبہ کھول دیا گیا تو تمام قوانین اسلامیہ کا حلیہ بگڑ جائے گا۔ تحریف کا ایک ایسا سیلاب اُمڈ آئے گا، جس کو روکنا محال ہو جائے گا اور شریعت اسلامیہ کے سارے خدوخال محو جائیں گے۔

نئے تقاضوں کو آڑ بنا کر احکامِ شرعیہ پر دست تعدی دراز کرنے والے اتنا تو غور کریں کہ قرآنی احکام کسی ایسے مقنن کے بنائے ہوئے نہیں، جس کا علم محدود ہو، جس کی نظر حال پر تو ہو، لیکن مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے تغیرات اس پر مخفی ہوں، بلکہ یہ کتاب اس ذات باری کی ہے جو عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ اور بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ کی صفت سے متصف ہے۔ اس کے سامنے غیب و شہادت، حال و استقبال یکساں طور پر عیاں ہیں جس سے کائنات کی کوئی تبدیلی اور حالات کا کوئی تقاضا مخفی نہیں، بلکہ جو تبدیلی رونما ہوتی ہے، جو حالات جنم لیتے ہیں، وہ سب اس کے حکم سے رونما ہوتے ہیں۔

Marfat.com

سوال نمبر ۲

کیا اسلامی تعلیمات اور احکام کے مطابق:

ا۔ دو مسلم ریاستوں کے درمیان یا

۲۔ ایک مسلم اور دوسری غیر مسلم ریاست کے مابین سود کی بنیاد پر کاروبار جائز ہے؟

جواب نمبر ا

جس طرح دو مسلمان افراد کے درمیان سود کا لین دین حرام ہے اسی طرح دو مسلمان ریاستوں کے درمیان بھی سودی کاروبار جائز نہیں۔ آزاد اور بااختیار اسلامی حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی پہلی فرصت میں سودی نظام کو بدل ڈالیں، ورنہ وہ عند اللہ جواب دہ ہوں گی اور ایسے ممالک میں بسنے والے عوام کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنی حکومت کو مجبور کریں اور قانونی ذرائع سے زور ڈالیں کہ وہ ملک میں سود کی لعنت کو ختم کریں۔

بااختیار حکومتوں کا تو یہ فرض ہے، لیکن وہاں بسنے والے افراد اور کاروباری ادارے معذور تصور ہوں گے اور اس درمیانی عرصہ میں بینکوں کے ذریعے کاروبار جاری رکھ سکتے ہیں۔

جواب نمبر ۲

ایک مسلم اور دوسری غیر مسلم ریاست کے مابین سود کی بنیاد پر کاروبار کی اجازت دی گئی ہے۔ اسی طرح مسلمان افراد دارالحرب میں حربیوں کے ساتھ سودی کاروبار میں شرکت کرتے ہیں۔ اس کی متعدد وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک وجہ تو یہ ہے کہ دارالحرب کی حکومت اور وہاں کے افراد جس قسم کا برتاؤ ہمارے ساتھ کریں گے اسی قسم کا برتاؤ ہم ان کے ساتھ کرنے کے مجاز ہیں۔ فقہائے کرام نے تصریح کی ہے کہ اگر غیر مسلم حکومتیں ہمارے تاجروں کے تجارتی اموال پر کوئی کسٹم ڈیوٹی وصول کرتی ہیں تو ہم بھی ان کے تاجروں سے کسٹم ڈیوٹی وصول کرنے کے مجاز ہیں اور اگر وہ ہم سے وصول نہیں کرتے تو ہمیں بھی یہ زیب نہیں دیتا کہ ہم ان کے تاجروں کے تجارتی اموال پر کسٹم ڈیوٹی وصول کریں۔ اس کے علاوہ اور وجوہات بھی ہیں جو کتب فقہ میں شرح وبسط سے بیان کردی گئی ہیں۔

Marfat.com

سوال نمبر ۳

حکومت قومی ضروریات کے لیے جو قرضے جاری کرتی ہے، کیا ان پر لاگو ہونے والا سود ربا کی ذیل میں آتا ہے؟

جواب

سود قطعاً حرام ہے، جس کو کسی قیمت پر جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ حکومت کو اگر قومی ضروریات کے لیے قرض درکار ہو تو اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ وہ قرضے جو منفعت بخش کاموں کے لیے دیے جاتے ہیں، مثلاً کاروباری ادارے، صنعتیں وغیرہ، اس صورت میں جو لوگ روپیہ قرض دیں ان کو حصہ دار کی حیثیت سے شامل کیا جائے اور ان اداروں سے جو نفع حاصل ہو اس نفع کی مناسب شرح ان حصہ داروں میں ان کے حصص کے مطابق تقسیم کر دی جائے۔ یہی نفع لوگوں کو ترغیب دینے کے لیے کافی ہے۔ اگر لوگ کمپنیوں کے حصص بڑے شوق سے خریدتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ حکومت کے کاروباری منصوبوں میں وہ حصہ دار بننے میں کمال شوق کا مظاہرہ نہ کریں۔

البتہ حکومت کو بسا اوقات ایسے منصوبوں کے لیے بھی قرضہ لینا پڑتا ہے جو کاروباری نوعیت کے نہیں ہوتے، مثلاً سڑکیں، پلیں، ہسپتال اور دیگر رفاہی ادارے یا اسلحہ سازی کے کارخانے۔ ان مقاصد کے لیے حکومت جو قرض لے اس پر سود لینا اور دینا حرام ہے۔

میرا خیال ہے، اگر لوگوں کو یہ یقین دلایا جائے کہ ان کا سرمایہ محفوظ رہے گا اور سرکاری اعلیٰ افسران اسے اللوں تللوں میں ضائع نہیں کریں گے، نیز جب انہیں ضرورت پڑے گی تو انہیں وہ رقم فوراً مل جائے گی، تو لوگ حکومت کو قرض حسنہ دینے میں قطعاً کوئی جھجک محسوس نہیں کریں گے۔ اب بھی کروڑوں روپیہ بینکوں کے کرنٹ اکاؤنٹ میں جمع ہے جن پر ان کے مالک کوئی سود وصول نہیں کرتے۔ جب لوگوں کو اپنی حکومت پر اعتماد ہوگا اور حکومت کو ضروری مقاصد کے لیے روپیہ درکار ہوگا تو لوگ قرضِ حسنہ دینے میں بخل سے کام نہیں لیں گے۔

Marfat.com

سوال نمبر ۴

کیا آپ کے خیال میں غیر سودی بینکاری نظام ممکن ہے، اگر جواب اثبات میں ہے تو اس کا جواز کن مفروضات پر مبنی ہے؟

جواب

غیر سودی بینکاری نظام قائم کرنا بلاشبہ ممکن ہے۔ اس کے لیے فقط عزم اور پختہ ایمان کی ضرورت ہے۔ ایک مروجہ نظام کو نئے سانچے میں ڈھالتے وقت طرح طرح کی دشواریوں کا پیش آنا ایک قدرتی بات ہے، لیکن اہل عزیمت ان دشواریوں سے گھبراتے نہیں، بلکہ غور و تدبر اور جدوجہد سے وہ ان دشواریوں پر قابو پا لیتے ہیں۔ موجودہ بینکاری کا نظام عرصہ دراز سے مروج ہے۔ کارکن عملہ اس کے قواعد و ضوابط کا خوگر اور عادی ہو چکا ہے۔ جو لوگ بینکوں سے لین دین کرتے ہیں وہ بھی اس کے نظامِ کار سے اچھی طرح مانوس ہیں۔ جب بینک کے موجودہ ڈھانچہ کو آپ بدلیں گے اور اسے اسلامی قالب میں ڈھالیں گے تو پیش آنے والی الجھنوں کو دور کرنے کے لیے عزم و ثبات، ہمت و جرأت سے کام لینا پڑے گا۔ کارکن عملہ کو نئے قواعد و ضوابط سے مانوس کرنا بھی ایک کٹھن کام ہے، لیکن یہ ساری دشواریاں بہت کم عرصہ میں ناپید ہو جائیں گی۔

لوگوں کو جب معلوم ہوگا کہ اب انہیں صرف چند فی صد سود پر ہی ٹرخا نہیں دیا جائے گا، بلکہ جس کاروبار میں انتظامیہ ان کا سرمایہ لگائے گی اس سے جو نفع حاصل ہوگا اس میں سے انہیں بھی مناسب حصہ ملے گا، تو آپ یقین جانیئے، لوگ اپنا سارا سرمایہ بینکوں کے حوالے کر دیں گے۔ سود سے بچنے کے لیے آج کل جو لوگ کرنٹ اکاؤنٹ میں اپنا روپیہ رکھتے ہیں اس کا بھی معتد بہ حصہ وہ ڈیپازٹ اکاؤنٹ میں رکھیں گے۔ سرمایہ کی فراوانی سے کاروبار میں ترقی ہوگی اور سارے ملک میں خوشحالی کی ایسی لہر دوڑ جائے گی جس کا اس وقت اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے لوگوں کے دلوں میں یقین اور اعتماد پیدا کرنا شرط اول ہے۔ انتظامیہ کا مخلص، سمجھدار اور دیانتدار ہونا بھی ازحد ضروری ہے۔

Marfat.com

کاروبار میں جہاں نفع کی امید ہوتی ہے وہاں نقصان کا اندیشہ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ نقصان سے بچنے کے لیے ہر سال نفع کی رقم سے ایک معقول حصہ بطورِ ریزرو فنڈ رکھ دیا جائے اور نقصان کی صورت میں اس فنڈ سے اس کی تلافی کر دی جائے۔ پوری احتیاط اور دیانتداری کے باوجود بھی اگر نقصان ہو، تو لوگ ایسے نقصان کو بخوشی قبول کر لیں گے، کیونکہ سالہا سال تک نفع بھی ان کو ملتا رہا ہے۔ یہ محض شیطانی خدشات ہیں کہ اگر بینک سود دینا بند کر دیں تو لوگ بینکوں میں اپنا روپیہ جمع نہیں کرائیں گے۔ اس موضوع پر کئی فضلاء نے مفصل کتابیں بھی لکھی ہیں۔ ایک مرتبہ اگر حکومت ایسا کرنے کا پختہ عزم کر لے تو تفصیلات طے کرنے کے لیے ایک بورڈ تشکیل دیا جا سکتا ہے جو جید علماء، ماہرین معاشیات اور تجربہ کار بینکاروں پر مشتمل ہو اور حکومت کے لیے ایسا کرنا قطعاً مشکل نہیں۔

سوال نمبر ۵

کیا اسلامی احکام کی روشنی میں بینکوں کی فراہم کردہ سہولتوں یا خدمات کے عوض سود کی وصولی کے سلسلہ میں نجی اور سرکاری بینکاری میں کوئی امتیاز کیا جا سکتا ہے؟

جواب

نجی اور سرکاری بینکاری میں سود کے حکم کے بارے میں کوئی تفاوت نہیں۔ البتہ بینک جو خدمات سرانجام دیتے ہیں ان کے عوض وہ مناسب حق الخدمت وصول کر سکتے ہیں جن سے بینکوں کے اخراجات اور دوسری ضروریات کی کفالت ہو سکے۔

سوال نمبر ۶

کیا حکومت کے مملوکہ یا اس کے زیر نگرانی چلنے والے بینکاری کے کسی ادارہ کو نامعلوم اور غیر تشریح شدہ مالک کی ملکیت (مال مجہول المالک) قرار دیا جا سکتا ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو اسلام کی رو سے ایسے ادارہ کی حیثیت کیا ہوگی؟

جواب

حکومت کے مملوکہ بینکوں کی مالک حکومت ہے۔ مرکز میں اس کی نمائندگی صدر اور وزیر

Marfat.com

اعظم کرتے ہیں اور صوبوں میں گورنر اور وزرائے اعلیٰ کرتے ہیں۔ ان حالات میں ایسے بینک کو مالِ مجہول المالک کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے؟

سوال نمبر ۷

آیا اسلامی تعلیمات کے بموجب سرمایہ کو عامل پیداوار (Agent of Production) قرار دیا جا سکتا ہے اور اس کے استعمال کے عوض کوئی معاوضہ دیا جا سکتا ہے؟

(ب) اگر مذکورہ بالا سوال کا جواب اثبات میں ہے تو آیا اسلام منافع کی تقسیم میں سرمایہ کا کوئی حصہ مقرر کرتا ہے؟

جواب

اسلام کا نظام افراط وتفریط سے مبرا ہے۔ اس نظام میں ساری اہمیت نہ سرمایہ کو دی گئی ہے اور نہ صرف محنت کو عامل پیداوار قرار دیا گیا ہے۔ سرمایہ اور محنت مل کر پیداوار کا باعث بنتے ہیں۔ شریعت اسلامیہ میں مضاربت کے احکام اسی بنیاد پر مرتب کیے گئے ہیں کہ ایک آدمی سرمایہ لگاتا ہے، دوسرا محنت کرتا ہے اور دونوں حسب حال طے شدہ نسبت سے نفع تقسیم کر لیتے ہیں (1)۔ شریعت اسلامیہ میں مکانوں کا کرایہ، زمین کو زراعت کے لیے ٹھیکہ پر دینا جائز ہے۔ سرمایہ کا حصہ پیداوار میں اس طرح تقسیم کیا جاتا ہے کہ نفع اور نقصان میں دونوں فریق طے شدہ نسبت کے مطابق حصہ دار ہوں گے۔

سوال نمبر ۸ (الف)

کیا آپ کے خیال میں موجودہ اقتصادی حالات میں بینکاری کی سہولتوں سے استفادہ کیے بغیر یا ایسی سہولتوں کے عوض سود یا بینکاری اخراجات ادا کیے بغیر ملکی اور غیر ملکی تجارت کو مؤثر طریقے سے چلانا ممکن ہے؟

(ب) اگر مندرجہ بالا سوال کا جواب نفی میں ہے، تو کیا آپ اسلامی احکام سے ہم

1۔ القدوری، صفحہ 98، مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ

Marfat.com

آہنگ کوئی متبادل حل تجویز کر سکتے ہیں؟

جواب

موجودہ اقتصادی حالات میں غیر ملکی تجارت کا تصور بھی بینکوں کے بغیر مشکل ہے، لیکن ملکی تجارت کی روز افزوں ترقی میں بینک جو کردار انجام دے رہے ہیں۔ وہ بھی محتاج بیان نہیں۔ صرف تجارت کے میدان میں ہی نہیں، بلکہ صنعت و زراعت کی ترقی میں بھی بینکوں کو بے پناہ اخراجات کا متحمل ہونا پڑتا ہے۔ ان اخراجات کو ادا کرنے کے لیے سود کو استعمال کرنا قطعاً جائز نہیں، البتہ بینک اپنی ضروریات کا مناسب معاوضہ اور حق الخدمت لے سکتے ہیں۔ اس طرح سود کے بغیر بھی وہ اپنی کارکردگی سے ملک کی اقتصادی ترقی میں گراں بہا خدمات انجام دے سکتے ہیں۔

سوال نمبر ۹

کیا بیمہ کا کاروبار سود کے بغیر چلایا جا سکتا ہے؟

جواب

بعض حضرات نے بیمہ کو مطلقاً حرام ثابت کرنے کے لیے ناروا تکلفات کی زحمت گوارا کی ہے۔ کسی نے اس کو قمار کہا ہے، کسی نے اس کو شرط کا ایک فرد قرار دیا ہے اور کسی نے اسے سودی کاروبار میں شمار کیا ہے، لیکن اگر تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر اصل حقیقت کا کھوج لگایا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد امدادِ باہمی کے زریں اصول پر ہے۔ قدیم تاریخ میں بھی ہمیں اس کی مثالیں دستیاب ہوتی ہیں، مثلاً اسلام سے پہلے عرب میں یہ دستور تھا کہ اگر کسی قبیلہ کا کوئی فرد دوسرے قبیلہ کے کسی فرد کو قتل کر دیتا اور مقتول کے وارث دیت لینے پر آمادہ ہو جاتے تو دیت ادا کرنے کا سارا بوجھ قاتل پر نہ ڈال دیا جاتا، بلکہ سارے قبیلے میں اسے مناسب طریقہ سے تقسیم کر دیا جاتا۔ اس طرح دیت بھی ادا ہو جاتی اور قاتل پر بھی اتنا بوجھ نہ پڑتا جو معاشی طور پر اسے تباہ کر کے رکھ دے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس دستور کو پسند فرمایا اور شریعت اسلامیہ میں اسے قانونی

حیثیت دے دی گئی۔

آج کل حالات بدل گئے ہیں۔ صنعتی انقلاب کے باعث قبیلہ کے افراد میں وہ پہلی ہم آہنگی اور تعلقات ختم ہو گئے ہیں یا ہوتے جا رہے ہیں۔ ہر شخص الگ اور منفرد زندگی بسر کرنے کا خوگر بنتا جا رہا ہے۔ حوادث وخطرات کے امکانات روز افزوں ہیں۔ ان حالات میں جبکہ قبیلہ کے افراد مشکل وقت میں کسی کا تعاون کرنے اور اس کا بوجھ تقسیم کر لینے کے لیے قبائلی عصبیت کی بنیاد پر تیار نہیں ہوتے، تو کیا اب مصیبت زدہ افراد کو یونہی بے یارومددگار چھوڑ دیا جائے گا؟ ناگہانی حادثات میں آگے بڑھ کر ان کی امداد نہ کی جائے گی؟ اسلامی تعلیمات یقیناً اس کو قبول نہیں کرتیں۔

ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (حجرات: ۱۰) کہ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ نیز حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔ اِنَّ الْمُؤْمِنَ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضًا۔ (1) کہ مسلمان ایک دیوار کی طرح ہیں جس کی بعض اینٹیں دوسری اینٹوں کو سہارا دے رہی ہیں۔ اس لیے اگر امدادِ باہمی کی بنیاد پر متعدد افراد ایک ایسی انجمن بنا لیں اور بالاقساط اس میں اپنی رضامندی سے سرمایہ جمع کرتے رہیں اور باہمی طور پر یہ طے کر لیں کہ اگر اس انجمن کے اراکین میں سے کسی پر کوئی ناگہانی مصیبت آ جائے تو اس فنڈ سے اس کی امداد کی جائے گی، تو یہ چیز شریعت اسلامیہ کی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔

اس دور میں سرمایہ کو منجمد کر کے رکھ دینا بھی قرین دانش مندی نہیں، لیکن اسے سودی کاروبار میں نہ لگایا جائے، بلکہ ایسے کاروبار میں لگایا جائے جو شرعاً جائز ہے، اس سے جو نفع حاصل ہو اس سے ایک معقول حصہ ریزرو فنڈ کی صورت میں جمع کر لیا جائے۔ باقی نفع (حصص کے مطابق) تقسیم کر دیا جائے اور ناگہانی مصیبت یا حادثہ کا شکار ہونے والے شخص کو حسب معاہدہ اس زیرو فنڈ سے امداد دی جائے، تو اس میں قطعاً کوئی حرج نہیں۔

موجودہ بیمہ کمپنیاں جمع کیے ہوئے سرمایہ کو کیونکہ سودی کاروبار میں لگاتی ہیں اور سود کا

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 69، باب تشبیک الاصابع فی المسجد وغیرہ

کچھ حصہ لوگوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور یہ شرعاً جائز نہیں۔ نیز بیمہ کرانے والا چند اقساط ادا کرنے کے بعد بقیہ قسطیں ادا نہ کرے تو اس کی ادا شدہ قسطیں ضبط کر لی جاتی ہیں۔ شریعت اس حق تلفی کو بھی جائز قرار نہیں دیتی۔ موجودہ بیمہ کمپنیاں اگر ان ممنوعات سے اجتناب کریں تو پھر ان کے جواز میں کوئی شک نہیں۔

آج کل حکومت کی طرف سے بعض محکموں میں جبراً ضروری قرار دیا جاتا ہے کہ اس محکمہ کے ملازم بیمہ کرائیں، تو ان سے ملازمین گنہگار نہیں ہوں گے۔ اس طرح اگر ملک میں فتنہ وفساد کی آگ بھڑک رہی ہو، جان و مال کو ہر وقت خطرہ لاحق ہو تو شرعی قاعدہ کے مطابق بیمہ کرانا جائز ہے۔

سوال نمبر ۱۰

کیا اسلام کے اقتصادی نظام میں قومی سرمایہ کی تشکیل کے لیے بچت کی حوصلہ افزائی کرنے والی کوئی جائز ترغیبات موجود ہیں؟

جواب

اگر قومی سرمایہ منفعت بخش منصوبوں میں لگایا جائے تو ان سے حاصل ہونے والی منفعت کا کچھ حصہ سرمایہ جمع کرانے والوں کو دے دیا جائے، تو لوگوں کے لیے یہ بہت بڑی ترغیب ہے۔ غیر منفعت بخش منصوبوں پر خرچ کرنے کے لیے حکومت کو قرضہ درکار ہو، تو ایسے لوگوں کی یہاں کمی نہیں جو بطیب خاطر حکومت کو قرضہ دینے پر آمادہ ہوں گے۔ صرف انہیں دو باتوں کی یقین دہانی ضروری ہے کہ حکومت کسی آرڈیننس سے ان کی یہ رقم ضبط نہیں کرے گی۔ نیز جس وقت انہیں ضرورت ہوگی انہیں فوری طور پر یہ رقم واپس کر دی جائے گی۔ یہ دشواریاں صرف مغربی معاشرہ میں پیش آتی ہیں جہاں ہر کام کے پس منظر میں، خواہ ملکی اور قومی نوعیت کا ہو، مساوی منفعت کارفرما ہوتی ہے اور سود لیے بغیر سرمایہ دار اپنی حکومت کو ایک پائی بھی دینے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے۔ اسلامی معاشرہ مغربی معاشرہ سے مختلف نوعیت کا ہے۔ یہاں اگر حکومت ملکی مقاصد کے لیے قرضہ مانگے گی تو لوگ دھڑا دھڑ

Marfat.com

قرضہ دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔

سوال نمبر ۱۱ (الف)

ایک ملازم کو اپنے پراویڈنٹ فنڈ سے قرض لینے پر جو رقم بطورِ سود ادا کرنا پڑتی ہے اور جو بعد میں اس کے اسی فنڈ میں جمع کر دی جاتی ہے، کیا آپ اسے ربا کہیں گے؟

(ب) اگر آجر بھی پراویڈنٹ فنڈ میں اپنی جانب سے کچھ رقم کا اضافہ کرے تو صورتِ حال کیا ہو گی؟

جواب

سود سرمایہ داری نظام کے اعصاب پر بری طرح سوار ہے۔ ان لوگوں کے لیے سود کے بغیر ایک قدم اٹھانا بھی دشوار ہوتا ہے۔ ایک ملازم کی تنخواہ سے اس کا کچھ حصہ کاٹ کر پراویڈنٹ فنڈ کے نام سے محفوظ کر لیا جاتا ہے، جو عام حالات میں اس کی ملازمت کے اختتام پر اسے دیا جاتا ہے۔ اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے موقع پر اسے بیک وقت معقول رقم مل جاتی ہے اور اس سے وہ اپنی نئی زندگی کا آغاز پورے اعتماد سے کر سکتا ہے۔ اگر کسی ہنگامی ضرورت کے پیش نظر اسے اس فنڈ کی ضرورت پڑ جاتی ہے تو حکومت اسے اس کی رقم قرضہ کے نام سے دیتی ہے اور پھر اس پر سود وصول کرتی ہے۔ وہ وصول کردہ سود پھر اس کے فنڈ میں جمع کر دیا جاتا ہے۔ اسلامی نظام میں ان نامعقول الجھنوں کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ سیدھا طریقہ یہ ہے کہ عام حالات میں ملازمت کے اختتام پر اس کا پراویڈنٹ فنڈ اسے یکمشت دے دیا جائے، لیکن اثنائے ملازمت اگر اسے ناگہاں طور پر روپیہ کی ضرورت پڑ جائے تو اسے اس کی اپنی رقم سے روپیہ دیا جائے۔ اسے قرض تصور نہ کیا جائے اور اس پر سود وصول نہ کیا جائے، لیکن اس پر یہ لازم قرار دے دیا جائے کہ وہ یہ رقم واپس کر دے گا تاکہ ملازمت کے اختتام پر وہ اس سے فائدہ اٹھا سکے، یہ تو ہوئی صحیح تجویز۔

موجودہ حالات میں اس کے پراویڈنٹ فنڈ میں جو رقم جمع ہوتی ہے وہ اس کا مستحق

Marfat.com

ضرور ہوتا ہے، لیکن قبضہ میں آنے سے پہلے وہ اس کی ملکیت قرار نہیں دی جاسکتی۔ جب اس رقم سے کچھ روپیہ اس کے حوالے کر دیا جائے گا اور اس کے قبضہ میں آجائے گا تو رقم جس کا پہلے وہ مستحق تھا، اب وہ اس کا مالک بھی بن جائے گا اور اس میں جو اضافہ ہوگا وہ اس کی اپنی ملک میں ہوگا اور اس پر ربا کی تعریف صادق نہیں آئے گی، کیونکہ یہاں ایک ہی شخص کے مال میں زیادتی ہو رہی ہے جبکہ ربا کی تحقیق کے لیے متعاقدین کا ہونا ضروری ہے۔

(ب) اگر آجر (گورنمنٹ) پراویڈنٹ فنڈ میں اپنی طرف سے کچھ رقم ملا دیتا ہے تو ہم اس کو تبرع یا انعام قرار دیں گے، اسے سود نہیں کہا جائے گا۔ آجر کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے اجیر کو مقررہ اجرت سے جتنا چاہے زیادہ دے۔ آج کل اس کو بھی انٹرسٹ (سود) کہا جاتا ہے۔ جب تک سودی نظام برقرار رہے گا ہم جائز بلکہ مستحسن تبرعات کو بھی سود کے ناپاک نام سے یاد کرتے رہیں گے۔ اسلامی نظام میں اس بات کی اجازت نہیں ہوگی۔ اجرت جب تک اجیر کو ملتی نہیں، وہ اس کی ملک میں نہیں آتی، بلکہ آجر کی ملک ہی تصور ہوگی اور آجر کو اپنی ملک میں تصرف کا اختیار ہے۔ وہ سود کے بجائے آجر کو دو صد روپیہ دے تو اسے کیوں منع کیا جائے؟ اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ حکومت اسے لاکھ سود کہے، شریعت اسے سود قرار نہیں دے گی۔

سوال نمبر ۱۲

پراویڈنٹ فنڈ اور سیونگز بینک اکاؤنٹ پر جو نفع دیا جاتا ہے، کیا وہ ربا کی تعریف میں آتا ہے؟

جواب

پراویڈنٹ فنڈ اور سیونگز بینک اکاؤنٹ کو ایک سوال میں جمع کرنا، سوال مرتب کرنے والے کی نیک نیتی کو مشتبہ کر رہا ہے۔ یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں جن کے بارے میں الگ الگ سوالات پوچھے جانا چاہئیں تھے۔ سیونگ بینک اکاؤنٹ پر جو نفع دیا جاتا ہے وہ سود ہے اور قطعاً حرام ہے۔ پراویڈنٹ فنڈ کے نام سے حکومت جو رقم اپنے ملازمین کو دیتی

Marfat.com

ہے اس کو سود کہنا غلط ہے۔ درحقیقت وہ تبرع اور احسان ہے یا ملازم کی بہتر کارکردگی پر اس کا انعام ہے۔

سوال نمبر ۱۳

کیا انعامی بانڈوں پر یا سیونگ بینک اکاؤنٹ پر بطورِ انعام دی جانے والی رقم ربا کی تعریف میں داخل ہے؟

جواب

سیونگ بینک اکاؤنٹ جب سرے سے ہی ناجائز ہے تو اس پر انعام بھی ناجائز ہوگا، لیکن انعامی بانڈ کا معاملہ جدا ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ لوگ قومی ضروریات کے لیے سرمایہ بطورِ قرض دینے میں ذوق وشوق کا مظاہرہ کریں۔ میرے خیال میں کوئی حرج اس میں نہیں جس کی مثال ہمیں فقہ کی کتابوں میں ملتی ہے۔ کفار سے جہاد کرنے کے لیے گھوڑوں کی اہمیت محتاجِ بیان نہیں۔ لوگوں کو گھوڑے پالنے کی ترغیب دینے کے لیے اگر خلیفۂ وقت انعامات دینے کا اعلان کرے تو فقہ کی اصطلاح میں اسے "جعل" (1) کہتے ہیں اور یہ جائز ہے اور خلیفہ ان انعامات کو بیت المال سے دینے کا مجاز ہے۔

اگر کفار سے جہاد کے لیے گھوڑے پالنے کی انعام سے ترغیب دینا درست ہے تو حکومت اگر غربت وافلاس، جہالت و بیماری کے خلاف جہاد کرنے کے لیے، کارخانے، ڈیم، تعلیمی ادارے اور ہسپتال بنانے کے لیے قرض کی ضرورت محسوس کرے اور انعامات کے ذریعے لوگوں کو قرض دینے کا شوق دلائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔ "جعل" کے مسئلہ پر قیاس کرتے ہوئے ہم اس کے جواز کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ یہ انعامات قرعہ اندازی کے ذریعے تقسیم کیے جاتے ہیں اور قرعہ اندازی بھی شریعت میں جائز ہے، بلکہ جب بہت سے لوگ ایک چیز کے مساوی مستحق ہوں اور ان میں سے کسی ایک کو یا چند کو دینا ہو تو قرعہ اندازی بہترین طریقہ ہے، لیکن اگر کسی بانڈ پر انعام کے علاوہ حکومت سود بھی ادا کرے تو

1۔ الہدایہ مع حاشیہ، جلد 2، صفحہ 56-559

Marfat.com

اس کا حکم اس سے الگ ہوگا۔

سوال نمبر ۱۴

کیا اسلامی قانون کے تحت تجارتی اور غیر تجارتی قرضوں میں امتیاز کرنا درست ہوگا، جبکہ تجارتی قرضوں پر سود لیا جائے اور غیر تجارتی قرضے بلا سود ہوں؟

جواب

عام طور پر یہ لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ نزولِ قرآن مجید کے وقت صرف نجی ضروریات کے لیے قرض لیا جاتا تھا اور ایسے قرضوں پر ہی وہ اپنے قرض خواہوں کو بھاری سود ادا کیا کرتے تھے۔ کاروباری مقاصد کے لیے سودی قرض لینے کا اس وقت کوئی رواج ہی نہیں تھا۔ ان کے نزدیک اس غیر ترقی یافتہ تمدن میں کاروبار اتنا وسیع نہ تھا کہ اس کو کامیابی سے چلانے کے لیے قرضہ کی ضرورت پڑے۔ اپنے اس غلط مفروضہ پر وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں جس سود کی حرمت کا ذکر ہے وہ وہی سود ہے جو اس وقت رائج تھا۔ کاروباری مقاصد کے لیے نہ اس وقت سود قرض لیا جاتا تھا اور نہ اس کی حرمت آیاتِ قرآنی سے ثابت ہے۔

ان کا یہ مفروضہ سراسر غلط ہے، حقیقت حال کے بالکل خلاف ہے اور اس وقت کے حالات سے ان کی بے خبری کی دلیل ہے۔ اگر آپ نے کبھی جزیرۂ عرب کا نقشہ ملاحظہ فرمایا ہو تو آپ کو علم ہوگا کہ مکہ مکرمہ اس تجارتی شاہراہ کے بالکل قریب تھا جو مشرق و مغرب کی باہمی تجارت میں ریڑھ کی ہڈی کا کام دیتی تھی۔ ان تجارتی سرگرمیوں میں اہل مکہ پیش پیش تھے اور تجارتی اغراض و مقاصد کے لیے سود پر قرضہ لینا اور دینا ان کے ہاں روزمرہ کا معمول تھا۔ قرآنِ کریم نے ہر قسم کے سود کو حرام قرار دیا ہے۔ نجی ضروریات اور کاروباری مقاصد کے لیے سود کے حکم میں کوئی امتیاز نہیں۔ سودی قرضوں کے نتائج بڑے بھیانک اور المناک ہیں۔ نجی ضروریات کے لیے دیا ہوا سودی قرض، ایک فرد یا ایک گھرانہ کے لیے وبالِ جان ہوتا ہے، لیکن جو سودی قرض، کاروباری مقاصد کے لیے دیا جاتا ہے اس سے سارا معاشرہ

Marfat.com

متاثر ہوتا ہے۔ ملکی ثروت چند ہاتھوں میں جمع ہو جاتی ہے جس سے بے شمار مصائب و آلام رونما ہو جاتے ہیں۔ شریعت اسلامیہ ایسی چیز کی اجازت نہیں دیتی جو گوناگوں خرابیوں کا باعث ہو۔

سوال نمبر ۱۵

اگر سود کو قطعی طور پر ختم کر دیا جائے تو اسلامی نظامِ معیشت میں لوگوں کو بچت پر ابھارنے اور سرمایہ کے استعمال میں کفایت شعاری کی ترغیب دینے کے لیے کون سے محرکات استعمال کیے جائیں گے؟

جواب

موجودہ دور میں جو لوگ بینکوں میں اپنا سرمایہ جمع کراتے ہیں انہیں پانچ یا دس فیصد نفع دے کر ٹال دیا جاتا ہے۔ اگر بینکوں کا نظام مضاربت کے اصول پر قائم کیا جائے تو جو نفع حصہ داروں کو ملے گا وہ موجودہ شرح سود سے کہیں زیادہ ہوگا۔ لوگ دھڑا دھڑ اپنا روپیہ بینکوں میں جمع کرائیں گے۔

سودی نظام کی بالادستی کے باعث لوگ اس قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں کہ اگر سود بند کر دیا گیا تو بینک خالی ہو جائیں گے اور اقتصادی ترقی کے سارے منصوبے تلپٹ ہو جائیں گے۔ ہم اسے حکومت اور بینکاروں کی کاہلی اور تغافل کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اس فاسد نظام کو بدلنے کے لیے جو ضروری اقدامات کرنے تھے ان سے وہ قاصر ہیں۔

سوال نمبر ۱۶

جدید معاشی نظریہ کے طور پر سود کے معنی اس شرح سود سے مختلف ہو گئے ہیں جو قرض پر واقعی ادا کیا جاتا ہے مثلاً ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل میں ماہرین معاشیات ''فرضی شرح سود'' سے کام لیتے ہیں جس سے سرمایہ کی کمیابی کی قیمت ظاہر ہوتی ہے۔ اس قسم کا نظریہ اقتصادی حکمت عملی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ خواہ واقعی سود ادا کیا جائے یا نہ ادا کیا جائے؟

Marfat.com

جواب

جب ہم نظام معیشت کو اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالیں گے تو اس وقت نہ حقیقی سود کی گنجائش رہے گی اور نہ فرضی سود کی ضرورت محسوس ہو گی۔ اسلامی مملکت کو اس قسم کی حکمت عملی اختیار کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے گی جس کے باعث حقائق پر پردہ ڈالا جاتا ہے۔ حقیقت کچھ ہوتی ہے اور بتایا کچھ جاتا ہے۔

وَمَا تَوْفِيْقِیْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ اُنِيْبُ۔

Marfat.com

مآخذ و مراجع

کتب الٰہیہ

۱۔قرآن مجید

۲۔انجیل

کتب احادیث

۳۔امام مالک بن انس اصبحی، متوفی ۱۷۹ھ، موطا امام مالک، مطبع مجتبائی پاکستان، لاہور۔

۴۔امام احمد بن حنبل، متوفی ۲۴۱ھ، المسند، دار صادر بیروت

۵۔امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری، متوفی ۲۵۶ھ، صحیح بخاری، فرینڈز اون پریس راولپنڈی۔

۶۔امام ابو الحسین مسلم بن حجاج قشیری، متوفی ۲۶۱ھ، صحیح مسلم، فرینڈز اون پریس راولپنڈی۔

۷۔امام ابوعبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ، متوفی ۲۷۳ھ، سنن ابن ماجہ، آفتاب عالم پریس لاہور۔

۸۔امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانی، متوفی ۲۷۵ھ، سنن ابوداؤد، نور محمد اصح المطابع کراچی۔

۹۔امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی، متوفی ۲۷۹ھ، سنن ترمذی، آفتاب عالم پریس لاہور۔

۱۰۔امام ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائی، متوفی ۳۰۳ھ، سنن نسائی، نور محمد کتب خانہ کراچی۔

۱۱۔امام ابوجعفر احمد بن محمد الطحاوی، متوفی ۳۲۱ھ، شرح معانی الآثار، مکتبہ حقانیہ ملتان، پاکستان۔

۱۲۔امام ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری، متوفی ۴۰۵ھ، المستدرک، مکتبہ مطابع النصر

Marfat.com

للطباعة ریاض۔
۱۳۔ علامہ علی متقی بن حسام الدین ہندی برہان پوری، متوفی ۹۷۵ھ، کنز العمال، مکتبہ التراث الاسلامی
۱۴۔ حافظ نور الدین علی بن ابی بکر الہیثمی، متوفی ۷۰۷ھ، مجمع الزوائد، دار الفکر بیروت،

کتب تفاسیر

۱۵۔ امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری، متوفی ۳۱۱ھ، جامع البیان، مطبعہ الکبری الامیریہ مصر۔
۱۶۔ علامہ جار اللہ محمود بن عمر زمخشری، متوفی ۴۶۷ھ، کشاف، مکتب الاعلام الاسلامی قم المقدسۃ۔
۱۷۔ علامہ ابوبکر محمد بن عبداللہ المعروف بابن العربی، متوفی ۵۴۳ھ، احکام القرآن، دار الفکر بیروت۔
۱۸۔ امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی، متوفی ۶۰۶ھ، تفسیر کبیر، دار الفکر بیروت۔
۱۹۔ علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی، متوفی ۶۶۸ھ، الجامع لاحکام القرآن، دار الکتب المصریہ۔
۲۰۔ علامہ ابو الحیان محمد بن یوسف اندلسی، متوفی ۷۵۴ھ، البحر المحیط، دار احیاء التراث العربی بیروت۔
۲۱۔ شیخ فتح اللہ کاشانی، متوفی ۹۷۷ھ، منہج الصادقین، کتابفروشی اسلامیہ طہران۔
۲۲۔ علامہ ابو الفضل سید محمود آلوسی حنفی، متوفی ۱۲۷۰ھ، روح المعانی، دار احیاء التراث العربی بیروت۔
۲۳۔ امام ابوبکر احمد بن علی رازی جصاص حنفی م ۳۷۰ھ، احکام القرآن، دار الکتب العلمیہ، بیروت لبنان۔
☆ امام جلال الدین سیوطی، م ۹۱۱ھ، الدر المنثور، دار الکتب العلمیہ بیروت لبنان۔

Marfat.com

کتب شروح حدیث

۲۴۔علامہ یحییٰ بن شرف نووی، متوفی ۶۷۶ھ، شرح مسلم، فرینڈز اون پریس راولپنڈی۔

۲۵۔حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی، متوفی ۸۵۲ھ، فتح الباری، مکتبۃ الکلیات الازہریہ، مصر۔

۲۶۔حافظ بدر الدین محمود بن احمد عینی حنفی، متوفی ۸۵۵ھ، عمدۃ القاری، مطبعہ مصطفیٰ البابی مصر۔

۲۷۔علامہ احمد قسطلانی، متوفی ۹۱۱ھ، ارشاد الساری، مطبوعہ مصر۔

۲۸۔کشف المغطاعن وجہ الموطا، مولانا اشفاق الرحمٰن، متوفی ۱۹۵۶ھ، مطبع مجتبائی پاکستان لاہور۔

کتب لغت

۲۹۔علامہ جلال الدین محمد بن مکرم بن منظور افریقی، متوفی ۷۱۱ھ، لسان العرب، دار صادر بیروت۔

۳۰۔علامہ مجد الدین محمد بن یعقوب فیروز آبادی، متوفی ۷۱۷ھ، القاموس المحیط۔

۳۱۔علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی م ۵۰۲، المفردات، مطبوعۃ الدار الشامیہ بیروت۔

کتب اسماء الرجال

۳۲۔علامہ یحییٰ بن شرف نووی، متوفی ۶۷۶ھ، تہذیب الاسماء، ادارہ الطباعۃ المنیر یہ مصر۔

۳۳۔علامہ شمس الدین محمد بن احمد ذہبی، متوفی ۷۴۸ھ، میزان الاعتدال، مطبعۃ السعادۃ مصر۔

۳۴۔حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی، متوفی ۸۵۲ھ، تہذیب التہذیب، دار صادر بیروت۔

Marfat.com

کتب تاریخ، سیرت وفضائل

۳۵۔ امام عبدالملک بن ہشام، متوفی ۲۱۳ھ السیرۃ النبویہ، مطبعہ حجازی قاہرہ۔

۳۶۔ امام محمد بن سعد، متوفی ۲۳۰ھ، الطبقات الکبری، مطبوعہ للطباعۃ والنشر بیروت۔

۳۷۔ علامہ ابوالحسن علی بن ابی الکرم الشیبانی المعروف بابن الاثیر، متوفی ۶۳۰ھ، اسد الغابہ، المکتبہ الاسلامیہ طہران۔

۳۸۔ علامہ ابوالحسن علی بن ابی الکرم الشیبانی المعروف بابن الاثیر، متوفی ۶۳۰ھ، الکامل فی التاریخ، دار صادر بیروت۔

۳۹۔ علامہ شمس الدین احمد بن محمد بن ابی بکر بن خلکان م ۶۸۱ھ، وفیات الاعیان، مکتبہ النہضۃ المصریہ قاہرہ۔

۴۰۔ حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر شافعی، متوفی ۷۷۴ھ، البدایہ والنہایہ، مطبعۃ السعادہ مصر۔

۴۱۔ حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی شافعی متوفی ۸۵۲ھ، الاصابہ، مکتبہ التجاریہ الکبری مصر۔

۴۲۔ علامہ محمد بن یوسف الصالحی الشامی، متوفی ۹۴۲ھ، سبل الہدی والرشاد، لجنۃ احیاء التراث مصر۔

۴۳۔ الشیخ حسین بن محمد الدیار بکری، تاریخ الخمیس، دار صادر بیروت۔

۴۴۔ امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری، متوفی ۳۱۰ھ، تاریخ الطبری۔

۴۵۔ علامہ عبدالرحمٰن بن محمد بن خلدون متوفی ۸۰۸ھ، تاریخ ابن خلدون، دار الکتب اللبنانی بیروت۔

۴۶۔ حافظ جلال الدین سیوطی، متوفی ۹۱۱ھ، تاریخ الخلفاء، نور محمد اصح المطابع کراچی۔

۴۷۔ علامہ محمود شیث خطاب، خالد بن الولید المخزومی، دار الفکر بیروت۔

۴۸۔ سید سلیمان ندوی، سیرت النبی، معارف شہر اعظم گڑھ۔

Marfat.com

۴۹۔ شیخ اشرف علی تھانوی، نشر الطیب، ممتاز اکیڈمی لاہور۔
۵۰۔ علامہ احمد بن محمد بن حجر الہیثمی مکی، م ۹۷۴ھ، الصواعق المحرقہ، مکتبہ الحقیقہ استنبول ترکی۔
۵۱۔ شیخ محمد بن ابی بکر ابن القیم جوزیہ، م ۷۵۱ھ، جلاء الافہام، ادارہ الطباعۃ المنیریہ دمشق۔

کتب فقہ حنفی

۵۲۔ شمس الائمہ محمد بن احمد سرخسی، متوفی ۴۸۳ھ، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔
۵۳۔ علامہ ابو الحسن علی بن ابی بکر مرغینانی، متوفی ۵۹۳ھ، ہدایہ اولین و اخرین۔ مکتبہ شرکت علمیہ ملتان۔
۵۴۔ علامہ کمال الدین بن ہمام، متوفی ۸۶۱ھ فتح القدیر، مطبعہ التجاریہ الکبری مصر۔
۵۵۔ علامہ علاؤ الدین محمد بن علی حصکفی م ۱۰۸۸ء الدر المختار، امیر حمزہ کتب خانہ کوئٹہ۔
۵۶۔ علامہ احمد بن جعفر القدوری، المختصر القدوری۔ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ۔

کتب فقہ حنبلی

۵۷۔ علامہ موفق الدین عبداللہ بن احمد بن قدامہ، متوفی ۶۲۰ھ، المغنی، مطبعہ دار المنار۔

کتب شیعہ

۵۸۔ نہج البلاغہ (خطبات حضرت علی رضی اللہ عنہ) مکتبہ التجاریہ الکبری مصر۔
۵۹۔ شیخ ابو جعفر محمد بن یعقوب کلینی، متوفی ۳۲۹ھ، الاصول من الکافی، مکتبہ اسلامیہ، تہران۔
۶۰۔ محمد محسن بن شاہ الکاشانی، کتاب الوافی، مکتبہ اسلامیہ طہران۔
۶۱۔ شیخ کمال الدین میثم بن علی بن میثم البحرانی، متوفی ۶۷۹ھ، شرح نہج البلاغۃ، کتاب الوافی۔
۶۲۔ حاجی شیخ عباس قمی، صحیفہ کاملہ سجادیہ، کتابفروشی اسلامیہ تہران۔

Marfat.com

۶۳۔ شیخ ابو جعفر محمد بن علی قمی م ۳۸۱ھ، من لایحضرہ الفقیہ، دار الکتب اسلامیہ تہران۔
۶۴۔ مرزا محمد تقی سپہرم ۱۲۹۷، ناسخ التواریخ، کتابفروشی اسلامیہ تہران۔
۶۵۔ شیخ علی بن عیسی الاربلی، کشف الغمہ، مطبوعہ تہران۔
۶۶۔ الاصول من الکافی مترجم، مترجم شیخ محمد باقر، مکتبہ اسلامیہ تہران۔
۶۷۔ قاضی نور اللہ حسینی، احقاق الحق، مطبوعہ مطبع اسلامیہ تہران۔

کتب اصول فقہ

۶۸۔ امام ابو حامد محمد بن محمد غزالی، م ۵۰۵ھ، المستصفیٰ، دار احیاء التراث العربی بیروت۔
۶۹۔ علامہ سیف الدین علی بن علی آمدی، ۶۳۱ھ، الاحکام فی اصول الاحکام۔
۷۰۔ ارشاد الفحول الی تحقیق الحق من علم الاصول، محمد بن علی شوکانی، م ۱۲۵۰ھ، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت۔
۷۱۔ علامہ ابو اسحٰق الشاطبی، الموافقات، المطبعہ الرحمانیہ مصر۔

کتب فقہ غیر مقلدین

۷۲۔ علامہ محمد بن علی شوکانی، م ۱۲۵۰، نیل الاوطار، دار الفکر بیروت۔

کتب متفرقہ

۷۳۔ علامہ یاقوت بن عبد اللہ، معجم البلدان، دار صادر بیروت۔
۷۴۔ شیخ محمد بن ابی بکر ابن القیم، م ۷۵۱ھ، مدارج السالکین، دار الکتب العربیہ بیروت۔
۷۵۔ مرزا اسد اللہ خان غالب، دیوانِ غالب، زاہد بشیر پرنٹرز لاہور۔
۷۶۔ احمد امین وزکی نجیب محمود، قصہ الفلسفہ الحدیثہ، لجنۃ التالیف القاہرہ۔
۷۷۔ انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا، مطبوعہ لندن۔
۷۸۔ سر سید احمد خان، مقالات سر سید، زریں آرٹ پریس لاہور۔
۷۹۔ کلیاتِ اقبال اردو، علامہ محمد اقبال، اقبال اکادمی لاہور۔

Marfat.com

۸۰۔ کلیاتِ اقبال فارسی، علامہ محمد اقبال، غلام علی پبلشرز لاہور۔

۸۱۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق، ''یورپ پر اسلام کے احسان''مطبع علمی پرنٹنگ پریس لاہور۔

۸۲۔ شیخ شرف الدین سعدی، گلستان سعدی، مکتبہ امدادیہ ملتان۔

۸۳۔ شیخ مومن بن حسن الشبلنجی، نور الابصار، دار الکتب العلمیہ بیروت۔

۸۴۔ امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ، حدائق بخشش، اشتیاق مشتاق پرنٹرز لاہور۔

۸۵۔ مولانا امیر بخش، انوار شمیہ، مکتبہ ضیاء شمس الاسلام۔

۸۶۔ مراۃ العاشقین، مطبوعہ مطبع مصطفائی لاہور۔

۸۷۔ مولوی محمد سعید، جذباتِ سعید۔

کتب علم الکلام والعقائد

۸۸۔ علامہ سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی م ۷۹۱ھ، شرح عقائد نسفی، کتب خانہ مجیدیہ ملتان۔

۸۹۔ علامہ کمال الدین محمد بن محمد المعروف بابن ابی شریف الشافعی م ۹۰۶ھ، المسامرہ، مطبعہ السعادہ، مصر۔

۹۰۔ مولانا عبد العزیز پرہاردی، النبراس، مطبوعہ سعیدیہ کتب خانہ ملتان۔

Marfat.com

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

کی شہرۂ آفاق تفسیر کا جدید، سلیس، دلکش، دلآویز اردو ترجمہ

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف کی زیر نگرانی

مرکزی دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف کے علماء کی ایک نئی کاوش

تفسیر مظہری 10 جلد

زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آچکی ہے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

Marfat.com

ابوالفدا حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ

کی شہرۂ آفاق تفسیر کا جدید، سلیس، دلکش، دلآویز اردو ترجمہ

ادارہ ضیاء المصنفین کی زیرنگرانی
بھیرہ شریف

مرکزی دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف کے علماء کی ایک نئی کاوش

تفسیر ابنِ کثیر 4 جلد

زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آچکی ہے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

Marfat.com

حضور ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ کی
یادگار تصانیف

تفسیر ضیاء القرآن ۵ جلد
فہم قرآن کا بہترین ذریعہ
اہل دل کے لیے ایک نایاب تحفہ

جمال القرآن ترجمۃ القرآن
قرآن پاک کا انتہائی خوبصورت ترجمہ جس کے
ہر لفظ سے اعجاز قرآن کا حسن نظر آتا ہے

سنت خیر الانام
فتنۂ انکار سنت پر تحقیقی اور تنقیدی کتاب

ضیاء النبی ۷ جلد
سیرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کتاب
درد و سوز اور تحقیق و آگہی سے
معمور تصنیف

مقالات ۲ جلد
مختلف علمی، روحانی اور ثقافتی موضوعات پر جامع مقالات کا مجموعہ

قصیدہ اطیب النغم
خوبصورت نعتیہ قصیدہ پرسوز
اور دلآویز شرح

مجموعہ وظائف مع دلائل الخیرات شریف
مشائخ سلسلہ عالیہ چشتیہ نظامیہ اور دیگر سلاسل
کے معمولات اور اوراد و وظائف کا مجموعہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز
گنج بخش روڈ لاہور 042-37221953- Fax: 042-37238010
۹ الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور 042-37247350 Fax:042-37225085
۱۴ انفال سنٹر اردو بازار کراچی 021-32212011- 32630411
Fax: 021-32210212

Email:Info@zia-ul-quran.com